اسلامی ریاست

فلسفہ، نظامِ کار اور اُصولِ حکمرانی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

خورشید احمد

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

عرض ناشر

"اسلامی ریاست" کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت پر اعلیٰ علمی حلقوں میں اس کی جس گرمجوشی سے پذیرائی ہوئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایڈیشن قلیل عرصہ ہی میں ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ یونیورسٹیوں کے طلباء اور علم سیاسیات و اسلامیات کے شائقین کی زبردست طلب کے پیش نظر ہم پہلے ایڈیشن ہی کو دوبارہ جلد طبع کرانا چاہتے تھے، لیکن مرتب محترم کے اس ارادہ کے اظہار پر کہ وہ اس پر نظر ثانی کر کے مزید تفصیلات وتشریحات کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں، ہم نے اس کی طباعت واشاعت کو قدرے موخر کر دیا۔ الحمد للہ، اب ہم اب کتاب کو ایک ایسی جامع شکل میں پیش کر رہے ہیں کہ جس میں اسلام کے نظریہ سیاسی کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث ملے گی۔

اس کتاب کی علمی واستنادی حیثیت کے لیے محترم مصنف ومؤلف کا نام کافی ضمانت ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اسلامیات وسیاسیات کے یونیورسٹیوں کے طلباء اور محققین اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔
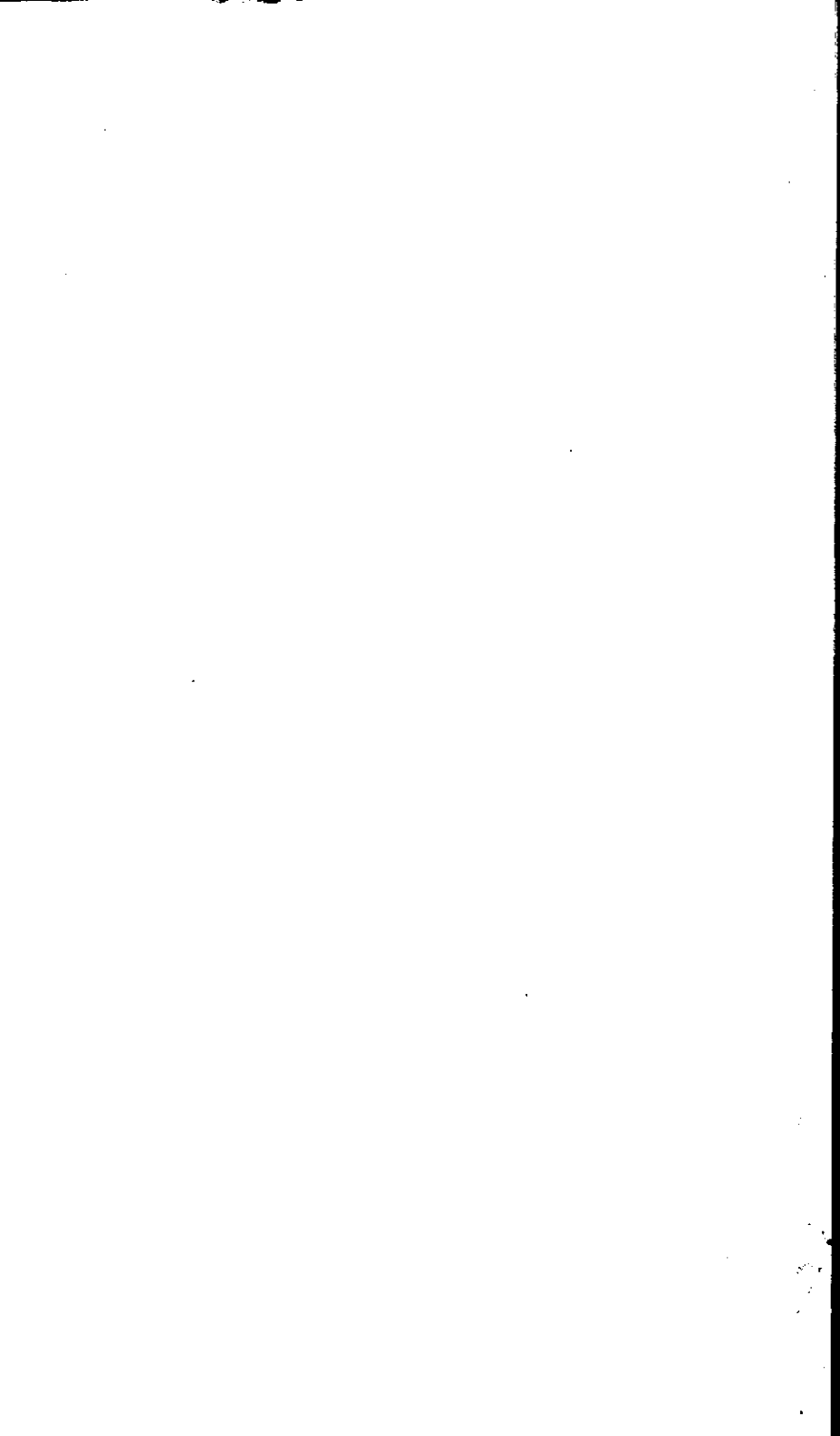
اس ایڈیشن کو ہم بلند پایہ تالیف کے شایان شان آفسٹ کی دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ قارئین اس کا فیصلہ خود کر سکتے ہیں کہ ہم اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

لاہور۔ ۱۳ شوال المکرم ۱۳۸۶ھ
مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۶۷ء

مینیجنگ ڈائریکٹر
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

فہرست مضامین

حصہ سوم: اِسلام کے اُصولِ حکمرانی

حصہ چہارم: اسلامی انقلاب کی راہ

دیباچہ

از مصنف

پچھلے بیس پچیس سال کے دوران میں مجھے اسلام کے سیاسی نظام پر بہت کچھ لکھنے اور کہنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے اس موضوع پر اور اس کے بہت سے متعلقات پر اصولی و نظری بحثیں بھی کی ہیں، اور اس امر پر بھی اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ اس زمانہ میں عملاً ایک اسلامی ریاست کس نقشے پر بن سکتی ہے۔ یہ مضامین اس طویل مدت کے دوران میں مختلف مواقع پر مختلف مناسبتوں سے لکھے گئے ہیں یا تقریر کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں، اور مختلف صورتوں میں طبع بھی ہوتے رہے ہیں، لیکن ایک مدت تک ان کو یکجا ایک کتابی شکل میں مرتب نہیں کیا جا سکا تھا۔ چند سال پہلے جناب خورشید احمد صاحب نے میرے متعدد مضامین کو "اسلامی ریاست" کے عنوان سے مرتب کیا تھا، لیکن اس وقت سارا مواد استعمال نہ کیا جا سکا تھا۔ نیز اس مجموعہ میں نظری مباحث اور پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے سلسلہ کے مضامین یکجا کر دیئے گئے تھے۔ اب ادارہ معارف اسلامی کے زیر اہتمام جناب خورشید احمد صاحب نے اس موضوع سے متعلق میرے تمام مضامین کو دو حصوں میں مرتب کر دیا ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی ریاست کے تمام نظری مباحث سمو دیئے ہیں اور دوسرے حصے میں پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے سلسلے کے سب مضامین یکجا کر دیئے ہیں۔ اب ایک قاری کے سامنے بیک وقت اسلام کے سیاسی نظریے اور اس کے نظام ریاست کی پوری تصویر آجاتی ہے۔ اس سے پہلے اس تصویر کا ایک ایک رُخ مختلف اوقات میں دکھایا جاتا رہا تھا مگر ایک ہی مرقع میں پوری تصویر سامنے نہیں آسکی تھی۔ یہی اس مجموعہ کا اصل فائدہ ہے۔

میں نے اس پوری کتاب پر از سر نو نظر ثانی کر لی ہے اور ترتیب میں بھی میرا مشورہ شامل رہا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اپنی موجودہ صورت میں یہ کتاب نہ صرف عام ناظرین کے لیے مفید ثابت ہوگی، بلکہ خاص طور پر اسلامیات اور علم سیاست کے طالب علم اسے اپنے لیے بہت فائدہ مند پائیں گے۔

لاہور ۔ ۶ر شوال المکرم ۱۳۸۶ھ
مطابق ۱۸ر جنوری ۱۹۶۷ء

خاکسار
ابو الاعلیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از:۔ مرتب

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعہ ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظم قائم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے قیام و استحکام' اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقا کی تاریخ ہے۔

دور جدید میں عملی طریقوں کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نت نئی پیچیدگیوں کے راہ پا جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرۂ کار برابر بڑھ رہا ہے۔ اب دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام محض امن و امان اور نظم و ضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ آج ریاست نے ایک مثبت کردار (Role) اختیار کر لیا ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کر رہی ہے۔

(۱)

ریاست اور اسلام

اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی بھی نظرانداز نہیں

کیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لیے خالص ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی کہ:

یٰقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ (الاعراف: ۶۵)

"اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ[۱] نہیں ہے۔

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا کہ:

اتقوا اللہ واطیعون (الشعراء: ۱۶۳)

"اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کے لیے جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم ہو اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ تھا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت داؤدؑ' حضرت سلیمانؑ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم بھی کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا بھی۔ بائبل اور تلمود کے مطالعہ سے دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کے بارے میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے کہ انہوں نے ریاست کے ادارے کی اصلاح کی کوشش کی اور غلط قیادت پر بھرپور تنقید کی۔

---

[۱] الٰہ۔ رب۔ عبادت اور دین' ان اصطلاحات کی صحیح مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو۔ "قرآن کی بنیادی اصطلاحیں" از سید ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ خالق ارض و سماوات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ:

وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (بنی اسرائیل : ۸۰)

"اور دعا کرو! اے پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو داخل کر، سچائی کے ساتھ داخل فرما اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے"۔

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی پس منظر سے اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے اور اس سے ریاست کے ادارہ کی اہمیت بالکل روشن ہو جاتی ہے۔ اس آیت کا مفہوم مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن۔ یعنی "اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے، وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت

اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو، رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی کا عین تقاضا ہے"۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۶۳۸)

اس پر مزید روشنی مندرجہ ذیل آیات و احادیث سے پڑتی ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیه باس شدید ومنافع للناس (الحدید ۲۵:)

"ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری ہے۔ تاکہ انسان انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے اتارا لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت قوت ہے اور لوگوں کے لیے بہت فوائد ہیں"۔

ھو الذی ارسل رسوله بالھدیٰ ودین الحق لیظھره علی الدین کله ولو کره المشرکون (الصف: ۹)

"وہی ہے (ذات باری تعالیٰ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو"۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (المائدہ: ۴۴)

"اور وہ جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں"۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الاسلام والسلطان اخوان توامان لا یصلح واحد منهما الا بصاحبہ فالاسلام اس والسلطان حارس وما لا اس لہ لیھدم وما لا حارس لہ ضائع۔ (کنز العمال)

"اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے جس عمارت کی بنیاد نہ ہو۔ وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے"۔

اسلامی فکر میں دین اور سیاست کی دوئی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ اپنی ریاست کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ یہ جدوجہد ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے۔ وہ قرآن پاک اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس طرح اخلاق اور حسن کردار کی تعلیمات پاتے ہیں۔ اسی طرح معاشرت، تمدن، معیشت اور سیاست کے بارے میں واضح احکام بھی پاتے ہیں۔ اس دوسرے حصے پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی ریاست ہو اور اگر اس حصے پر عمل نہ کیا جائے تو شریعت کا ایک حصہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن کے تصور کا معاشرہ وجود میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے امت نے متفقہ طور پر نصب امامت کو فرض قرار دیا ہے اور اس بارے میں کوتاہی ایک دینی حکم کی بجاآوری میں کوتاہی ہے۔

علامہ ابن حزم اپنی کتاب "الفصل بین الملل والنحل" میں لکھتے ہیں:

اتفق جمیع اھل السنة وجمیع المرجئة وجمیع الشیعة وجمیع الخوارج علی وجوب الامامة وان الامة واجب علیھا الانقیاد لامام عادل یقیم احکام اللہ ویسوسھم باحکام الشریعة التی اتی بھا رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

"کل اہل سنت، مرجیہ، شیعہ اور خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

اور شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے"۔[۲]

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ عملاً صحابہ کرامؓ نے نصب امام کو کتنی اہمیت دی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جسد مطہر کی تجہیز و تدفین سے بھی پہلے امام کا انتخاب عمل میں آیا، جس نے آپؐ کے قائم کیے ہوئے نظام کو تھام لیا اور پھر پوری شان مرکزیت کے ساتھ سارے کام انجام دیئے۔ اسلام مادی اقتدار چاہتا ہے اور اس کے بغیر وہ اپنا مشن پورا نہیں کر سکتا۔۔۔ یہ اقتدار بجائے خود مقصود نہیں ہے لیکن دعوت کی تکمیل اور اصلاح انسانیت کے عظیم کام کی انجام دہی کے لیے ناگزیر ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے اس نکتہ کو واضح کر دیا کہ اسلام کا مادی اقتدار اس کے روحانی اقتدار کا ذریعہ ہے اور اس کے نتیجہ میں نیکیوں کا قیام اور برائیوں کا استیصال واقع ہوتا ہے۔

---

[۱] الفصل بین الملل والنحل از ابن حزم جلد چہارم صفحہ ۸۷۔

[۲] شاہ ولی اللہؒ، ازالۃ الخفاء، مقصد اول، فصل اول۔

الذ ین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (الحج : ۴۱)

"یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انھیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قائم کریں گے' ادائے زکوۃ میں سرگرم ہوں گے' نیکیوں کا حکم دیں گے' برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

۱ - ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور مشکل ہے۔

۲ - اسلام انسان کی پوری زندگی کے لیے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لیے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

۳ - اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے سیاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے استعمال کرتا ہے۔

۴ - یہ روش دنیا اور آخرت دونوں میں عتاب الٰہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الٰہی کو تو تسلیم کیا جائے اور کچھ دوسرے احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے' خواہ خواہش اور نفس کی اندرونی وحشت کی بنا پر یا کسی بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی وجہ سے۔

۵ - دین اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو ظلم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں "چنگیزی" رونما ہوتی ہے اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کا ایک

حصہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا کا دین حکمرانی اور غلبہ کے بجائے غلامی اور مغلوبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے۔

(۲)

دور جدید اور اسلامی ریاست

یہ تو ہے مسئلہ کا دینی پہلو۔ لیکن اگر ہم دور حاضر کے تجربات کی روشنی میں اس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا قیام وقت کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے۔ مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے۔ وہاں پاپائی نظام نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعہ جن مظالم کو سند جواز دی گئی انہوں نے ایک ردعمل پیدا کیا۔ عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدالی پیدا ہوئی کہ خود مذہب ہی کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور اس بغاوت کا سیاسی مظہر لادینی ریاست تھی۔

سیکولرزم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا جب جیکب ہولیک نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کی یہ تحریک قائم کی۔ اس تحریک کی سربراہی اہل فکر و سیاست کے ہاتھوں میں رہی اور بہت جلد اس مسلک کو سیاسی قبولیت حاصل ہو گئی' مختصرا اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود رہنا چاہیے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ شروع میں بات صرف مذہب کے معاملہ میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت

اور جارحانہ مادیت اور اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

مغرب میں لادینی ریاست کے جو اثرات رونما ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(ا) سیکولرزم نے تشکیک اور ذہنی پراگندگی کو پیدا کیا ہے۔ کوئی ایک نصب العین انسان کے سامنے نہیں رہا اور ایک قسم کی بے عقیدگی انسان میں پھیل گئی ہے۔ یہ اسی ذہنی انتشار اور فکری تشتت ہی کا نتیجہ ہے کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں نے جنم لیا اور انسان کو مادہ پرستی کی انتہا کی طرف لے گئیں۔ اشتراکیت کا مشہور نقاد آر۔ این کرو ہنٹ لکھتا ہے:

"اشتراکیت غربت و افلاس اور خراب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی اصلی کشش نچلے افلاس زدہ طبقات کے مقابلے میں اچھی تنخواہ والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کے لیے ہے۔ یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی خباثتوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی یہ نظام پیداوار کی اکتا دینے والی یکسانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے اور آخری تجزیہ ہمیں اسی نتیجہ تک لاتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعہ کا نام ہے جنھوں نے ہماری زندگی کے اس خلاء کو پر کیا ہے جسے منظم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک دوسرے ہمہ گیر نظام حیات ہی سے کیا جا سکتا ہے جو کچھ دوسرے اصولوں کا علمبردار ہو"۔[1]

اور جو حضرات اشتراکیت کی طرف نہیں گئے وہ ذہنی بے اطمینانی،

---

[1] (R.N. Crow-Hunt, Theory and Practice of Communism, London, 1951, P.6.

اضطراب، جذباتی تلون اور بے عقیدگی کا شکار ہوئے ہیں۔

(۲) فرد کے سامنے نیا نصب العین صرف ذاتی اغراض و خواہشات کی تکمیل رہ گیا اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطہ اخلاق ملکی اور قومی زندگی کے لیے باقی نہ رہا۔ نتیجتاً اس صدی نے دو ایسی ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی پوری تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعی مقتولین و مجروحین کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

(۳) اس کے عام اخلاقی اثرات بھی تباہ کن تھے۔ مستقل مزاجی، پامردی، جرات، اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا اور افادیت، مصلحت بینی اور ابن الوقتی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئے۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں سماجی اور معاشرتی برائیاں رونما ہوئیں جو معاشرہ کو سکون و اطمینان سے محروم کیے ہوئے ہیں۔

(۴) تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو اور کوئی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو، تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔ ارنلڈ ٹائن بی سیکولرزم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

"یہ اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے۔ ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرزم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجہ کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے"۔[۱]

---

۱ (Arnold J. Toynbee, Christianity Among the Religion of the World, P.56)

(۵) پھر حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم عملاً ناکام ہی نہیں ہوا ہے بلکہ تاریخ اب سیکولرزم سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو سیکولرزم آج ایک دقیانوسی اور ازکار رفتہ تصور ہے اور گردش ایام کے اس کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں' سیکولرزم کچھ خاص تاریخی عوامل کی پیداوار تھا اور ایک مخصوص فضا ہی میں وہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ عوامل موجود نہ ہوں تو اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

سیکولرزم' جیسا کہ ہم نے اوپر کہا' اس نظام کو کہتے ہیں جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو بات یہاں آجاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کا داعی ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم' انفرادیت' قومیت اور معاشی امور میں مکمل آزادی اور ریاست کی عدم مداخلت سیاست کے بنیادی تصورات تھے۔ اور یہ تمام تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سیکولرزم اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ریاست صرف ایک دفاعی ادارہ (پولیس اسٹیٹ) ہو یعنی اس کی ذمہ داری محض نظم و نسق کو قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملہ اور اندرونی بدامنی سے بچانا ہو۔ ایسے ہی نظام ریاست میں فرد کو پوری پوری آزادی دی جا سکتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور صرف اسی صورت میں حکومت (کم از کم نظری حد تک) مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کو روا رکھ سکتی ہے اور یہی تصور انیسویں صدی میں تھا لیکن آج ریاست کا تصور بدل گیا ہے۔ آج ریاست محض ایک عظیم الشان بت نہیں' آج یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک خاص دائرہ کو چھوڑ کر ملک میں جو کچھ بھی ہوتا رہے' ریاست عدم مداخلت پر کاربند رہے گی۔ آج اس کے وظائف نہایت عظیم اور اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ کی صورت گری کرتی ہے اور اپنی پالیسی کے ذریعہ سے اس کی ضابطہ بندی کرتی ہے۔ یہ

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہالت کو ختم کرے اور علم کی شمعیں روشن کرے' غربت کو ختم کرے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کرے۔ سماجی برائیوں کا قلع قمع کرے اور شہریوں کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کا بندوبست کرے۔ بیماریوں کا علاج' مظلوموں کی فریاد رسی' مجبوروں کی مدد و استعانت کا اہتمام کرے۔ مختصراً' آج کی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ نظریاتی غیر جانب داری برت سکے۔ اسے تو کچھ نہ کچھ اقدار کو ماننا ہو گا' کسی نہ کسی نظریہ کو قبول کرنا ہو گا' خیر و شر اور فلاح و خسران کے کسی نہ کسی معیار کو اختیار کرنا ہو گا۔ اور اس کی روشنی میں اپنی پوری پالیسی کو ترتیب دینا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ریاست ایک نظریاتی ریاست بنتی جا رہی ہے اور وہ بنیادیں جن پر سیکولرزم کا نظام فکر قائم تھا' تاریخی یادوں کی حیثیت سے تو ضرور موجود ہیں لیکن دنیائے حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ جن بنیادوں پر یہ قلعہ تعمیر ہوا تھا وہ گر چکی ہیں اور محض تمناؤں کے ذریعہ اس خلاء کو پر نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی دنیا میں سیکولرزم کے لیے کوئی گنجائش نہیں' تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے۔

(۳)

عالم اسلام میں اسلامی ریاست کی جدوجہد

اس پس منظر میں جب ہم قدرت کے اس انتظام پر غور کرتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلمان ممالک برسوں کی غلامی کے بعد پھر آزادی سے ہمکنار ہو رہے ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر ملک میں اسلامی نظام اور اسلامی ریاست کے قیام کی تحریک زور پکڑ رہی ہے تو ہمیں فطرت کا یہ اشارہ صاف

محسوس ہوتا ہے کہ گویا جدید تہذیب کے زوال سے جو خلا رونما ہو رہا ہے۔ اسے پر کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انیسویں صدی میں مسلمان ممالک ایک ایک کر کے مغربی استعمار کے چنگل میں چلے گئے۔ اور صرف دو تین ہی ملک ایسے رہ گئے جو سیاسی غلامی کی تاریک رات سے محفوظ رہے۔ بیسویں صدی میں حالات نے کروٹ لی اور خصوصیت سے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مسلمان ممالک کی آزادی کا رجحان رونما ہوا۔ اس وقت ۳۴ آزاد مسلمان ملک موجود ہیں جو اپنے سیاسی اور تمدنی مستقبل کو خود تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سیاسی آزادی کے ساتھ ہی بہت سے اہم مسائل رونما ہو گئے ہیں۔ جب تک مسلمان استعماری طاقتوں کے غلام تھے' ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی اجتماعی زندگی کی صورت گری اسلام کے اصولوں کے مطابق کر سکیں۔ ان کا دین زندگی کا ایک مکمل ضابطہ فراہم کرتا ہے اور وہ اس وقت تک اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے جب تک انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو جاری و ساری نہ کرلیں۔ فطری طور پر آزادی کے فوراً بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اب مجموعی نظام حیات کو اور خصوصیت سے ریاست اور قانون کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ یہی وہ احساس ہے جو اسلامی نظام حیات اور اسلامی ریاست کے قیام کے عوامی مطالبہ کی پشت پر کارفرما ہے۔

تاریخ کے وسیع تر پس منظر میں یہ تحریک بڑی حوصلہ افزا ہے اور اس سے مستقبل کی بہترین امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں لیکن غور و فکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آخر ایک مسلمان ملک میں اسلامی ریاست کے مطالبہ کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی ----- اسے تو فطری طور پر اسلامی ریاست ہی ہونا چاہیے اور اس کی ساری قوتیں اسی مقصد کے لیے صرف ہونی چاہئیں کہ وہ اسلام کے معیار

سے مطابقت پیدا کرے۔۔۔ لیکن بدقسمتی سے اصل صورت حال یہ نہیں ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دور استعمار میں جو تعلیمی انقلاب آیا اس نے خود مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام سے دور کر دیا۔ ان میں سے ایک عظیم اکثریت کی معلومات اسلام کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کے ذہنوں کو اتنا مسموم کر دیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں چند در چند غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ اسلامی تعلیمات سے بدظن ہے اور ان کو مغرب کے پیدا کردہ تعصبات کی عینک سے دیکھتا ہے۔ یہ گروہ آج کے دور میں اسلام کو ازکار رفتہ سمجھتا ہے اور مغرب کی اندھی تقلید اس کا دین و ایمان بن چکی ہے۔ یہ طبقہ خود اپنے ملک کے لوگوں کے جذبات و احساسات سے برسرپیکار ہے اور آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ ایک طرف غفلت اور جہالت ہے اور دوسری طرف سوء ظن اور عداوت اور یہی چیزیں اسلامی ریاست کے فروغ کی راہ میں اہم ترین رکاوٹیں ہیں۔ ہماری نگاہ میں ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف اسلامی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور عوام کی ذہنی اور فکری تربیت ہو اور دوسری طرف زندگی کے تمام شعبوں میں ایک ایسی قیادت کو ابھار کر اوپر لایا جائے جو مسلمانوں کے سواد اعظم کے جذبات و احساسات کو سمجھتی ہو' اسلام پر پکا یقین رکھتی ہو اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسے جاری و ساری کرنے کا داعیہ رکھتی ہو۔ یہی وہ صورت ہے جس میں قوم کی صلاحیتیں اور قوتیں باہم کشمکش کے بجائے مثبت تعمیر میں صرف ہوں گی اور اس طرح برسوں کی منزلیں مہینوں میں طے ہو سکیں گی۔

(۴)

کچھ اس کتاب کے بارے میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہی یہ ہے کہ انہوں نے بیک وقت ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کی کماحقہ کوشش کی ہے۔ ایک طرف انہوں نے اسلام کے پورے نظام حیات کو دینی اور عقلی دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور اسلام کی اصل تعلیمات کو دور حاضر کی زبان میں پیش کیا ہے۔ ان کی تحریرات کے مطالعہ سے قاری کو زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کا کلی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ پوری تصویر کو بیک نظر دیکھ سکتا ہے۔ انہوں نے ہر مرعوبیت سے بالا ہو کر دور حاضر کے ہر فتنہ کا مقابلہ کیا ہے اور اسلام کے نظام زندگی کی برتری اور فوقیت کو ثابت کیا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر اسلامی نظام کی محض نظری تشریح و توضیح ہی نہیں کی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس نظام کو دور حاضر میں کیسے قائم کیا جا سکتا اور آج کے اداروں کو کس طرح اسلام کے سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ ویسے تو مولانا مودودی صاحب نے یہ کام زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں کیا ہے لیکن اسلامی ریاست کے تصور اور اس کے نظام کار کی تشریح و توضیح ان کا خاص میدان رہی ہے۔ انہوں نے جس اعتماد اور یقین کے ساتھ' جس بالغ نظری کے ساتھ' جس وسعت فکر اور گہرائی کے ساتھ اور جس شرح و بسط کے ساتھ اسلامی ریاست کے ہمہ پہلوؤں کی وضاحت کی ہے' اس میں دور حاضر میں ان کا کوئی شریک اور مدمقابل نہیں۔ بلاشبہ وہ اس پہلو سے عرب و عجم میں منفرد ہیں' موصوف نے دور جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسلامی ریاست کا مکمل نقشہ پیش کیا ہے اور اجتہادی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے اور تمام عملی مسائل کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کیا

ہے --- اور یہی ان کا امتیازی کارنامہ ہے۔

اسلامی ریاست کے بارے میں مولانا کے یہ مضامین و مقالات منتشر تھے۔ ان میں سے کچھ مختصر پمفلٹوں کی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں' لیکن تمام مضامین ایک جگہ کتابی شکل میں پیش نہیں کیے جا سکے تھے۔ میں نے جس وقت اسلامی قانون اور اسلامی ریاست کے موضوعات پر مولانا کی تحریرات کا انتخاب انگریزی میں "اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن" (Islamic Law & Consitituion) کے نام سے پیش کیا تھا' اسی وقت اس ضرورت کا احساس بھی پیدا ہوا تھا کہ یہ مجموعہ اردو میں بھی شائع ہونا چاہیے لیکن مولانا اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث خود یہ کام نہ کر سکے۔ پھر جب میں نے انگریزی کتاب کا دوسرا نظرثانی شدہ ایڈیشن تیار کیا تو یہ احساس دوبارہ تازہ ہو گیا اور چند احباب کے اصرار پر مولانا کے ارشاد کے مطابق میں نے ہی اردو کتاب کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیا۔ تمام مواد جمع کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اسلامی ریاست اور اسلامی قانون کے موضوعات پر الگ الگ کتابیں تیار کرنی ہوں گی۔ ایک ہی کتاب دونوں قسم کے مقالات کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ اس لیے ۱۳۸۰ھ (مطابق ۱۹۶۰ء) میں' میں نے "اسلامی ریاست" کے نام سے مولانا کے اہم مضامین کو مرتب کیا اور خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ اہل علم نے اسے بہت پسند کیا اور یونیورسٹیوں میں اسے نصاب میں شامل کیا گیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کتاب کئی پہلوؤں سے نامکمل تھی اور میرے اصل منصوبہ کے مطابق نہ تھی لیکن چونکہ اس وقت کام کرنے کی وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو کام کی تکمیل کے لیے درکار تھیں اس لیے اس حالت میں کتاب کو طباعت کے لیے بھیج دیا گیا۔ اب الحمدللہ ادارہ معارف اسلامی میں مولانا محترم کی تمام تحریرات جمع کر لی گئی ہیں اور یہاں مولانا کی تمام نگارشات کو نئی ترتیب کے ساتھ لانے کا کام کیا جا رہا ہے۔ کئی مہینے کی محنت کے بعد ہم اپنی پہلی پیش کش

"اسلامی ریاست : فلسفہ نظام کار اور اصول حکمرانی" پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں حقی الوسع مولانا مودودی صاحب کی ان تمام تحریرات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا جو اسلامی ریاست سے متعلق ہیں۔ کتاب کے پہلے اڈیشن میں نظری مباحث اور پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے سلسلہ کی تحریرات گڈمڈ تھیں' اب ان کو بھی الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں صرف نظری اور علمی مباحث ہیں۔ پاکستان کے سلسلہ کی نگارشات کو انشاء اللہ الگ مرتب کیا جائے گا۔ اس کتاب میں ترجمان القرآن کے پرانے فائلوں سے وہ مضامین بھی لے لیے گئے ہیں جو اب تک کتابی شکل میں نہیں آئے تھے۔ البتہ ہم نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ پرانی تحریرات میں سے صرف ان حصوں کو شامل کیا جائے جو موضوع زیر نظر سے متعلق ہیں۔ رہیں وہ بحثیں جو وقتی نوعیت کی تھیں یا جن کا تعلق مخصوص شخصیات اور ان کے اس وقت کے نظریات سے تھا' ان کو حذف کر دیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارے پیش نظر ان بحثوں اور اختلافات کو زندہ کرنا نہیں ہے' اس لیے وہ چیزیں اب غیر ضروری تھیں۔ البتہ ہم نے ان تمام حصوں کو محفوظ کر لیا ہے جن میں اصولی مباحث تھے اور اس طرح وہ اپنی دائمی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے فائلوں کے علاوہ ہم نے تفہیم القرآن کو بھی بغور پڑھا ہے اور اس کے حواشی میں کی ہوئی علم سیاست کی تمام اہم بحثوں کو بھی نکال لیا ہے اور انھیں دو مستقل مقالات کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ اس طرح یہ دونوں مقالے اپنی موجودہ شکل میں پہلی مرتبہ زیور طباعت سے آراستہ ہو رہے ہیں اور ان سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ تفہیم القرآن میں کتنی ضمنی بحثیں آگئی ہیں جن کے منتشر ہونے کی وجہ سے ان سے بیک نظر استفادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مرتب نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ مولانا کی تحریرات کو زیادہ سے زیادہ حسن ترتیب اور منطقی ربط کے ساتھ پیش کرے۔ اسے اس سلسلہ میں

کچھ حذف و اضافہ سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ اس کے لیے مولانا کی تحریر میں ذرا سی تبدیلی بھی ایک بڑا ہی مشکل اور شاق کام تھا۔ لیکن ایسے مضامین کو جو تقریباً پچیس سال کے عرصہ میں مختلف نوعیت کی ضرورتوں کے پیش نظر لکھے گئے ہوں اور جن میں لکھتے وقت کسی کتابی ترتیب کو سامنے نہ رکھا گیا ہو' کتابی شکل میں لاتے وقت کچھ تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ حق تو یہ تھا کہ یہ کام مولانا محترم خود انجام دیتے لیکن ان کی مصروفیت نے انھیں اجازت نہ دی اور حالات تقاضا کر رہے تھے کہ یہ قیمتی تحریرات مرتب شکل میں اہل علم کے سامنے آ جائیں۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا پورا پورا احساس ہے اور شاید میں یہ کام کبھی نہ کر پاتا اگر خود مولانا کی حوصلہ افزائی مہمیز کا کام نہ کرتی۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ پر اتنا اعتماد فرمایا اور یہ اہم خدمت میرے سپرد کی۔ میرے لیے اس کتاب کی تیاری ایک بہت بڑی سعادت کی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مولانا نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے اور اپنے مشوروں سے مجھے نوازتے رہے ہیں۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں اس ذمہ داری کو کس حد تک ادا کر سکا ہوں۔ اگر میں اس میں کچھ بھی کامیاب رہا ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کام میں جو بھی کوتاہی رہی ہے' اس کا بار میرے اوپر ہے۔ **وما توفیقی الا باللہ۔**

ادارہ معارف اسلامی' کراچی — خورشید احمد

۲۷ صفر ۱۳۸۶ھ

حصہ اول

اسلام کا فلسفہ سیاست

- دین و سیاست
- اسلام کا سیاسی نظریہ
- قرآن کا فلسفہ سیاست
- معنی خلافت
- اسلامی تصور قومیت

باب اول

دین و سیاست

- مذہب کا اسلامی تصور
- اسلامی ریاست کیوں؟
- اسلام اور اقتدار
- دین و سیاست کی تفریق کا باطل نظریہ اور ----- قصہ یوسف علیہ السلام سے غلط استدلال
- تفریق دین و سیاست کا دفاع اور اس کا جائزہ

اسلام کے سیاسی نظام کے مطالعہ میں جو سوال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا تصور مذہب کیا ہے اور وہ سیاست، اقتدار اور اجتماعی امور حیات کے بارے میں کیا نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ مذہب کے محدود تصور کی وجہ سے اس بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور مذہبی اور سیاسی دونوں ہی حلقوں کے بہت سے لوگ اس بارے میں فکری انتشار میں مبتلا ہیں۔ اس لیے ہم اسلام کے فلسفہ سیاست کے بارے میں سب سے پہلے اس بحث کو پیش کر رہے ہیں۔

دور جدید کی اسلامی فکر میں مولانا مودودی صاحب کا یہ مخصوص کارنامہ ہے کہ انہوں نے تفریق دین و سیاست پر ایک کاری ضرب لگائی ہے اور اسلام کے جامع اور انقلابی تصور کو آئینہ کی طرح صاف کر کے پیش کیا ہے۔ ہم اس باب کو مولانا موصوف کی مختلف تحریرات سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول اور ترجمان القرآن کے فائلوں میں پائی جانے والی بہت سی بحثوں سے ضروری حصے لیے گئے ہیں۔ اور مرتب نے ان موتیوں کو ایک لڑی میں پرو کر زیر نظر مضمون کی شکل دی ہے۔

مرتب

دین و سیاست [1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے' یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اس کا تعلق کلیتہ" صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ نجات مطلوب ہو' اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود ان پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے' اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے' اپنے ابنائے نوع سے' اپنے گردوپیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے' اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز' ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

---

[1] یہ مضمون تحریک آزادی ہند اور مسلمان۔ جلد اول۔ باب ۶ سے ماخوذ ہے۔ (مصنف سید ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔) مرتب

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں' اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو' اس پر پوری زندگی کی عمارت' ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا' مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت' مادی علائق سے نفرت' لذات دنیوی سے کراہت' عالم اسباب سے بے تعلقی' انسانی تعلقات میں انفرادیت' تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا۔ بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی' مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اس کو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں' اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی اور بد سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے' مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے' تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے' نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے' اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے' کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوئی ہے۔

سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے اور دنیا کے معاملات

و دنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر' جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے' جس طرح چاہا چلایا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم' ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں' ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا۔ جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی' سود خواری اور قارونیت کا بھی' فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

(۱)

مذہب کا اسلامی تصور

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصور پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً" بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو' زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو' صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو' زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہ راست اور راہ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے' راہ کج سے بچائے' راہ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے' اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں' جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے' انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گزارے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے' بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ماتحت ایک ضمیمہ زندگی قرار دیا جائے' یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے' اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو

اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں' بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خالق کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں۔ دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں۔ اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ ان الدین عندالله الاسلام۔ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔ (آل عمران: ۱۹)

مذہب اور تہذیب

اسلام ایک خاص طریق فکر (Attitude of Mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطہ نظر (Outlook of Life) ہے۔ پھر وہ ایک خاص طرز عمل ہے جس کا راستہ اسی طریق فکر اور اسی نظریہ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریق فکر اور طرز عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے' وہی تہذیب اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریق فکر اور نظریہ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں۔ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں۔ ماں باپ کے' بیوی بچوں کے' عزیزوں اور قرابت داروں کے' پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے' ہم مذہبوں اور غیرمذہب والوں کے' دشمنوں اور دوستوں کے' ساری نوع انسانی کے' حتیٰ کہ کائنات کی ہرچیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے اور ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا۔ بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو

دوسرے حق پر قربان کرے۔

پھر یہی طریق فکر اور نظریہ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے نظر معین کرتا ہے اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو' خواہ وہ کسی میدان میں ہو' ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے' جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے اور جو شے سدراہ ہوتی ہے' اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک' یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں' لباس میں' صنفی تعلقات میں' لین دین میں' بات چیت میں' غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ مرکز مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت' معیشت' سیاست' غرض ہر شعبہ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزل مقصود کی طرف جانے والے ہوں' اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لیے مسخر کی جائیں' ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے' تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں' اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں' جنگ میں اور صلح میں' اشتراک اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں' غلبہ کی حالت

میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو، بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً" و کرہاً" شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروان اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطہ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کارزار تک، طریق عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثار فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا، اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرہ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی

بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشہ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں تو دین داری کو عبادت کے دائرے میں محدود خیل کریں تو جائے تعجب نہیں' کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال" جاہل عوام اگر مذہب کو باجے' تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقام حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگان نور علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

ہماری سیاست میں جاہلی تصور مذہب کے اثرات

فہم و ادراک کے اس تصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے' بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے' سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے۔ اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی[1] ہوں' پھر مسلمان۔ اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام' ایرانی اسلام' مصری اسلام' ہندوستانی اسلام اور پھر

---

[1] واضح رہے کہ مضمون تقسیم سے قبل لکھا گیا تھا لیکن قومیت سے پیدا ہونے والا یہ ذہن آج بھی عالم اسلام میں ہر جگہ موجود ہے۔ مرتب

پنجابی، بنگالی، دکنی اور مدراسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے۔ زندگی کا ایک جداگانہ نقطہ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے۔ ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ایک "مذہبی ضمیمہ" ہے جو دنیاوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں، یعنی اعتقادات اور عبادات۔ ان کی حد تک مسلمان اپنی راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ ان کو انجام دیتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہیے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے لیے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک الگ نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہونا چاہیے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے اٹھے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبیعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے، تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن

فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں اس لیے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں' وہی ان کے نزدیک اصلی اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عقل کی تہ میں کام کرتا ہے' اور جو اپنے طریق فکر اور زاویہ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا راستہ اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے' سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا--- وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو' یا جرمن' یا اطالوی یا فاروقی یا خالدی' ان کو اس سے کوئی بحث نہیں' ان کے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی" ذہن ہیں۔ کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے' یعنی علو اور تمکن فی الارض' ان کی نگاہ میں جس کو "زمین کی وراثت" حاصل ہے۔ وہی "صالح" ہے۔ اگرچہ وہ ابراہیمؑ کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے' وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ مسیحؑ کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک بڑا گروہ وہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام اور اس کی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ ان کے مذہب اور "پرسنل لا" کی حفاظت کا اطمینان دلایا جائے' ان کی زبان کو اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کرلیا جائے' اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو۔ صرف انہی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ ہو گا جب تک خود مسلمان نمائندوں کی غالب اکثریت اس کو قبول نہ کرے تو ان کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا۔

دیکھا آپ نے! شکلیں کس قدر مختلف ہیں' مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں' اسی جاہلی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے

خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے' تو ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے' جو کلمہ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو' لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے' اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔ ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے' نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرار اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ تمہارا طریق فکر وہی ہو' جو قرآن کا طریق فکر ہے--- زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو' جو قرآن کی نظر ہے۔ تم اشیاء کی قدریں (Values) اسی معیار کے مطابق معین کرو' جو قرآن نے اختیار کیا ہے تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو' جو قرآن نے پیش کیا ہے--- تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی بنا پر انتخاب کرو' جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔ اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد کر لیتے ہو' تو پھر زندگی کے معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اس راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا جسے قرآن سبیل المومنین کہتا ہے۔

قرآنی ذہن

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن--- کہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں--- جس نظریہ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے۔ چند عبادات تجویز کرتا ہے' چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعائر" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے۔ ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں' پہننے کے سامان میں' لباس کی وضعوں

میں' معاشرت کے طریقوں میں' تجارتی لین دین میں' معاشی بندوبست میں' سیاست کے اصولوں میں' تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں' مادی وسائل اور قوانین طبعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں' بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرا ہے۔ یہاں چونکہ نقطہ نظر ایک ہے' طریق فکر ایک ہے' نصب العین ایک ہے۔ ترک و اختیار کا معیار ایک ہے۔ اس لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے' سعی و جہد کے راستے' معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں الگ ہو سکتی ہیں' احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصول کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے' ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے' لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے' جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے۔ جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے' اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی' آپ خواہ پاکستانی ہوں یا ترکی یا مصری' اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی اور اس اسکیم کو رد کر دینا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔

یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے' اور دوسرا مرحلہ نتائج کا --- آپ زندگی کے پہلے مرحلے میں دنیا کو جس طرح برتیں گے۔ دوسرے مرحلے میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے --- اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرنا ہے' کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقہ سے برتیں تاکہ دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں۔ پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے' اور اس میں اعتقادات و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور

سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ اسکیم کے بجائے کسی اور اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں تو یہ جزوی ارتداد ہے' جو آخرکار ارتداد پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں۔ آپ معتقدات دین اور عبادات دینی کو قبول کرتے ہیں' مگر اس نظام زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جس کی عمارت انہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجزیہ ہی اسلام کی رو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام پر ایمان رکھتا ہو' اس کا ارادہ نہیں کر سکتا' کیونکہ یہ افتومنون ببعض الکتب وتکفرون ببعض[1] کا مصداق ہے۔ پھر اگر آپ نے یہ تجزیہ کر کے دائرۂ اسلام میں رہنے کا عزم کیا بھی تو آپ اس دائرہ میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکیں گے کیونکہ نظام زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد معتقدات دین اور عبادات دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصدی فوت ہو جاتا ہے۔ غیر اسلامی اصول حیات پر ایمان لانے کے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ جو قدم قدم پر ان اصول حیات کی تکذیب کرتا ہے۔

بخلاف اس کے اگر آپ اس اسکیم کے مطابق اپنی سیاسی و معاشی زندگی کے معاملات کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ پارٹیوں میں منقسم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں' ایک ہی پارٹی --- حزب اللہ --- ان سب کاموں کے لیے کافی ہے' کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور' زمیندار اور کاشتکار'

---

[1] کیا بات ہے کہ تم کتاب خدا کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔ (البقرہ ۸۵)

راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے' بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراک عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں' کیوں نہ آپ اُن اصولوں کے مطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں' وہ اگر مجبوراً تنازع طبقات **(Class War)** کی آگ میں کودتے ہیں' تو آپ کیوں ان کے پیچھے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے۔ دوسرا وہ تھا جو صحابہ کرام اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں' اور دونوں تسخیر عناصر' استعمال اسباب اور قوانین طبعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں' مگر زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطہ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بعد --- بعد المشرقین --- ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن اس تسخیر عناصر اور استعمال اسباب کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ بھی اگرچہ تسخیر عناصر اور استعمال اسباب سے ہی حاصل ہو سکتا ہے' مگر اس کی تہہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو' اور جب تک کہ زندگی کی ساری جدوجہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے --- وہی "ارکان اسلام" جن کو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

(۲)

اسلامی ریاست کیوں؟

ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے' اگر وہ بحیثیت مسلمان زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی کو خدا کی اطاعت میں دیں اور اپنے انفرادی اور اجتماعی تمام معاملات کا فیصلہ خدا کے قانون اور اس کی شریعت کے مطابق کریں۔ اسلام اس بات کو گوارا کرنے کے لیے قطعاً" تیار نہیں کہ آپ ایمان کا اعلان تو کریں اللہ رب العالمین پر اور زندگی کے معاملات طے کریں غیر الٰہی قانون کے مطابق۔ یہ وہ سب سے بڑا تناقض ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے اور اسلام اس کو گوارا کرنے کے لیے نہیں' اس تناقض کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ اور اسلامی ریاست اور اسلامی دستور کے مطالبہ کی پشت پر دراصل یہی احساس کارفرما ہے کہ اگر مسلمان خدا کے قانون کی پیروی نہیں کرتا تو اس کا دعویٰ اسلام ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر پورا قرآن دلیل ہے۔[1]

۱۔ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلق اسی کی ہے لہٰذا فطرتاً امر کا حق (Right of Rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک (Dominion) میں اس کی خلق پر' خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ صحیح راستہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اس

---

[1] اقتباسات از "ایک نہایت اہم استفتاء" صفحہ ۸ تا ۱۴۔ مرتب

کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت میں اس کے قانون شرعی کے مطابق حکمرانی ہو اور فیصلے کیے جائیں۔

قل اللھم ملک الملک توتی الملک من تشآء وتنزع الملک ممن تشآء
(آل عمران:۲۶)

کہو اے اللہ' مالک الملک! تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

ذالکم اللہ ربکم لہ الملک (فاطر:۱۳)

وہ ہے اللہ' تمہارا رب' ملک اسی کا ہے۔

لم یکن لہ شریک فی الملک (بنی اسرائیل:۱۱۱)

بادشاہی میں کوئی اس کا شریک (Partner) نہیں۔

فالحکم للہ العلی الکبیر (المومن:۱۲)

لہٰذا حکم اللہ بزرگ و برتر کے لیے خاص ہے۔

ولا یشرک فی حکمہ احدا (الکہف:۲۶)

اور وہ اپنے حکم میں کسی کو حصہ دار نہیں بناتا۔

الا لہ الخلق والامر (اعراف:۵۴)

خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔

یقولون ھل لنا من الامر من شئی قل ان الامر کلہ للہ (آل عمران:۱۵۴)

لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو کہ امر سارا اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

۲۔ اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے سلب کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے' بندہ اور محکوم ہے' اور اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہو۔ البتہ قانون الٰہی کی حدود کے اندر استنباط و اجتہاد سے تفصیلات فقہی مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے۔ جس

کی اجازت ہے۔ نیز جن امور میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو' ان میں روح شریعت اور مزاج اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے۔ کیونکہ ایسے امور میں کسی صریح حکم کا نہ ہونا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کے متعلق ضوابط و احکام مقرر کرنے کا قانونی حق اہل ایمان کو دے دیا گیا ہے۔ لیکن جو بنیادی بات سامنے رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کوئی قانون بناتا ہے یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ طاغوت و باغی اور خارج از اطاعت حق ہے' اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اس کے فیصلہ پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے۔

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام (النحل: ۱۱۶)

اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو' ان کے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال (Lawfull) ہے اور یہ حرام (Unlawfull) ہے۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (اعراف: ۳)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھیرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (المائدہ: ۴۴)

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم امنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ (النساء: ۶۰)

اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس

ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے۔ اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس کے حکم کو تسلیم نہ کریں)

۲۔ خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور عدالت صرف وہ ہے' جو اس قانون کی بنیاد پر قائم ہو' جو اس نے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے' اسی کا نام خلافت ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللّٰہ (النساء : ۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کی بناء پر اس کی اطاعت کی جائے۔

انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰک اللّٰہ (النساء : ۱۰۵)

اے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

وان احکم بینہم بما انزل اللّٰہ ولا تتبع اھواء ھم واحذرھم أن یفتنوک عن بعض ما انزل اللّٰہ الیک (المائدہ : ۴۹)

اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اس ہدایت کے کسی جزء سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔

افحکم الجاھلیۃ یبغون (المائدہ : ۵۰)

کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟

یا داود انا جعلنٰک خلیفۃً فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ (ص: ۲۶)

اے داؤد! ہم نے تم کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ لہٰذا تم حق کے ساتھ لوگوں کے درمیان حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ اللہ کے راستہ سے وہ تم کو بھٹکا لے جائے گی۔

۴۔ اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو۔ بلالحاظ اس کے کہ تفصیلات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیتیں باہم کتنی ہی مختلف ہوں۔ ان کے تمام افعال بے اصل' بے وزن اور باطل ہیں۔ ان کے حکم اور فیصلہ کے لیے سرے سے کوئی جائز بنیاد ہی نہیں ہے۔ حقیقی مالک الملک نے جب انھیں سلطان (Charter) عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔[1] وہ تو جو کچھ کرتی ہیں خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کالعدم ہے۔ اہل ایمان (یعنی خدا کی وفادار رعایا) ان کے وجود کو بطور ایک خارجی واقعہ (Defacto) کے تسلیم کر سکتے ہیں مگر بطور ایک جائز وسیلہ انتظام و فصل قضایا (Dejure) کے تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کا کام اپنے اصلی فرمانروا (اللہ) کے باغیوں کی اطاعت کرنا اور ان سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہنا نہیں ہے اور جو ایسا کریں' ادعائے اسلام و ایمان کے باوجود' وفاداروں کے زمرہ

---

[1] چارٹر یا سلطان سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو خدا کو مالک الملک اور اپنے آپ کو اس کا خلیفہ (نہ کہ خود مختار) تسلیم کرے' پیغمبر کو اس کا معتبر اور کتاب کو اس کی کتاب مانے اور شریعت الٰہی کے تحت رہ کر کام کرنا قبول کرے صرف ایسی ہی حکومت اور عدالت کو خداوند عالم کا چارٹر حاصل ہے یہ چارٹر خود قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ **احکم بینھم بما انزل اللہ** (لوگوں کے درمیان حکومت کرو اس قانون کے مطابق جو اس نے نازل کیا ہے)

سے خارج ہیں۔ یہ بات صریح عقل کے خلاف ہے کہ کوئی حکومت ایک گروہ کو باغی بھی قرار دے اور پھر اپنی رعایا پر ان باغیوں کے اقتدار کو جائز بھی تسلیم کرے اور اپنی رعایا کو ان کا حکم ماننے کی اجازت دے دے۔

قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالًا ○ الذين ضل سعيهم فى الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعًا ○ اولئك الذين كفروا بايت ربهم ولقائه فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيمة وزنًا

(الکہف: ۱۰۳ ـ ۱۰۵)

اے نبی! ان سے کہو کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ یہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری سعی بھٹک گئی (یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود' رضائے الٰہی سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی) اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کی ملاقات (یعنی اس کے سامنے حاضر ہو کر حساب دینے) کا عقیدہ قبول نہ کیا۔ اس لیے ان کے سب اعمال حبط (کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔

تلك عاد جحدوا بايت ربهم وعصوا رسله واتبعوا امر كل جبار عنيد

(ھود: ۵۹)

یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی اطاعت نہ کی اور ہر جبار دشمن حق کے امر کا اتباع کیا۔

ولقد ارسلنا موسٰى بايتنا وسلطن مبين ○ الٰى فرعون وملائه فاتبعوا امر فرعون وما امر فرعون برشيد (ھود: ۹۶)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح روشن سلطان کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان ریاست کے پاس بھیجا مگر ان لوگوں نے (ہمارے

فرستادہ شخص کے بجائے) فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر درست نہ تھا۔ (یعنی مالک الملک کے سلطان پر مبنی نہ تھا)

ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھونہ وکان امرہ فرطا○

(الکھف: ۲۸)

اور تو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے (یعنی اس حقیقت کے شعور و ادراک سے کہ ہم اس کے رب ہیں) غافل کر دیا ہے' جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جس کا امر حق سے ہٹا ہوا ہے۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق وان تشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطانًا (اعراف: ۳۳)

اے نبی کہہ دو کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فحش کاموں کو خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور معصیت کو' اور حق کے بغیر ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کو' اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکمیت اور الوہیت میں) ان کو شریک کرو جن کے لیے اللہ نے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔

ما تعبدون من دونہ الا اسمآء سمیتموھا انتم واباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطن ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ (یوسف: ۴۰)

تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی بندگی کرتے ہو' وہ تو محض نام ہیں۔ جو تم نے اور تمہارے اگلوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔ حکم صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم وسآءت مصیرا○ (النساء: ۱۱۵)

اور جو کوئی رسول سے جھگڑا کرے در آں حالیکہ راہ راست اس کو دکھا

دی گئی' اور ایمان داروں کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے' اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود مڑ گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم (النساء: ٦٥)

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اے نبی! تجھ کو اپنے باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا نہ تسلیم کریں۔

واذا قیل لهم تعالوا الی ما انزل الله والی الرسول رایت المنفقین یصدون عنک صدودا ○ (النساء: ٦١)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقین کو دیکھا کہ تجھ سے جھجک رہے ہیں۔

ولن یجعل الله للکفرین علی المومنین سبیلا ○ (النساء: ١٤١)

"اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے باغیوں) کے لیے اہل ایمان (یعنی اپنی وفادار رعایا) پر کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

یہ قرآن کے محکمات ہیں۔ ان میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے اور یہی وہ مرکزی عقیدہ ہے جس پر اسلام کے نظام فکر' نظام اخلاق اور نظام تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے اور مسلمان اپنے ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے جب تک وہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم نہ کر لیں۔ خدا کے قانون کی بالادستی قائم کیے بغیر بحیثیت مسلمان زندگی نہیں گزار سکتے۔ اس لیے ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے کہ خلافت الٰہی کا نظام قائم ہو اور زندگی کے تمام معاملات خدا کے قانون کے مطابق طے ہوں۔ انبیاء کرام علیہم السلام اس مقصد کے لیے مبعوث کیے گئے کہ خدا کی حاکمیت کا نظام قائم کریں۔ اس لیے دیکھیے کہ ہجرت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ دعا منگوائی جاتی ہے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ٦٣٨

وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا ○ (بنی اسرائیل : ۸۰)

اور دعا کر کہ پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں' فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں' اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے کی ہے' اور اس کو ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن۔ یعنی اللہ تعالٰی حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے' وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالٰی نے اپنے نبیؐ کو خود سکھائی ہے' تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے' اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔

---

(۳)

اسلام اور اقتدار

اوپر کی بحث سے اسلامی ریاست کی ضرورت واضح ہو چکی ہے۔ لیکن چونکہ مختلف وجوہ سے دین و سیاست کی تفریق کے شیطانی فلسفہ نے خود مسلمانوں کے ذہن و فکر کو بھی متاثر کیا ہے اور وہ طرح طرح کی تاویلیں کر کے اس تفریق کے لیے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلام کس قسم کا انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے اور اس بارے میں جو غلط تاویلات کی جا رہی ہیں' ان کی حقیقت کیا ہے۔

"تفہیم القرآن"[1] میں آیت **وقاتلوهم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین لله فان انتهوا فلا عدوان الا علی الظلمین**[2] کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ "باز آ جانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آ جانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آ جانا ہے۔ کافر' مشرک' دہریے' ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے رکھے اور جس کی چاہے عبادت کرے' یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے

---

[1] یہ مضمون ترجمان القرآن میں شعبان تا شوال ۱۳۶۱ھ مطابق ستمبر تا نومبر ۱۹۴۲ء شائع ہوا تھا۔ مرتب۔

[2] آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ "اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو دست درازی جائز نہیں ہے مگر ظالموں پر۔" البقرہ ۱۹۳

لیے ہم اسے فہمائش اور نصیحت تو کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا کسی کا بندہ بنائے۔ یہ فتنہ بزور شمشیر مٹایا جائے گا اور مومن کی تلوار اس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی روش سے باز نہ آ جائیں"۔ اس تفسیر کے خط کشیدہ فقرے پر ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب علم بزرگ نے حسب ذیل اعتراض کیا:

(الف) اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام جو امن اور سلامتی کا حامی اور موید ہے، دوسروں کے مذہب میں مداخلت اور اس بنا پر لڑائی روا رکھتا ہے، حالانکہ یہ امر لا اکراہ فی الدین[1] کے مخالف ہے۔

(ب) مخالفین کو اپنے اپنے مذہب اور عقائد پر قائم رہنے کی آزادی لکم دینکم ولی دین سے بھی ظاہر ہے۔ جو کوئی اپنے عقائد میں آزاد ہو گا اسے ان کی اشاعت اور تبلیغ میں بھی آزادی ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ انہی عقائد کو برحق سمجھتا ہے۔ قرآنی مفہوم سے اسی آزادی کا پتہ چلتا ہے اور باہمی مناظرات کا ثبوت بھی ملتا ہے، مثلاً لا تجادلوا اهل الكتب الا بالتی هی احسن[2] غیر مذاہب کے عبادت خانے اور طریق عبادت اسلامی مداخلت سے محفوظ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی میں اہل کتاب کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی ملازمت اختیار کی جس کا عقیدہ اور عمل مشرکانہ تھا۔ ہاں اپنے طور پر امن کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے جیسا کہ یاصاحبی السجن ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القهار[3] سے ظاہر ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی اپنے خیالات کی اشاعت کا حق پہنچتا ہے۔

---

[1] البقرہ۔ ۲۵۶ [2] عنکبوت۔ ۴۶ [3] سورہ یوسف۔ ۳۹

(ج) زیر خط عبارت کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمان کہیں بھی مخلوط آبادی میں امن سے زندگی نہیں گزار سکتے۔ غیر مسلم تمدنی اور معاشرتی امور میں بھی کیوں ان کے ساتھ تعاون باہمی اور رواداری سے کام لیں۔ جب کہ ان کا سیاسی اور اساسی عقیدہ ہی سد راہ ہو؟ ایسے مسلمان اگر ترکی اور ایران میں بھی آباد ہوں، تو بقول آپ کے وہاں بھی انھیں علم جہاد بلند کرنا ہو گا کیونکہ ان ممالک میں حدود اور قوانین اسلامی نافذ نہیں۔ اس زمانہ میں عالمگیر سیاست اس نہج پر مدون ہے کہ کوئی جماعت غیر معروف طریقوں سے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل باہمی سے کام نہیں لے سکتی' کیونکہ آپ کا فرمودہ استدلال کسی اشتراک عمل کے لیے مانع ہو گا۔ اگر اسلامی جماعت اپنے عقائد کی اشاعت کا حق رکھتی ہے تو اسے غیر مسلموں کو بھی' خصوصاً جب کہ وہ حکمران ہوں' وہی حق دینا ہو گا۔ ہرچہ برخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اہل کتاب کے ساتھ جو تعامل باہمی کے معاہدے کیے تھے کیا وہ معاہدے ایسی ہی شرائط پر مبنی تھے؟ مکی زندگی کے ابتدائی مراحل آپ کے استدلال کے موید نہیں۔ بالفاظ دیگر ایسی جماعت کا وجود ہی کسی غیر مسلم حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہے کہ جونہی اسے قوت ملی وہ اس کے قوانین اور اس کے نظام حکومت کو مٹانے کے لیے تلوار ہاتھ میں لے لے گی۔ کون اس کو برداشت کرے گا؟"

اس اعتراض کا مختصر جواب تو چند جملوں میں بھی دیا جا سکتا ہے' لیکن درحقیقت یہ اعتراض اپنی پشت پر غلط فہمیوں کا ایک بڑا انبار رکھتا ہے' اور وہ غلط فہمیاں امت میں بڑی کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں' حتیٰ کہ ان کی وجہ سے مسلمان بالعموم اپنے دین کے بنیادی تقاضوں تک کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں' اس لیے یہاں ذرا اس پر تفصیل سے بحث کی جاتی ہے۔

اسلام کا مشن۔

یہ بحث تو بعد میں ہوتی رہے گی کہ اسلام امن اور سلامتی کا موید کس معنی میں ہے اور لا اکراہ فی الدین[1] اور لکم دینکم ولی دین[2] کا کیا مطلب ہے اور یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبوت کرنے آئے تھے یا تلاش روزگار میں نکلے تھے۔ ان سب باتوں سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا چاہیے کہ فی الواقع اسلام کا مشن اس دنیا میں ہے کیا؟ کیا وہ جباروں کی سواری کے لیے انسانوں کو سدھانے آیا ہے تاکہ جبار جب دنیا میں خدائی کرنے اٹھے تو اسلام کے پیروؤں کو اپنا اطاعت گزار خادم پائے؟ کیا اس نے دنیا بھر کی حکومتوں اور سلطنتوں کے لیے پرامن رعیت فراہم کرنے کا اجارہ لیا ہے کہ ہر حکومت کو' خواہ اس کا نظام کسی نوعیت کا ہو' اپنی مشینری چلانے کے لیے اسلام کے کارخانہ سے ہر قسم کے ڈھلے ڈھلائے پرزے حاصل ہو جایا کریں؟ کیا اس کا کام بس یہی ہے کہ چند عقائد اور چند اصول اخلاق کی تعلیم دے کر آدمیوں میں اتنی لچک اور اتنی نرمی پیدا کر دے کہ وہ ہر نظام تمدن میں' خواہ وہ کسی قسم کا تمدن ہو' باآسانی کھپ سکیں؟ اگر معاملہ حقیقت میں یہی ہے تو اسلام' بودھ مذہب اور سینٹ پال کی بنائی ہوئی مسیحیت سے کچھ بہت زیادہ مختلف چیز نہیں ہے اور اس کے بعد یہ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے کہ ایسے مذہب کی کتاب میں قاتلوهم جیسا خوف ناک لفظ سرے سے آیا ہی کیوں؟ اسے تو اپنے پیروؤں کو جنگ اور جہاد کا حکم دینے کے بجائے اپنے مخالفین سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ:

"ہم غریبوں کو آخر کیوں مارتے ہو؟ ہم نہ نظام حکومت میں کوئی انقلاب کرنا چاہیں نہ نظام تمدن میں کسی ترمیم و تنسیخ کی دعوت دیں۔ اقتدار کسی

---

[1] البقرہ۔ ۲۵۶ [2] الکافرون۔ ۶

کا بھی ہو' اس کے ماتحت پر امن باشندوں کی حیثیت سے رہنا ہمارا مسلک
اور حکومت وقت کی وفاداری ہمارا دین و ایمان' پھر ہم سے تمہیں
پرخاش کی کیا وجہ؟ رہا ہمارا مذہبی عقیدہ اور ہمارا پوجا پاٹ کا نظام تو اس
سے تمہارا کیا بگڑتا ہے؟ تمہارا کون سا تمدنی ادارہ اور کون سا مفاد ایسا
ہے جس پر ہمارے عقیدے یا ہماری پوجا کی ضرب پڑتی ہو؟"

یہ جواب اگر اچھے معقول پیرایہ میں دیا جاتا اور عملاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو وفادارانہ خدمات بھی انجام دیتے رہتے تو مشرکین مکہ ہمارے انگریز آقاؤں[1] کے مقابلہ میں کچھ ایسے زیادہ نامعقول نہ تھے کہ مسجدوں میں اذان و نماز کی آزادی اور تبلیغی انجمنوں کے قیام کی اجازت نہ دیتے۔

لیکن اگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اسلام خود اپنا ایک نظام زندگی رکھتا ہے جس میں عقائد' اخلاق اور عبادات کے ساتھ انفرادی طرز عمل اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام و قوانین بھی ہیں' اور اگر اسلام کی دعوت اپنے اس پورے نظام کی طرف ہے' اور اگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا اپنا نظام ہی برحق ہے اور اسی میں انسان کی فلاح ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا نظام باطل ہے' تو ان باتوں کے ساتھ یہ قطعی ناگزیر ہے کہ اسلام زمین میں اپنے نظام کو غالب اور دوسرے نظامات کو مغلوب کرنے کا بھی تقاضا کرے۔ ایک نظام زندگی کو حق اور صدق ہونے کی حیثیت سے پیش کرنا اور پھر عملاً اس کی اقامت کی دعوت نہ دینا سراسر ایک مہمل بات ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ دوسرے نظامات کو باطل بھی کہا جائے اور پھر ان کے غلبے کو برداشت بھی کیا جائے۔ مزید برآں یہ بات بداہتہ" محال ہے کہ ایک نظام زندگی کی پیروی کسی دوسرے نظام زندگی کے ماتحت رہتے ہوئے کی جا سکے۔ اس لیے وہ صرف ایک فاطر العقل ہی ہو

---

[1] واضح رہے کہ یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا جب برصغیر پر انگریزوں کا اقتدار تھا۔ مرتب

سکتا ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے پیش کردہ نظام کی پیروی کا مطالبہ بھی کرے اور ساتھ ہی دوسرے نظامات کے اندر پرامن وفادارانہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم بھی دے۔

پس اسلام کا اپنے مخصوص نظام زندگی کی طرف دعوت دینا عین اپنی فطرت میں اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ دوسرے نظامات کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے نظام کی اقامت کا مطالبہ کرے اور اس مقصد کے لیے اپنے پیروؤں کو جدوجہد کی ان تمام صورتوں کے اختیار کرنے کا حکم دے جن سے یہ مقصد حاصل ہوا کرتا ہے اور مدعیان اتباع کے ایمان و عدم ایمان کا نشان امتیاز اسی سوال کو قرار دے کہ آیا وہ اس جدوجہد میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں یا باطل نظامات کے ماتحت جینے پر راضی ہوتے ہیں؟ قرآن اور حدیث دونوں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو صاف نظر آ جائے گا --- بشرطیکہ دل میں کوئی چور نہ ہو --- کہ اسلام کا اصل موقف یہی ہے نہ کہ وہ جو آپ بیان فرما رہے ہیں۔

پھر جب حقیقت یہ ہے اور ہم اسلام کی حقیقت کو جان کر اس پر ایمان لائے ہیں تو یقیناً ہمارے وجود کو ہر غیر اسلامی حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہونا ہی چاہیے۔ کوئی اس کو برداشت کرے یا نہ کرے' غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل ہو سکے یا نہ ہو سکے' بہرحال اگر ہم اپنے ایمان میں صادق ہیں تو ہمارا کام یہی ہے کہ جہاں بھی خدا کا قانون شرعی نافذ نہیں ہے' وہاں ہم اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں وہ ہماری اس جدوجہد کو برداشت بھی کریں۔ اور غیر مسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل بھی ہمارے لیے کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس نظام زندگی پر ہم ایمان لائے ہیں اس کے قیام کی جدوجہد صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل اس صورت میں نہ ہو سکے گا۔ اسلام بے شک امن اور سلامتی کا حامی اور موید ہے' مگر اس کی نگاہ میں حقیقی امن اور سلامتی وہی ہے جو حدود اللہ

کی اقامت سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کسی نے امن اور سلامتی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شیطانی نظامات کے زیر سایہ اطمینان کے ساتھ سارے کاروبار چلتے رہیں اور مسلمان کی نکسیر تک نہ پھوٹے، اس نے اسلام کا نقطہ نظر بالکل نہیں سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ اسلام ایسے امن اور ایسی سلامتی کا ہرگز حامی اور موید نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے اور اسی میں وہ انسان کی سلامتی دیکھتا ہے۔

رہا لا اکراہ فی الدین تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام اپنے عقائد زبردستی کسی سے نہیں منواتا کیونکہ یہ بزور منوانے کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح وہ اپنی عبادات بھی، جن کا لازمی تعلق اس کے عقائد سے ہے، زبردستی کسی پر مسلط نہیں کرتا، کیونکہ ایمان صحیح کے بغیر یہ عبادت محض بے معنی ہے۔ ان دونوں امور میں وہ ہر ایک کو آزادی دینے کے لیے تیار ہے لیکن وہ اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ قوانین تمدن، جن پر اسٹیٹ کا نظام قائم ہوتا ہے، خدا کے سوا کسی اور کے بنائے ہوئے ہوں، اور خدا کی زمین پر اس کے باغی اس کو نافذ کریں اور مسلمان ان کے تابع ہو کر رہیں۔ اس معاملہ میں بہرحال ایک فریق کو دوسرے فریق کے "مذہب" میں مداخلت کرنی ہی پڑے گی۔ اگر مسلمان "مذہب کفر" میں مداخلت نہ کریں گے تو کافر "مذہب اسلام میں مداخلت کر کے رہیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمانوں کی زندگی کے بہت بڑے حصے پر مذہب کفر جاری ہو گا۔ لہذا بجائے اس کے کہ یہ مداخلت کفار کی طرف سے ہو، اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان آگے بڑھ کر نظام زندگی پر قبضہ کریں اور پھر جہاں تک مذہبی عقائد اور عبادات کا تعلق ہے، غیر مسلموں کے ساتھ لا اکراہ فی الدین کے اصول پر عمل کریں۔

رواداری کا غلط تصور اور اس کا جائزہ

اب ہم ان دلائل پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جن کا سہارا جناب معترض نے

لیا ہے اور جن پر اس طرز خیال کے لوگ بالعموم اعتماد کیا کرتے ہیں۔
ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جب تم "فتنے" سے مراد کفر کا غلبہ اور کفار کی بالادستی لیتے ہو، اور جہاد و قتال کی غایت یہ قرار دیتے ہو کہ تمہاری اس تفسیر کے مطابق جس چیز کا نام "فتنہ" ہے وہ مٹ جائے اور اس کی جگہ "اللہ کا دین" قائم ہو، تو اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اسلام دو بالکل متضاد حیثیتیں اختیار کر رہا ہے۔ ایک طرف کہتا ہے لا اکراہ فی الدین دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ دوسری طرف غیر مسلموں کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے کہ وہ اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں، اور ان کے قوانین کا اجرا موقوف کر کے زبردستی ان پر "اللہ کے دین" کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ایک طرف لکم دینکم ولی دین کہہ کر غیر مذاہب کے پیروؤں کو اپنے مذہب و عقائد پر قائم رہنے کی آزادی دیتا ہے۔ دوسری طرف ان سے ٹھیک اسی بات پر لڑائی چھیڑتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے اصولوں کے مطابق معاملات دنیا کا انتظام کیوں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام ہرگز اس تضاد کا حامل نہیں ہو سکتا۔ لہذا تمہاری تفسیر صحیح نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر غیر اسلامی حکومت کا نفس وجود اسلام کی نگاہ میں فتنہ ہوتا اور اس کو مٹانے پر مسلمان مامور ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر کی غیر اسلامی حکومت میں وزارت کا عہدہ طلب کرتے اور اپنی وزارت کے دور میں مصر کے شاہی قوانین کے پابند رہ کر کام کرتے جیسا کہ آیت ماکان لیاخذ اخاہ فی دین الملک[1] سے ظاہر ہے۔
تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر تمہاری اس تفسیر کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسلام دنیا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ چھیڑتا ہے اور اپنے

---

[1] سورہ یوسف - ۷۶

پیروؤں پر جارحانہ جنگ کا ایک ایسا فرض عائد کرتا ہے جس کی وجہ سے مسلمان دنیا میں کہیں امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس تفسیر کی رو سے تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ نہ صرف تمام غیر مسلم حکومتوں کے خلاف بلکہ ان مسلمان حکومتوں کے خلاف بھی علم جہاد بلند کریں جن میں اسلامی حدود و قوانین نافذ نہیں ہیں۔ اور جب یہ ہمارا نظریہ اور یہ ہمارا دینی فریضہ ہو تو کس طرح ممکن ہے کہ غیر مسلم ہم کو اپنا پرامن ہمسایہ سمجھ کر باطمینان ہمارے ساتھ معاملت کر سکیں اور غیر مسلم حکومتیں اپنے حدود عمل میں ہمارے وجود کو برداشت کر سکیں۔

(ا) ان دلائل میں سے پہلی دلیل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کسی شخص کا بجائے خود ایک عقیدے کو ماننا اور اپنی زندگی میں ایک خاص طریقہ کی پیروی کرنا اور چیز ہے' اور اس کا اپنے نظریات کے مطابق اجتماعی زندگی کے لیے ایک نظام بنانا اور اس نظام کو بزور ایک ملک کے باشندوں پر جاری کر دینا[1] بالکل ایک دوسری چیز۔ معترضین ان دونوں چیزوں کو ایک سمجھتے ہیں اور ان کے فرق کو نظرانداز کر کے لا اکراہ فی الدین اور لکم دینکم ولی دین وغیرہ آیات کو ان کے مجموعہ پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان آیات کا تعلق صرف امر اول سے ہے۔ بلاشبہ ہم کسی غیر مسلم کو مجبور نہ کریں گے کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ کر اسلامی عقیدہ قبول کرے یا اپنی مذہبی عبادات کو ترک کر کے نماز روزہ کی پابندی اختیار کر لے لیکن ہم اس کا یہ حق کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اخلاق' تعلیم' تمدن' معاشرت' معیشت' قانون اور سیاست وغیرہ اجتماعی امور کے متعلق اپنے نظریات کو حاکمانہ قوت کے ساتھ بجبر ہم پر مسلط کر دے۔ دوسروں کو ان کے مسلک پر چلنے دینا بے شک رواداری ہے

---

[1] واضح رہے کہ حکومت دراصل جبرو اکراہ (Coercion) ہی کا دوسرا نام ہے۔ جو نظریات' اصول اور قوانین کسی حکومت کی اساس قرار پائیں گے وہ ظاہر ہے کہ ان سب لوگوں پر بزور ہی نافذ کیے جائیں گے جو اس حکومت کے دائرے میں رہتے ہوں۔

مگر یہ کوئی رواداری نہیں ہے کہ اپنے مسلک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے مسلک کا تسلط برداشت کرلیں۔ ملک کی حکومت جس فلسفہ زندگی پر مبنی ہوگی' لامحالہ تمام قوانین اور پوری انتظامی پالیسی اور سارا کاروبار معیشت اسی فلسفے کے نظریات پر چلے گا اور ایسی حکومت کے تحت رہتے ہوئے یہ کسی طرح ممکن ہی نہ ہوگا کہ ہم اپنی زندگی کا نظام اپنے مذہب و مسلک کے اصولوں پر چلا سکیں۔ ہم خواہ راضی ہوں یا نہ ہوں' بہرحال مذہب مخالف کے پیرو اپنے سیاسی غلبے کی بدولت اپنے نظریات کو زبردستی ہماری پوری زندگی میں نافذ کرکے چھوڑیں گے۔ اس معاملہ میں رواداری برتنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ زنا کو حلال سمجھتے ہوں اور لوگوں کو اس کی عام اجازت دیتے ہوں تو ان کی حکوت میں بے بس رعیت کی حیثیت سے رہتے ہوئے خود ہماری سوسائٹی میں زنا پھیلتی چلی جائے اور ہم اسے گوارا کریں۔ اگر وہ سود کو جائز سمجھتے ہوں اور خود ان کی حکومت سودی لین دین کرتی ہو تو ملک کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا کوئی بڑے سے بڑا زاہد و متقی تک سود کے غبار سے نہ بچ سکے اور ہم ایک دیا سلائی اور روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ خرید سکیں جب تک کہ اس کی قیمت میں سے سود کا ایک حصہ بالواسطہ ٹیکسوں کی شکل میں ہماری جیب سے نہ نکل جائے۔ اگر وہ دہریت و الحاد کے نظریات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو ملک کی عمومی تعلیم کا پورا نظام انہی نظریات اور اسی ذہنیت اور اسی ملحدانہ اخلاق پر تعمیر ہو جائے اور باشندگان ملک کے لیے ترقی و خوش حالی کے تمام دروازے اس ایک جہنم کے دروازے کے سوا بند ہو جائیں اور ہمارا کوئی بڑے سے بڑا خدا پرست بھی اپنی نسل کو اس الحاد اور ملحدانہ اخلاق کے اثرات سے نہ بچا سکے۔ اگر وہ خدا کے قوانین کو منسوخ کرکے خود قوانین بنائیں اور ملک کا نظام تمدن اپنے خود ساختہ قوانین پر قائم کریں تو ہماری معاشی و معاشرتی اور تمدنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مجبوراً اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور اس قانون پر چلنے لگے جس پر ہمارا ایمان نہیں ہی۔ کوئی ہمیں بتائے کہ آخر

یہ رواداری کی کون سی قسم ہے؟ لا اکراہ فی الدین کا یہ مطلب آخر کس عقل کی رو سے صحیح ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے دین میں جو اکراہ ہو' اسے ہم برداشت کر لیں؟

ریاست کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کے نظم کو قائم کرنے کے لیے بہرحال ایک قوت قاہرہ (Coercive Power) کی ضرورت ہے جسے "اسٹیٹ" یا ریاست کہتے ہیں--- اس ضرورت کا انکار انارکی پر اعتقاد رکھنے والوں کے سوا آج تک کسی نے نہیں کیا ہے۔ یا پھر اشتراکی تصوف میں ایک ایسے مقام کا تصور کیا گیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کی حیات اجتماعی ریاست کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گی[1] لیکن یہ صرف عالم خیال کی باتیں ہیں جن کی تائید میں کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ عملی زندگی کا تجربہ اور انسانی فطرت کا علم یہی بتاتا ہے کہ تمدن کا قیام ایک قوت قاہرہ کا یقیناً محتاج ہے--- پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قوت' جو اپنے قہر و غلبہ

---

[1] مصنف کا اشارہ اشتراکیت کے اس آخری مرحلہ (Stage) کی طرف ہے جس کے بارے میں اشتراکی مفکرین خصوصیت سے اینجلز اور لینن نے یہ کہا تھا کہ اس میں ریاست کا نظام جبر معدوم ہو جائے گا اور ایک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ قائم ہو جائے گا جو اجتماعی تعاون پر مبنی ہو گا اور اس میں ریاست کا کوئی وجود نہ ہو گا۔ لینن لکھتا ہے:

"صرف اشتراکیت ہی ریاست کو قطعاً" غیر ضروری بنا دیتی ہے' اس لیے کہ اس میں کوئی ایسا طبقہ باقی نہیں رہتا جسے دبایا جائے اور اس کا استیصال کیا جائے۔"

(Lenin The State and Revolution N.Y. 1935 P.75)

اس عمل کو اشتراکیت کی اصطلاح میں ریاست کا مرجھا کر جھڑ جانا کہتے ہیں۔

(The State Withers Away) -- مرتب

سے نظام تمدن کو قائم رکھتی ہے' بجائے خود کسی نہ کسی نظریے اور کسی نہ کسی اجتماعی مسلک کی قائل ہوتی ہے۔ اسی نظریہ و مسلک کے مطابق وہ اپنے لیے ایک لائحہ عمل بناتی ہے۔ اسی لائحہ عمل کو وہ قاہرانہ طاقت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ کرتی ہے۔ اور تمدنی شکل کے بننے اور بگڑنے میں اس قہر کی نوعیت اور اس لائحہ عمل کی اصولی و تفصیلی صورت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ صرف اجتماعی زندگی ہی نہیں' انفرادی زندگی بھی بڑی حد تک طوعاً" و کرھا" اس سانچے میں ڈھل کر ہی رہتی ہے جسے اسٹیٹ اپنے قہر و تسلط سے بنا دیتا ہے۔ جو لوگ کسی ریاست کے دائرے میں رہتے ہوں وہ چاہے اس کے بنیادی نظریے اور اس کے تفصیلی لائحہ عمل پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور کسی طرح اس پر راضی نہ ہوں' لیکن انہیں چاروناچار اپنے عقیدہ مسلک کے ۹۰ فی صدی حصہ سے دست بردار ہو کر ریاست کے عقیدہ و مسلک پر چلنا پڑتا ہے اور باقی ۱۰ فی صدی میں بھی ان کے عقیدہ و مسلک کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہی ہوتی جاتی ہے۔

ریاست کی اس نوعیت کو ملحوظ رکھنے اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ اجتماعی زندگی کے لیے ریاست بہرحال ہے ناگزیر' ایک صاحب فکر و نظر آدمی کے لیے اس حقیقت کا ادراک کچھ مشکل نہیں رہتا کہ جو گروہ آج کل کے محدود معنوں میں محض ایک "مذہب" کا معتقد نہ ہو بلکہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی' یعنی "دین" پر اعتقاد رکھتا ہو' وہ اگر اپنے اعتقاد میں سچا ہے اور اپنے اعتقاد کے خلاف زندگی گزارنا نہیں چاہتا تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ آگے بڑھ کر خود اس قوت قاہرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے جو نظم اجتماعی کی صورت گری کرتی ہے اور اپنے زور سے اس کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو دوسرے اس قوت پر قبضہ کریں گے اور پھر یہ گروہ مجبور ہو گا کہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے کم از کم ۹۰ فیصدی امور میں اپنے "دین" کے بجائے ان کے "دین" پر چلے۔ متمدن زندگی میں یہ "اکراہ" لامحالہ ہم میں سے کسی ایک کو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم نہ کریں گے تو کفار کریں

گے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ کفار اس دائرے میں ہم پر اکراہ کریں اور ہمیں جہنم کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں' یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم ان پر اکراہ کریں اور انہیں اس مقام کے قریب لا کھڑا کریں جہاں اگر وہ چاہیں تو ان کو بآسانی جنت کا راستہ مل سکتا ہے۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمین کا مالک اللہ ہے۔ اس کی زمین پر رہنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اس کو پہنچتا ہے جو اس کا مطیع فرمان ہو اور اس کے قانون فطری و شرعی کا اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ظالم ہے۔ غاصب ہے' باغی ہے۔ اس کی یہ نافرمانی صرف خلاف حق ہی نہیں بلکہ زمین کے انتظام میں فساد اور اہل زمین کے لیے فتنے کی موجب بھی ہے۔ لہٰذا حق تو یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کے قانون فطری و شرعی کی پیروی سے منحرف ہیں' ان کو زمین میں جینے کا حق بھی نہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت اور اس کا انتہائی حلم ہے کہ وہ ان کو نہ صرف جینے کی مہلت دیتا ہے' بلکہ ان کو ان کے کفر' شرک' دہریت اور الحاد پر اس حد تک قائم رہنے کا اختیار بھی دیتا ہے جہاں تک ان کی بغاوت دوسرے بندگان خدا کے لیے فتنہ و فساد کی موجب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ اس بات کو ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ یہ لوگ اس کے قانون شرعی کو منسوخ کر کے اپنے خود ساختہ قوانین پر اس کی زمین کا نظم و نسق چلائیں اور اس کی زمین کو فساد سے بھر دیں۔ اس لیے وہ اپنے قانون شرعی پر ایمان لانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ کفار کو دین حق پر ایمان لانے کے لیے تو مجبور نہ کرو' لیکن غلبہ کفر و کفار کے فتنے کو پوری طاقت سے مٹانے کی کوشش کرو یہاں تک کہ زمین کا انتظام عملاً میرے "دین" پر قائم ہو جائے اور جو میرے دین کو نہیں مانتے وہ "اکابر" نہیں بلکہ

"اصاغر" بن کر رہیں۔ حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون"[1]

حضرت یوسف علیہ السلام اور اقتدار حکومت

۲۔ ان حقائق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد دوسری دلیل کا زور آپ سے

---

[1] (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ سورۃ توبہ۔ آیت ۲۹۔ مصنف محترم اس آیت کی تشریح میں تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

"یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں، بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خودمختاری و بالادستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات متبعین دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت، تابع اور مطیع بن کر رہیں۔

جزیہ بدل ہے اس امان اور اس حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی، نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابع امر بننے پر راضی ہیں۔ "ہاتھ سے جزیہ دینے" کا مفہوم سیدھی طرح مطیعانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں، بلکہ وہ اہل ایمان ہوں جو خلافت الٰہی کا فرض انجام دے رہے ہوں ..... جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یا دوسروں کی نکالی ہوئی غلط راہوں پر چلتے ہیں وہ حد سے حد بس اتنی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود جو غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں، لیکن انہیں اس کا قطعاً" کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرمانروائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہو گی، فساد رونما ہو گا اور اہل ایمان کا فرض ہو گا کہ انہیں اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔" تفہیم القرآن۔ جلد ۲ صفحہ ۱۸۸۔

آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام فی الواقع خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے تو یقیناً ان کی زندگی کا مشن اس ایک مشن کے سوا کچھ اور نہ ہو سکتا تھا جو ہر رسول برحق کا مشن رہا ہے' یعنی خدا کے دین کو ہر دوسرے دین پر غالب کر دیں۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جسے تمام پیغمبروں کی سیرتوں کے مختلف واقعات کی تعبیر و تفسیر میں ہم کو ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر ملحوظ رکھنا ہو گا۔ ورنہ اگر ہم یہ مان لیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی حکومت میں ملک مصر پر خدا کے دین کی جگہ بادشاہ کا دین نافذ کرتے تھے تب تو پھر یوسف صدیق اور سر سکندر و فضل الحق[1] میں کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا۔ افسوس ہے کہ اس معاملے میں لوگ حقیقت سے بہت دور چلے گئے۔ انہوں نے دراصل قصہ یوسف علیہ السلام کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے وقت کے بادشاہ سے جو کہا تھا کہ اجعلنی علٰی خزائن الارض[2] تو یہ ان کی طرف سے محض ملازمت کی ایک درخواست تھی جو دربار شاہی میں قبول ہو گئی اور ان کو وہ منصب مل گیا جو اکبر کے ہاں ٹوڈرمل کا منصب تھا۔ حالانکہ وہاں صورت حال کچھ اور ہی تھی۔

سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے ابتداء دین حق کی اقامت کے لیے وہی راستہ اختیار فرمایا تھا جو انبیاء علیہم السلام اختیار فرماتے رہے ہیں' یعنی پہلے دعوت عام' پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کی تربیت و تنظیم' پھر انہیں ساتھ لے کر اقامت دین کے لیے مجاہدہ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس دعوت کا سلسلہ جیل ہی میں شروع کر دیا تھا جس کے مواعظ میں سے ایک بے نظیر وعظ سورۂ یوسف کے

---

[1] مضمون لکھتے وقت یہ حضرات پنجاب اور بنگال کے وزیر اعظم تھے۔ اب ان کی جگہ کسی غیر اسلامی حکومت کے مسلمان وزیر کو فرض کیا جا سکتا ہے۔

[2] "ملک کے خزانے (تمام ذرائع و وسائل) میرے سپرد کیجئے۔" سورہ یوسف۔ آیت ۵۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۱۱۔۴۱۳۔ مرتب

پانچویں رکوع میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن آگے چل کر ان کے سامنے یکایک ایک ایسا موقع آگیا جس سے وہ اپنے مقصود تک مختصر راستے سے پہنچ سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ عزیز مصر کی بیوی اور اس کی سہیلیوں کے معاملے میں جس پاکیزہ اور مضبوط سیرت کا اظہار ان سے ہوا تھا' اور پھر تعبیر خواب کے معاملے میں جس بصیرت کا ثبوت انہوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے بادشاہ مصر ان کا اس حد تک معتقد ہو چکا تھا کہ اگر وہ اس وقت حکمرانی کے کامل اختیارات اس سے طلب کریں تو وہ بلا تامل پیش کر دے گا۔ اس لیے انہوں نے تحریک عمومی کی راہ سے اپنا مشن پورا کرنے کے بجائے اقتدار حکومت پر فورا قبضہ کر کے دین حق قائم کر دینے کو زیادہ قریب کا راستہ پایا اور بادشاہ سے مطالبہ کر دیا کہ اجعلنی علی خزائن الارض "زمین مصر کے تمام وسائل و ذرائع میرے اختیار میں دے"۔ یہ محض وزیر مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا' جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں' بلکہ یہ اختیار کلی کا مطالبہ تھا اور اس کے نتیجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے[1] اس فرق کے ساتھ کہ اٹلی کا بادشاہ مسولینی کا معتقد نہیں بلکہ محض اس کی پارٹی کے اثر سے مجبور ہے' اور مصر میں بادشاہ خود حضرت یوسف کا مرید ہو چکا تھا۔[2]

حضرت یوسف علیہ السلام کے اقتدار کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے کہ کذالک مکنا لیوسف فی الارض یتبوا منھا حیث یشاء[3] "اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا۔ وہ اس کے جس حصے کو چاہتا' اپنی جگہ بنا سکتا تھا"۔ یعنی پورا ملک اس کے قابو میں تھا۔

---

[1] مضمون لکھتے وقت مسولینی زندہ تھا اور اٹلی کا مختار مطلق بنا ہوا تھا۔

[2] بلکہ مشہور مفسر امام مجاہد تو کہتے ہیں کہ وہ آپ کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کر چکا تھا۔ (ابن جریر)

[3] یوسف۔ ۵۶

پھر اس کی مزید شہادت ہمیں سورۂ مائدہ میں ملتی ہے جہاں حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے فرماتے ہیں: یاقوم اذکروا نعمة الله علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واتکم مالم یوت احدا من العلمین[1] "اے میری قوم کے لوگو! یاد کرو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا کہ تم میں انبیاء پیدا کیے تھے، تم کو حکمران قوم بنایا تھا اور تمہیں وہ کچھ دیا تھا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا تھا، اس کی وجہ سے وہاں آخرکار مکمل انقلاب رونما ہوا، فراعنہ کے بجائے بنی اسرائیل حکمران ہوئے اور ان کو وہ عروج نصیب ہوا جو ان کی ہمسر قوموں میں کسی کو حاصل نہ تھا۔

پھر جو مذہبی اثر حضرت یوسفؑ نے مصر میں چھوڑا اس کی شہادت ہم کو سورۂ مومن میں ملتی ہے۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر فرعون کو خطاب کر کے قبطی قوم کا ایک صاحب ایمان شخص کہتا ہے: ولقد جاءکم یوسف من قبل بالبینت فما زلتم فی شک مما جاءکم به حتی اذا هلک قلتم لن یبعث الله من بعده رسولا[2] "تمہارے پاس یوسفؑ روشن نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر پہلے تو تم اس چیز کی طرف سے شک میں رہے جسے وہ لائے تھے اور جب وہ انتقال فرما گئے تو تم نے کہا کہ اب اللہ کوئی رسول نہ بھیجے گا"۔ یعنی تم نے کہا کہ اس پائے کا شخص اب نہیں آ سکتا۔

حضرت یوسفؑ کے معاملے میں یہ حقیقت جاننے کے بعد کون اس سے یہ استدلال کرنے کی جرات کر سکتا ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت کا پرزہ بننا برحق ہے کیونکہ ایک نبی برحق ایسا کر چکا ہے۔ رہی آیت ماکان لیاخذ اخاہ فی دین الملک[3] جس سے

---

[1] المائدہ۔ ۲۰ [2] المومن۔ ۳۴

[3] یوسف: ۷۶۔ اس کا یہ کام تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا۔

استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعونی قوانین کی پابندی کرتے تھے' تو اگرچہ اس آیت کے مفہوم و معنی میں بہت کچھ کلام کی گنجائش ہے' لیکن اس کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے' اگر اسی کو تسلیم کر لیا جائے' تب بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے' وہ صرف اس قدر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں جس موقع پر یہ معاملہ پیش آیا (اور قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور ہی کا واقعہ تھا کیونکہ آنجناب کے عزیز مصر ہونے کے چند ہی سال بعد وہ مشہور ہفت سالہ قحط شروع ہوا جس میں آپ کے بھائیوں کو غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر آنا پڑا تھا) اس وقت تک مصر میں فوجداری قانون وہی رائج تھا جو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک ملک کے نظام تمدن کو آن واحد میں نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ کام بہرحال تدریج ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی عرب کے نظام تمدن کو بدلتے بدلتے دس سال لگ گئے تھے۔ وراثت کا قانون ۳ھ یا ۴ھ میں بدلا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین ہجرت کے بعد پانچ چھ سال میں مکمل طور پر نافذ کیے گئے۔ فوجداری قوانین کی تکمیل میں پورے آٹھ سال لگ گئے۔ ملک کا معاشی نظام بتدریج ۹ سال میں بدلا گیا۔ شراب کا قطعی انسداد ۸ھ میں ہوا اور سود کی کلی ممانعت ۹ھ میں کی گئی۔ اسی طرح اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ملک کے قوانین بدلنے میں تدریج سے کام لیا ہو اور ایک خاص وقت تک ان کے زمانہ حکومت میں سابق قوانین جاری رہے ہوں تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ایک پیغمبر خدا کے سوا دوسروں کے جاہلی قوانین کو جائز سمجھ کر ان کی پابندی کرتا تھا۔

(۳) رہی تیسری دلیل تو اسے دراصل دلیل کے بجائے عذر کہنا چاہیے۔ اس عذر کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں صرف ایک حدیث سنانے پر اکتفا کرتے ہیں جسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والجهاد ماض مذ بعثنی الی اللّٰہ ان یقاتل اخر ھذہ الامۃ الدجال لا یبطلہ جور جائر ولا عدل عادل۔

"اور جہاد میری بعثت کے وقت سے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب کہ اس امت کا آخری گروہ دجال سے جنگ کرے گا۔ نہ کسی ظالم کا ظلم اسے باطل کر سکتا ہے اور نہ کسی عادل کا عدل"۔

یعنی جہاد کو نہ اس عذر کی بنا پر بند کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت بڑے جبابرہ ہم پر مسلط ہیں۔ نہ اس بات کو جہاد نہ کرنے کے لیے بہانہ بنایا جا سکتا ہے کہ حکومت اگرچہ کفار کی ہے مگر ہم کو امن نصیب ہے اور ہمارے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ اور نہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ اگر ان کے اپنے ملک میں عدل کا دور دورہ ہو تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں اور باہر کی دنیا میں جو ظلم و فساد برپا ہو، اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔

---

(۴)

دین و سیاست کی تفریق کا باطل نظریہ

اور

قصہ یوسف علیہ السلام سے غلط استدلال

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے[1] ہیں:

"سورۂ یوسف سے متعلق آپ کے فہم قرآنی سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو تمکن فی الارض عطا فرمایا گیا اور وہ دائرۂ حکومت میں ایک ممتاز حیثیت سے شریک ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ رسول تھے، اس لیے فریضہ رسالت کی سرانجام دہی بھی آپ کے لیے ضروری تھی۔ دربار فرعون کے مرد مومن نے اپنی تقریر میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی نبوت پر قوم فرعون ایمان نہیں لائی تھی اور یہ بھی کہ آپ اپنی وفات تک ڈھیل دیتے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کو پیش کیا۔ لیکن فرعون اور اس کی قوم اس پر ایمان

---

[1] یہ حصہ ترجمان القرآن بابت ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق اپریل ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مرتب

نہ لائی۔ اس کے باوجود حضرت یوسفؑ ان کی حکومت میں شریک کار رہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول ایک غیر خدائی نظام حکومت کا شریک کار کس طرح رہا، در آں حالیکہ وہ اس قوم کے سامنے اپنی نبوت بھی پیش کر چکے تھے اور اس قوم نے اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایسے منکرین دعوت اسلامی کے خلاف یا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو جہاد کرنا چاہیے تھا یا بر سبیل تنزل وہاں سے ہجرت لازم تھی۔ لیکن آپ نے نہ تو ہجرت ہی فرمائی اور نہ ہی ان کے خلاف جہاد کیا، بلکہ ان کے خلاف تبریٰ و بیزاری کا اعلان بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا آپ اس گتھی کو سلجھائیں گے؟"

بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گزرا ہے، قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے۔[1] اس لیے قرآن کے اشارات کی تفصیل معلوم کرنا مشکل ہے۔ تاہم قرآن مجید نے اپنے مجمل اشارات سے اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہنے دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظام حکومت کے شریک کار کی نہ تھی بلکہ مختار کل کی تھی، اور انہوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی ہی اس شرط کے ساتھ تھی کہ کل اختیارات ان کے ہاتھ میں ہوں۔ اس آیت کو بغور پڑھیئے:

قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم وکذالک مکنا لیوسف فی الارض یتبوا منھا حیث یشآء۔[2]

---

[1] بائیبل اور تلمود بھی اس پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتیں، اور نہ مصر کی قدیم تاریخ اور اثریات سے اس معاملے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

[2] یوسف ۵۶ - ۵۵

> یوسف علیہ السلام نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر حاکم بنا دے' یقیناً میں حفاظت کرنے والا ہوں اور علم رکھتا ہوں اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں اقتدار عطا کیا۔ وہ وہاں جس جگہ بھی چاہتا' اپنی جگہ بنا سکتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ مطالبہ کلی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلی اختیارات ہی۔ خزائن الارض کا لفظ دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ جگہ شاید فنانس منسٹر یا ریونیو ممبر کی تھی' حالانکہ دراصل اس سے مراد ملک کے جملہ وسائل (Resources) ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے ہاتھ میں دیے جائیں اور اس کے نتیجے میں جو اختیارات انہیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمین مصر ان کی تھی۔ یتبوا منہا حیث یشآء کو بھی لوگوں نے بہت ہی محدود معنوں میں لے لیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا مفہوم بس اتنا ہے کہ حضرت یوسفؑ ہر جگہ مکان بنا لینے یا قیام کرنے کے مجاز تھے۔ حالانکہ درحقیقت اس فقرے سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اس سرزمین پر حضرت یوسفؑ کا اقتدار ویسا ہی تھا جیسا ایک زمین کے مالک کو اپنی زمین پر حاصل ہوتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اقتدار حاصل ہوا' اس کے ذریعے سے انہوں نے ملک کے نظام تہذیب و تمدن و اخلاق و سیاست کو اصول اسلام کے مطابق تبدیل کرنے کی کیا کوشش کی اور اس میں کس قدر کامیابی ہوئی' تو اس کے متعلق کوئی تفصیل ہمیں تاریخ سے نہیں ملتی۔ البتہ سورۂ مائدہ کے ایک اشارے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اقتدار محض ایک فرد واحد کا عارضی اقتدار نہ تھا بلکہ آپ کے بعد ایک مدت دراز تک آپ ہی کے جانشین' جو یقیناً مسلمان ہی تھے' مصر پر حکمران رہے۔ انہیں وہ عظمت و شوکت حاصل ہوئی جو اس دور میں دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ

تھی۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

واذ قال موسیٰ لقومہ یقوم اذکروا نعمۃ اللّٰہ علیکم اذ جعل فیکم انبیآء وجعلکم ملوکا واٰتکم مالم یوت احدا من العلمین[1]

یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم کے لوگو اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء پیدا کیے اور تم کو فرمانروا بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس اسلامی غلبہ و تسلط کا لازمی اثر ملک کی پوری زندگی پر مرتب ہوا ہو گا۔

سورۂ مومن کی جس آیت سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قبطی قوم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، دراصل اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ میں ایسا سمجھا ہوں کہ وہاں ہندوستان کی سی صورت پیش آئی تھی کہ ملک کی آبادی کے معتدبہ حصے نے اسلام قبول کیا اور بڑی اکثریت اپنے شرک پر قائم رہی۔[1] پھر جس حصے نے اسلام قبول کیا وہی ایک مدت تک برسر اقتدار رہا، مگر رفتہ رفتہ اخلاقی و اعتقادی انحطاط نے اس کو غلامی اور گمراہی کی پستیوں میں گرا دیا حتیٰ کہ غلو اور اشخاص پرستی کے فتنے میں پڑ کر عملاً اس میں اور دوسرے مشرکین میں کوئی خاص فرق باقی نہ رہا۔ اسی چیز کی طرف مومن آل فرعون نے اشارہ کیا ہے:

ولقد جآء کم یوسف من قبل بالبینت فما زلتم فی شک مما جآء کم

---

[1] المائدہ۔ ۲۰

به حتی اذا اهلک قلتم لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا [۲]

اس سے پہلے یوسف ؑ تم لوگوں کے پاس صریح نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر تم اس چیز میں برابر شک کرتے رہے جسے وہ لائے تھے، پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا کہ اب ان کے بعد اللہ کسی رسول کو ہرگز نہ بھیجے گا۔

خط کشیدہ دو فقروں میں سے پہلا فقرہ بتاتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کی زندگی میں ملک کی بیشتر آبادی آپ کی نبوت کے متعلق شک میں رہی، جیسا کہ اکثر انبیا کے ساتھ ہوا ہے۔ اور دوسرے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب کے بعد جو لوگ آپ کے معتقد ہوئے وہ آپ کی شخصیت کے گرویدہ ہو کر غلو میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب کوئی رسول نہیں آ سکتا اور اسی بنا پر انہوں نے بعد کے آنے والے کو ماننے سے انکار کر دیا، جیسا کہ آگے چل کر یہودیوں اور عیسائیوں نے کیا، درآں حالیکہ حضرت یوسف ؑ یا حضرت موسیٰ ؑ یا حضرت عیسیٰ ؑ میں سے کسی کے بعد بھی اللہ کی طرف سے ختم نبوت کا اعلان نہ ہوا تھا۔

بہرحال اس آیت کے یہ معنی نہیں نکالے جا سکتے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ملک میں کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا بلکہ دوسرے اشارات کی مدد سے قیاس یہی ہوتا ہے کہ ملک میں اہل ایمان کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے بنی اسرائیل کے ساتھ مل کر ایک مدت تک اسلامی نظام حکومت کو قائم رکھا اور بعد میں بتدریج مائل انحطاط (Degenerate) ہوتا چلا گیا۔

---

[۱] بائیبل کا بیان ہے کہ مصر سے حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ جو لوگ نکلے تھے ان میں چھ لاکھ تو صرف مردان جنگی تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد ۲۰ لاکھ سے کم نہ ہو گی اور یہ مصر کی آبادی کا کم از کم ۱۰ فی صدی حصہ تھی۔ [۲] المومن - ۳۴

(۵)

تفریق دین و سیاست کا دفاع اور اس کا جائزہ

"گزشتہ مضمون "سورۂ یوسف کے متعلق چند سوالات" کی اشاعت کے کچھ مدت بعد ایک مشہور بزرگ نے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے اور جو خان بہادر کا خطاب رکھتے تھے' یو۔پی میں کلکٹر اور ہندوستان کی ایک ریاست میں دیوان رہ چکے تھے' اس پر ایک مفصل تنقید لکھی۔ چونکہ مولانا مودودی صاحب کے جواب کو سمجھنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ صاحب موصوف کی تنقید ناظرین کے سامنے ہو' اس لیے ہم پہلے اس کے متعلقہ حصے یہاں نقل کرتے ہیں' پھر مصنف کا جواب نقل کریں گے"۔[1]

مستفسر نے جو بات دریافت کی تھی اور جو بات دراصل بحث طلب ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ آیا یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن اور شریک کار بنے ہیں یا نہیں؟ اور اگر بنے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایسا کرنا اسلامی نقطہ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظام حکومت کے شریک کار کی نہ تھی"۔ اور تعجب ہے کہ اپنی اس رائے کی تائید میں کلام پاک کی وہی آیت قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض پیش کرتے ہیں جو دراصل اس کے ضد کو ثابت کرتی ہے۔

---

[1] یہ بحث ترجمان القرآن بابت محرم و صفر ۱۳۶۴ھ مطابق جنوری' فروری ۱۹۴۵ء سے ماخوذ ہے۔ مرتب

آیت مذکور کا لفظی ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"یوسفؑ نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر، میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس میں جہاں چاہتا"۔

اب دیکھیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعون مصر سے خواہش کرتے ہیں کہ تو مجھ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کر دے۔ فرعون آپ کا مطالبہ منظور کرتا ہے اور آپ فرعون کے محکمہ مال کے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آپ فرعون کے نظام حکومت کے ایک رکن یا شریک کار بن جاتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب اس بدیہی نتیجے سے بچنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جب کہ وہ فرماتے ہیں کہ "مطالبہ کلی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلی اختیارات"۔

---- اول تو کلی اختیارات کا لفظ کلام پاک میں ہے نہیں۔ یہ لفظ مولانا اپنی طرف سے کلام پاک کی عبارت پر بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ کلام پاک مولانا کے ذاتی نظریوں کا تابع ہو جائے نہ یہ کہ مولانا اپنے ذاتی نظریوں کی اصلاح مفہوم قرآنی کے مطابق کر لیں۔ اسی جیسی ذہنیت کے متعلق غالباً اقبال مرحوم نے کہا تھا: "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں"۔ لیکن اس کلی کے لفظ کے ناجائز اضافے سے بھی مولانا کے اجتہاد یا نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کلی اختیارات مال کا مطالبہ کیا تھا اور کلی اختیارات ہی ملے تھے، لیکن وہ اختیارات فرعون مصری سے تو مانگے گئے تھے اور فرعون مصری نے تو وہ اختیارات عطا کیے تھے۔ اس لیے باوجود ان کلی اختیارات کے حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس وقت کے نظام حکومت میں ایک رکن یا ایک شریک کار سے زائد کی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح مولانا مودودی صاحب کا یہ فرمانا کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کا

مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دے دیئے جائیں اور اس کے نتیجے میں جو اختیارات ان کو ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری زمین مصران کی تھی"۔ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ یہ بات بھی لیا جاوے کہ یوسف علیہ السلام نے مال کے جملہ اختیارات کا مطالبہ کیا تھا اور مال کے جملہ اختیارات آپ کو تفویض ہو گئے تھے' تاہم سلطنت میں مال کے علاوہ بہت سے دیگر محکمے ہوتے ہیں' مثلاً پولیس' فوج' عدالت۔ ان میں سے نہ کسی کا مطالبہ یوسف علیہ السلام کی طرف سے کیا گیا نہ یہ محکمے آپ کے سپرد کیے گئے۔ تو پھر مولانا مودودی کا یہ کہنا کہ "جو اختیارات انہیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری زمین مصران کی تھی"۔ بالکل بے بنیاد ہے۔

اس لیے یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر کے خزائن پر متصرف ہونے کے بعد بھی سلطنت کے ایک رکن یا شریک کار کی رہتی ہے جب تک کہ کسی ذریعے سے یہ ثابت نہ ہو کہ فرعون مصر اپنی سلطنت اور حکومت سے دست بردار ہو گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کی جگہ مصر کے بادشاہ اور ملک بن گئے تھے۔ سو یہ تاریخ سے ثابت ہے' نہ کلام پاک سے' بلکہ کلام پاک سے بصراحت اس کی تردید ہوتی ہے۔ آیت زیر بحث سے عین ماقبل یہ آیات ہیں:

وقال الملک ائتونی به استخلصه لنفسی فلما کلمه قال انک الیوم لدینا مکین امین[1]

انہیں میرے پاس لے آؤ کہ میں انہیں اپنے لیے چن لوں۔ پھر جب اس سے (یوسف علیہ السلام سے) بات کی' کہا بے شک آپ ہمارے یہاں معزز معتمد ہیں۔

---

[1] یوسف ۔ ۵۴

ان ہر دو آیات سے بالکل واضح ہے کہ فرعون مصر نے یوسف علیہ السلام کو اپنی سلطنت کا معزز اور معتمد رکن اور اپنا مشیر خاص بنایا۔ ان آیات میں اس بات کا شائبہ بھی نہیں کہ فرعون مصر اپنی سلطنت یا اپنے اختیارات سے دست بردار ہو گیا تھا۔ نیز ایک مابعد کی آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خزائن مصر پر متصرف ہونے کے عرصہ بعد تک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک پر جاری تھا۔ کیونکہ جب برادران یوسف دوسری مرتبہ غلے کی بھرتی کرنے آئے ہیں اور اپنے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین کو بھی لائے اور حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھا اور بنیامین پر ظاہر بھی کر دیا کہ وہ ان کا حقیقی بھائی ہے مگر اپنے دوسرے بھائیوں پر اس امر کو ظاہر نہیں کیا اور چونکہ حضرت یوسفؑ بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس لئے دوسرے بھائیوں پر اس امر کے ظاہر کیے بغیر کہ بنیامین ان کا بھائی ہے اس کی یہ تدبیر کی کہ جب برادران یوسف کے واسطے ان کا اسباب تیار کیا گیا تو بنیامین کے اسباب میں ایک پانی پینے کا پیالہ رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو موذن یا پکارنے والے نے پکار کر کہا کہ اے قافلے والو' تم البتہ چور ہو۔ برادران یوسفؑ نے اس سے انکار کیا تو پکارنے والے نے کہا کہ کیا سزا ہے اس کی اگر تم جھوٹے نکلے؟ برادران یوسفؑ نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں ہاتھ آوے وہی اس کے بدلے میں جاوے۔ ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔ اس کے بعد تلاشی لی گئی اور پیالہ بنیامین کے اسباب میں سے برآمد ہوا۔ چنانچہ بنیامین پیالے کے بدلے میں روک لیے گئے۔ اس موقعہ پر ارشاد خداوندی ہے: **ما كان ليأخذ اخاه فی دين الملك الا ان يشاء الله**۔[1] جس کا لفظی ترجمہ ہے:

---

[1] یوسف - ۷۶

"وہ (یعنی یوسف") ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ"۔

خط کشیدہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک ملک مصر میں جاری تھا اور اس قانون کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو چوری کے الزام میں اپنے بھائیوں سے لے نہیں سکتے تھے' مگر خداوند عالم نے خود ان کے بھائیوں کے منہ سے کہلوا دیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے چوری کا مال ہاتھ آوے' وہی اس کے بدلے میں جاوے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کی جو تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے کی ہے وہ یہ ہے کہ "یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ جس کے پاس سے مال نکلے اس کو غلام بنا لو۔ اس پر پکڑے گئے ورنہ حکومت مصر کا قانون یہ نہ تھا۔ اگر ایسی تدبیر نہ کی جاتی کہ وہ اپنے اقرار میں بندھ جاویں تو ملکی قانون کے مطابق کوئی صورت بنیامین کو روک لینے کی نہ تھی"۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ کا کام نہیں کیا یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا۔ برخلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جب کہ آپ سجن یا جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے ساتھی قیدیوں سے فرماتے ہیں:

یا صاحبی السجن ارباب متفرقون خیر ام اللّٰہ الواحد القھار ما تعبدون من دون الا اسماء سمیتموھا انتم واباء کم ما انزل اللّٰہ بھا من سلطن ان الحکم الا اللّٰہ امر الا تعبدوا الا ایاہ[1]

---

[1] یوسف : ۴۰ ـ ۳۹

اسی طرح وزارت کے عہدے پر متمکن ہونے کے بعد بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی تبلیغ کا کام ضرور جاری رکھا ہو گا۔ البتہ جو بات ان آیات سے بلاشک و شبہ ثابت ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکوت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسفؑ کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا اور یوسف علیہ السلام کے اس عمل پر بجائے اس کے کہ خداوند عالم کی طرف سے کوئی سرزنش کی جاوے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کو ایک طرح سراہا جاتا ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام کے اس تمکن فی الارض کو انعام خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

" وکذالک مکنا لیوسف فی الارض یتبوا منھا حیث یشاء "

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان تو مسلمان انبیاء تک کے لیے غیر اسلامی نظام حکومت کا رکن بننا جائز ہے اور جائز ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں بطور فرض کفایہ کے واجب ہے' کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خود خواہش کر کے مصر کے خزائن پر متصرف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا کرنے کو یوسف علیہ السلام اپنے لیے جائز ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر واجب خیال فرماتے تھے۔ ورنہ وہ فرعون سے ایسی خواہش کبھی نہ فرماتے اور نہ ایسی خواہش کرتے وقت وہ اپنے حفیظ و علیم ہونے کا اظہار کرتے۔ کیونکہ اگر آپ کے نزدیک ملک مصر کا وزیر بننا آپ پر لازم اور واجب نہیں تھا تو آپ کا اپنے آپ کو حفیظ اور علیم بتانا بے جا مدح سرائی اور خود ستائی میں داخل ہوتا ہے۔ (اس کے بعد موصوف نے اپنے بیان کی تائید میں چند حوالے پیش کیے ہیں اور کچھ عقلی دلائل بھی فراہم کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ نیز ہجرت حبشہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ چونکہ ان کے دلائل کا جوہر اوپر آگیا ہے اس لیے ہم بخوف طوالت باقی حصہ حذف کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔)

جواب

ہم جناب خان بہادر صاحب کے بہت شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس مسئلے کو چھیڑ کر پھر ایک مرتبہ ہمیں اپنا نقطہ نظر صاف صاف پیش کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا۔ ہم اس بحث میں اپنا وقت صرف اس امید پر صرف کر رہے ہیں کہ بہت سے طالبین حق کو اس سلسلے میں اکثر گمراہ کن دلائل کا جواب مل جائے گا جو اطاعت غیراللہ یا بالفاظ دیگر اسلام بغیراللہ کو جائز قرار دینے اور نظام کفر کی بندگی کو مباح بلکہ فرض کفایہ ٹھیرانے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں۔

قصہ یوسف علیہ السلام کے زیر نظر پہلو پر ہم اس سے پہلے دو مرتبہ بحث کر چکے ہیں۔ پہلی بحث زیادہ مفصل و مدلل تھی اور دوسری مجمل و مختصر۔ لیکن خان بہادر صاحب نے نہ معلوم کیوں پہلی کو چھوڑ کر دوسری کو مدار گفتگو بنا لیا۔ حالانکہ جو اعتراضات انہوں نے اپنے مضمون میں درج فرمائے ہیں' ان میں سے اکثر کا' بلکہ شاید سب ہی کا جواب ہماری پہلی بحث میں انہیں مل جاتا۔[1] بہرحال یہ عدم التفات خواہ کسی وجہ سے ہو' ہمارے لیے اس میں خیر ہی کا پہلو نکل آیا کہ جن باتوں کو بار بار چھیڑ کر ہمارے لیے واضح کرنا مشکل تھا انہیں دوسروں کے چھیڑنے پر بیان کرنے کا ہمیں موقع مل گیا۔

کیا اسلام میں تناقض ہے؟

دنیا میں ایک معقول آدمی سے جن چیزوں کی توقع کی جاتی ہے غالباً ان میں سب سے پہلی چیز یہی ہوتی ہے کہ اس کی باتوں میں تناقض نہ ہو۔ ایک معمولی عقل کا گنوار آدمی بھی جب کسی شخص کو ایسی باتیں کرتے دیکھتا ہے جو

---

[1] اشارہ اس مضمون کی طرف ہے جو اوپر کے سیکشن میں "اسلام اور اقتدار" کے عنوان کے تحت دیا گیا ہے۔

ایک دوسرے کے خلاف پڑتی ہوں تو فوراً ٹوک دیتا ہے۔ کیوں کہ اس کی نہایت موٹی عقل بھی متناقض باتوں کی غیر معقولیت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جن باتوں کی توقع کسی گھٹیا سے گھٹیا مگر ذی عقل انسان سے نہیں کی جا سکتی ان کی توقع اس خدا سے کی جاتی ہے جو خود عقل کا خالق اور تمام حکمت کا مالک ہے اور اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ خدا سے اس انتہائی نامعقولیت کی توقع رکھنے والے، بلکہ اس کا مطالبہ کرنے والے کوئی جاہل، کودن لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ ذی علم لوگ ہیں جو دنیا بھر کو علم و عقل کے درس دیتے ہیں اور وہ فاضل اصحاب ہیں جن کی عقلیں اپنی دنیا کے معاملات چلانے میں خوب لڑتی ہیں۔ یہ ہوش مند حضرات اپنے خدا سے چاہتے ہیں، اور یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ اس کی باتوں میں تناقض ہو۔ یعنی وہ یہ بھی کہے کہ میں بادشاہ زمین و آسمان ہوں اور پھر اپنی زمین کے کسی گوشے پر کسی اور کی بادشاہی تسلیم بھی کرے۔ وہ یہ بھی کہے کہ لوگو تم سب میرے احکام کی اطاعت کرو، پھر لوگوں کو یہ اجازت بھی دے، بلکہ اس کو فرض تک قرار دے دے کہ ان حاکموں کی اطاعت بجا لائیں جو اس کے حکم کی سند کے بغیر، اور اکثر حالات میں اس کے حکم کے خلاف احکام دیتے ہیں۔ وہ انسانوں کے لیے خود ایک قانون بھی بنائے اور یہ اعلان کرے کہ میرا یہی قانون ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے، باطل ہے، اور پھر اس کے ساتھ دوسرے قوانین کے نفاذ کو بھی جائز رکھے اور انہی انسانوں کو جن کے لیے اس نے قانون بنایا ہے یہ "حق" بھی دے کہ چاہیں خود اپنے لیے قانون بنائیں اور چاہیں دوسروں کے قوانین کی پیروی کرتے رہیں۔ وہ اپنے پیغمبروں کو خاص اسی غرض کے لیے مبعوث بھی کرے کہ زمین کے باشندوں کو اس کا دین قبول کرنے کی دعوت دیں اور پھر انہی پیغمبروں کو یا ان میں سے کسی کو اس بات کی اجازت بھی دے (بلکہ خان بہادر صاحب کے بقول اس خدمت پر سراہے بھی) کہ اس دین کے سوا کسی اور دین کے نظام میں کارکن و

خدمت گزار بن جائیں اور اسے کامیابی کے ساتھ چلانے میں اپنی قابلیتیں صرف کر دیں۔ وہ ساری دنیا کے باشندوں میں سے چھانٹ کر ایک امت خاص اس مقصد کے لیے بنائے کہ اس معروف کا حکم دے جسے اس نے معروف قرار دیا ہے اور اس منکر کو مٹائے جسے اس نے منکر ٹھہرایا ہے' اور پھر اسی امت کے لیے اس بات کو حلال بلکہ اس کے بعض "برگزیدہ" افراد کے لیے فرض کفایہ ٹھہرا دے کہ ان منکرات کو قائم کرنے اور رواج دینے میں حصہ لیں جنھیں اس کے باغی معروف ٹھہرا چکے ہیں اور ان معروفات کو مٹانے اور دبانے میں آلہ کار بنیں جو اس کے نافرمانوں کی نگاہ میں منکر قرار پا چکے ہیں۔

یہ ایسی صریح متناقض باتیں ہیں جن کے تناقض کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے لیکن عجیب بات ہے کہ جو لوگ تفسیریں لکھنے اور فقہ و معقولات کا درس دینے کی قابلیت رکھتے ہیں' اور جو اتنی عقل رکھتے ہیں کہ کلکٹری اور دیوانی جیسے بڑے بڑے مناصب کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں' انھیں یا تو ان باتوں میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا' یا پھر خداوند عالم کے متعلق ان کی رائے اتنی بری ہے کہ وہ اس سے ان بے عقلیوں اور نادانیوں کی توقع رکھتے ہیں جنھیں ایک جاہل گنوار بھی اپنی چوپال کے کسی رفیق میں پا کر صبر نہیں کر سکتا۔

خان بہادر صاحب اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> ایک بعد کی آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے خزائن مصر پر متصرف ہونے کے بعد تک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک میں جاری تھا۔ ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ (ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ) یہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک مصر میں جاری تھا"۔

دین کا مفہوم۔

ان الفاظ کو تحریر کرتے وقت صاحب موصوف جس بات کو ثابت کرنے کی دھن میں لگے ہوئے تھے اس نے شاید انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ کچھ دیر ٹھہر کر اس صریح تناقض پر غور کر لیتے جو ان کی مزعومہ تفسیر کے لحاظ سے یہاں قرآن کے بیان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ براہ کرم اب وہ ہمارے ہی توجہ دلانے سے غور فرمائیں۔ یہاں خود ان کی اپنی نقل کردہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مصر کے ملکی قانون کو جو فرعون مصر کی حاکمیت کی بنیاد پر تھا "دین الملک" (بادشاہ کا دین) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین صرف اس پوجا پاٹ ہی کا نام نہیں ہے جو مندروں اور معبدوں میں کی جاتی ہے' بلکہ اس قانون کا نام بھی ہے جس کے مطابق پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے' جس کے تحت عدالت معاملات دیوانی و فوجداری کا فیصلہ کرتی ہے' جس کی پیروی میں ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے اور جس پر تمدن کا سارا نظام قائم ہوتا ہے۔ زندگی کے یہ سارے شعبے بحیثیت مجموعی جس طریقے پر چلتے ہیں' اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "دین" ہے اور چونکہ ملک مصر میں وہ طریقہ فرعون کی مشیت سے ماخوذ اور اس کے اقتدار اعلیٰ پر مبنی تھا' اس لیے قرآن اس کو "دین الملک" کہہ رہا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ "دین اللہ" بھی صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے جو مسجدوں اور نماز روزے تک محدود ہو' بلکہ اس سے مراد بھی اس پوری شریعت کی پابندی ہے جو اللہ کی رضا سے ماخوذ اور اس کی حاکمیت پر مبنی ہو اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کی حیثیت سے کس کام کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے؟ "دین اللہ" کی دعوت دینے کے لیے یا "دین الملک" کو فروغ دینے کے لیے؟ اگر خان بہادر صاحب کی تاویل اور ان حبرات کی تفسیر' جن کے بڑے بڑے نام لے کر خان بہادر صاحب ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں' مان لی جائے تو

اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اپنے نبی کو اس بات پر مامور فرمایا کہ اس کی مخلوق کو، اور خصوصاً اس مخلوق کو جو مصر میں رہتی تھی، "دین اللہ" اختیار کرنے کی دعوت دے، اور دوسری طرف وہی نبی خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت و نگرانی میں "دین الملک" کے قیام و استحکام کی خدمت انجام دینے لگا۔ اور لطف یہ ہے کہ اللہ میاں اس صریح متناقض طرز عمل کا تناقض تو کیا محسوس فرماتے، الٹا اس نبی کے اس فعل کو، خان بہادر صاحب کے اپنے الفاظ میں، سراہنے لگے اور نظام کفر میں اپنے نبی کے بعہدۂ وزارت فائز ہو جانے کو "انعام خداوندی" سے تعبیر فرمانے لگے۔ گویا کہ اللہ میاں کا حال بھی معاذ اللہ ہمارے زمانے کے ان دین دار بزرگوں کا سا ہے جو خود تو پیشانی پر سیاہ گٹا لیے ہوئے مصلے پر سجدہ گردانی فرما رہے ہوتے ہیں مگر صاحب زادے جب ایم۔اے پاس کر کے نیم انگریز بنے ہوئے آبکاری کی انسپکٹری پر فائز ہو جاتے ہیں تو وہی دین مجسم بزرگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کے خاندان کو اپنی نعمت سے نواز دیا۔

آگے چل کر خان بہادر صاحب پھر فرماتے ہیں:

"اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ حق کا کام نہیں کیا، یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا۔ برخلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جب کہ آپ جیل میں تھے، اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی...... البتہ جو بات آیات سے بلا شک و شبہ ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا"۔

یہاں پھر کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے جس کی طرف صاحب موصوف نے اپنے مدعا کی دھن میں توجہ نہیں فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے آخر یہ کس قسم کی وحدانیت کی تبلیغ فرمائی تھی؟ اگر اس "وحدانیت" کے معنی یہ تھے کہ وہ پوجا جو معبد میں کی جاتی ہے اور وہ اطاعت قانون جس پر سوسائٹی کا نظم اور ملک کا انتظام قائم ہوتا ہے' ایک ہی خدا کے لیے ہو' یعنی پوری زندگی دین اللہ کی تابع ہو جائے' تو خان بہادر صاحب کی تاویل کے لحاظ سے حضرت یوسفؑ نے نوکری کر کے خود اپنی اس تبلیغ حق کے خلاف عمل کیا۔ اور اگر یہ تبلیغ اس بات کی تھی کہ معبد میں "دین اللہ" جاری ہو اور ملک اور سوسائٹی کا سارا انتظام "دین الملک" پر بدستور چلتا رہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ وحدانیت کی نہیں بلکہ ثنویت اور دو عملی کی تبلیغ تھی۔

پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی رسالت کا اعلان آخر کس معنی میں کیا تھا؟ اگر انہوں نے بادشاہ سمیت تمام لوگوں سے کہا تھا کہ میں مالک زمین و آسمان کا نمائندہ ہوں لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو' جیسا کہ تمام انبیاء کہتے رہے ہیں کہ فاتقوا اللہ واطیعون[1] تو اس اعلان کے ساتھ ان کا غیر مسلم بادشاہ کی آقائی تسلیم کرنا اور اس کی اطاعت میں اسلامی نظام کے بجائے غیر اسلامی نظام کی خدمت انجام دینا کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ اور اگر انہوں نے یہ کہا تھا کہ لوگو! میں ہوں تو بادشاہ ارض و سما کا نمائندہ' مگر میرا مسلک یہ ہے کہ بادشاہ مصر کی اطاعت کروں اور تم کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی اطاعت کرو' تو صرف یہی نہیں کہ یہ ایک صریح متناقض بات کا اعلان تھا جس کا استقبال سنجیدگی کے بجائے قہقہے سے ہونا چاہیے تھا اور ایسا اعلان کرنے والے کو ایوان وزارت کے بجائے

---

[1] الشعراء : ۱۰۸

پاگل خانے میں جگہ ملنی چاہیے تھی' بلکہ آج بھی ایسی کتاب ہرگز ایمان لائے جانے کے قابل نہیں رہتی جو ایک طرف تو خود ہی یہ قاعدہ کلیہ بیان کرتی ہے کہ خدا نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کے تحت وہ مطاع بن کر رہے"۔ (وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللّٰہ)[1] اور دوسری طرف وہی کتاب ایک ایسے شخص کو رسول بھی قرار دیتی ہے جو مطاع بن کر نہیں بلکہ غیراللہ کا مطیع بن کر رہا اور دوسرے بندگان خدا کو بھی اذن خداوندی کے تحت اپنا نہیں بلکہ اسی غیر خدا کا مطیع بناتا رہا۔ قرآن اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں خود یہ معیار پیش کرتا ہے کہ لو کان من عند غیر اللّٰہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً[2] یعنی اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف بیان پاتے' لیکن اگر ہم خان بہادر صاحب اور ان کے طرز خیال کے لوگوں کی تاویلات تسلیم کر لیں تو قرآن کے بیانات میں یہاں ایسے کھلے ہوئے تناقضات پائے جائیں گے جن سے قرآن آپ اپنے ہی پیش کردہ معیار کی رو سے اللہ کے سوا کسی اور کا کلام قرار پائے گا بلکہ وہ "اور" بھی جس کی تصنیف اسے سمجھا جائے گا بہرحال کوئی صحیح الدماغ انسان تو نہ ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ خان بہادر صاحب جس طرز خیال کی نمائندگی فرما رہے ہیں وہ اپنے پیچھے اخلاقی انحطاط کی ایک طویل اور دردناک تاریخ رکھتا ہے۔

تفریق دین و سیاست کا تاریخی اور نفسیاتی جائزہ

مسلمان جب اپنے اصل مقصد کو بھول کر اور اپنے حقیقی مشن کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہو گئے اور دینداری کے معنی ان کی نگاہ میں صرف یہ رہ

---

[1] النساء : ۶۴ [2] النساء : ۸۲

گئے کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی طور طریقوں کی پابندی کی جاتی رہے، خواہ مقاصد زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں، خواہ نظام اجتماعی کو زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجار کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول اور نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا غیر اسلامی، تو اس غفلت کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اس شکل میں دی گئی کہ ان کی بڑی بڑی آبادیاں پے در پے کفار کی تابع فرمان ہوتی چلی گئیں۔ لیکن انہوں نے اور ان کے علماء نے اسے سزا سمجھنے اور اس اصلی قصور کی، جس کی پاداش میں یہ سزا ملی تھی، تلافی کرنے کے بجائے الٹا یہ سوچنا شروع کر دیا کہ نظام کفر میں "اسلامی زندگی" کیسے بسر کی جائے۔ چنانچہ "اضطرار" کے بہانے سے اس شرعی اور اسلامی زندگی کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا گیا جو غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے اندر بسر کی جا سکے۔

اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید سزاؤں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ انہیں آزمایا جائے کہ یہ سنبھل کر پلٹتے ہیں یا اپنی ضلالت میں بعید سے بعید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اضطرار جسے ابتداء" صرف ایک ہی اضطرار سمجھا گیا تھا، اللہ کی سنت کے مطابق آگے بڑھا اور اس نے دائمی، روز افزوں اور غیر متناہی اضطراروں کی شکل اختیار کر لی۔ ہر نئے اضطرار نے مطالبہ کیا کہ جو حدود تم نے کفر کے اندر اسلام اور کفر کے ماتحت اسلامی زندگی کے لئے تجویز کئے ہیں انہیں سکیڑو اور سکیڑتے چلے جاؤ۔ مگر یہ جتنے عذاب خدا کی طرف سے آئے ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھولیں اور انہوں نے مستقل طور پر یہ قاعدہ ہی طے کر لیا کہ واقعی ہر اضطرار کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسلامی زندگی کے حدود سکیڑتے رہیں اور تسلط کفر کی حدوں کو پھیلنے دیں۔

پھر اس "اضطرار" کے تصور نے بھی انہیں ستانا شروع کیا۔ کیونکہ اضطرار کے نیچے حرمت کا تصور لازماً" موجود رہتا ہے۔ کوئی صاحب عقل آدمی اس صریح

بات کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب آپ محض مضطر ہونے کی وجہ سے سور کا گوشت کھائیں گے تو بہرحال سور آپ کی نگاہ میں حرام تو ضرور ہی رہے گا اور جب اسے آپ فی الاصل حرام سمجھتے ہوئے مجبوراً" کھائیں گے تو ناممکن ہے کہ آپ کے دل میں نفرت و کراہت نہ ہو۔ ناممکن ہے کہ آپ اس سے لذت لیں' شوق سے کھائیں' زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور پیٹ بھر کر کھانے کی کوشش کریں اور اس کے کباب اور قورمہ اور پلاؤ پکوانے کی فکر کریں۔ ایسے ہی اجتناب اور تنفر کا جذبہ ان تمام معاملات میں ناگزیر طور پر پیدا ہوتا ہے جنہیں آپ حقیقت کے اعتبار سے حرام سمجھتے ہوں اور صرف اضطرار کی وجہ سے اپنے لئے عارضی طور پر جائز کر لیں۔ مگر ایک پوری قوم کا اپنی زندگی کے سارے تمدنی' معاشی' سیاسی معاملات میں دائماً" اس طرح رہنا کہ اس پر اضطرار کی شرعی و نفسیاتی کیفیت طاری رہے' اور وہ حاضر الوقت نظام زندگی سے نفرت و کراہیت کے ساتھ ہمہ گیر اجتناب کرتی رہے' اور صرف اس حد تک اس سے تعلق رکھے جس حد تک ایسا تعلق جینے کے لئے ناگزیر ہو' عملاً" محال ہے۔ ایسی حالت کو ایک قلیل مدت سے زیادہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بہت جلدی طبائع اس سے تھک جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ تھکاوٹ بھی مسلمانوں میں ٹھیک اپنے وقت پر پیدا ہوئی لیکن پہلے سے دینی انحطاط جس تسلسل کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا اس نے ان تھکنے والوں کے ذہن کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ اپنے اس غلط نظریہ پر نظر ثانی کرتے جو "نظام کفر میں اسلامی زندگی" کے امکان کے متعلق انہوں نے ابتداء" قائم کیا تھا اور اس حالت اضطرار کو ختم کرنے کی تدبیریں سوچتے جس کی وجہ سے ہر طرف ہر شعبہ زندگی میں حرمتوں سے محصور اور خبائث میں مبتلا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس دینی انحطاط کی سابق رفتار انہیں جس رخ پر بڑھا لے گئی وہ یہ تھا کہ سرے سے "اضطرار" کے بہانے ہی کو ختم کر دیں تاکہ جو حرمتیں نظام کفر میں ترقیات اور آسائشوں کے

دروازے ان پر بند کئے ہوئے ہیں وہ ٹوٹ جائیں اور اباحت و حلت میں تبدیل ہو کر رہیں۔

اس غرض کے لئے دین کا ایک نیا نظریہ قائم کیا گیا۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ دین کا تعلق صرف عقائد و عبادات اور چند معاشرتی امور مثل نکاح و طلاق وغیرہ سے ہے۔ اگر ان معاملات میں کوئی نظام حکومت مسلمانوں کو امن دینے کا ذمہ لے لے تو اسلامی زندگی کا اصل مدعا حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دارالکفر دارالامن ہے۔ اس کی وفاداری و اطاعت لازم ہے' اس کے تحت سارے تمدنی معاملات (جو اس نئے نظریئے کے مطابق دنیا بمقابلہ دین کے زیر عنوان آ جاتے ہیں) انہی قوانین کے مطابق چلنے چاہئیں جو کافرانہ اصولوں پر بنائے گئے ہوں' اور اس کی قانونی و انتظامی مشین کو چلانے میں' بلکہ اس کے تحفظ اور اس کی توسیع کے لئے جان کی قربانیاں تک دینے میں بھی کوئی "مضائقہ" نہیں ہے۔

لیکن یہ معاملہ صرف "عدم مضائقہ" یا اباحت و حلت پر بھی نہ رکا۔ دارالکفر میں مسلمانوں کی ضروریات نے جلد ہی انہیں مجبور کرنا شروع کیا کہ اپنی نئی نسلوں کو خدمت کفر کا شوق دلانے کی کوشش کریں تاکہ ان نقصانات کی تلافی ہو جو اول اول کچھ مدت کے "مضائقہ" نے انہیں پہنچایا تھا۔ اس لئے ایک آخری دلیل یہ تصنیف کی گئی کہ مسلمانوں کی ترقی و فلاح اور بعض حالات میں ان کی زندگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ نظام کفر کے عدالتی' تشریعی' انتظامی' فوجی' صنعتی' غرض تمام شعبوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں' ورنہ امت کے وفات پا جانے یا کم از کم ترقی کی دوڑ میں غیر مسلموں سے پیچھے رہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس دلیل نے بہ یک جنبش قلم اسی چیز کو جو کل تک صرف مباح کے مقام پر تھی فرض کے درجے پر پہنچادیا اور واجب ہو گیا کہ اگر ساری قوم نہیں تو اس میں سے ایک طبقہ تو اس فرض کے انجام دینے کے لئے ضرور نکلتا ہی رہے' گویا حکم الٰہی یوں قرار پایا کہ:

فلو لا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الکفر ولیضلوا قومہم
اذا رجعوا الیہم لعلہم یضلون اور ولتکن منکم امۃ یدعون الی الشر
یامرون بالمنکر وینہون عن المعروف !

دین میں یہی وہ عظیم الشان ترمیم تھی جس کی بدولت بڑے بڑے متقی و دیندار حضرات منصبوں کو گردش دیتے ہوئے وکالت اور منصفی کے پیشوں میں داخل ہوئے تاکہ جس قانون پر وہ ایمان نہیں رکھتے اس کے مطابق وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں اور کرائیں۔ اور جس قانون پر ایمان رکھتے ہیں اس کی تلاوت صرف اپنے گھروں میں کرتے رہیں۔ اسی ترمیم کی بدولت بڑے بڑے صلحاء و اتقیاء کے بچے نئی درس گاہوں میں داخل ہوئے اور وہاں سے بے دینی و مادہ پرستی اور بداخلاقی کے سبق لے لے کر نکلے اور پھر اس نظام کفر کے صرف عملی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اکثر حالات میں اخلاقی اور اعتقادی حیثیت سے بھی خدمت گزار بن گئے جو ان کے اسلاف کی غفلتوں اور کمزوریوں کی بدولت ان پر ابتداء" محض اوپر سے مسلط ہوا تھا۔ پھر اسی ترمیم نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ مردوں سے گزر کر جاہلیت اور ضلالت اور بداخلاقی کا طوفان عورتوں تک پہنچا۔ وہی "فرض کفایہ" جسے ادا کرنے کے لئے پہلے مرد اٹھے تھے، عورتوں پر بھی عائد ہو گیا، اور ان بے چاریوں کو بھی آخر اس "دینی خدمت" کی بجا آوری کے لئے نکلنا پڑا۔ نہ نکلتیں تو خطرہ تھا کہ کہیں غیر مسلم ان سے بازی نہ لے جائیں۔[1]

---

[1] قیام پاکستان کے بعد اب معاملہ اور آگے بڑھ گیا ہے۔ اب امت کے جینے کی صرف یہ صورت رہ گئی ہے کہ شرفاء کی لڑکیاں کھلے میدانوں میں فوجی ڈرل کریں اور مسلمان صاحبزادیاں نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک میں جائیں اور غیر ممالک میں مسلمانوں کی نیابت کا فریضہ ان کے نمائندے ہی نہیں بلکہ نمائندیاں بھی انجام دیا کریں۔ (مصنف)

اور کہیں یہ گمان نہ کر لیجئے گا کہ دین میں یہ ترمیم آج کچھ نئی ہوئی ہے۔ درحقیقت اس کی بناء آج سے صدیوں پہلے پڑ چکی تھی' جبکہ تاتار کے کفار مسلمانوں پر مسلط ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ "نظام کفر میں اسلامی زندگی" کا نقشہ پہلی مرتبہ اسی دور کے علماء نے مرتب کیا تھا' بلکہ اسی زمانے میں بڑے بڑے علماء و صلحاء نے خود نظام کفر کی خدمت گزاری اختیار فرمائی تھی اور ان میں بکثرت لوگ وہ تھے جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر آج ہمارے مدارس عربیہ میں علمائے دین و مفتیان شرع متین تیار ہوتے ہیں۔ اسی قدامت کی وجہ سے یہ غلطی اب ایک مقدس غلطی بن چکی ہے اور کوئی تعجب نہیں ہے اگر ہمارے زمانے کے فقیہ اور محدث اور مفسر سب اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ غلط بات نہ اس دلیل سے صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ پہلے سے ہوتی چلی آ رہی ہے اور نہ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ بڑے بڑے لوگ اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ حق کا اثبات اگر ہو سکتا ہے تو خدا کی کتاب اور رسولوں کی سنت ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس پورے انحطاط کے دوران میں' جو ابتدائی اضطرار کی بناء پر اسلام "زیر سایہ کفر" کے نظریہ سے شروع ہوا' پھر رفتہ رفتہ "نظام کفر کی خدمت جائز ------ مستحب ------ فرض کفایہ" کے نظریہ تک پہنچا اور بالآخر گرتے گرتے اس انتہائی ذلیل نقطہ نظر کی پستیوں میں جا گرا کہ "مذہبی آزادی دینے والے حکمرانوں کی وفاداری عین مقتضائے دین ہے۔" مسلمانوں کی کوشش برابر یہی رہی کہ اپنے تنزل کے ہر مرحلے میں نیچے اور زیادہ نیچے اترنے کے لئے دلیل بہرحال انہیں خدا کے دین ہی سے ملنی چاہیے۔ یہ مطالبہ بظاہر تو ان کے زعم میں اس فارمولے پر مبنی تھا کہ "خدا کا دین چونکہ ہماری تمام ضرورتوں کا ضامن ہے اس لئے جو ضرورتیں اب پیش آ رہی ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے بھی اسی دین سے ہم کو رہنمائی ملنی چاہیے۔" لیکن دراصل اس ظاہری فارمولے کے

باطن میں جو حقیقی فارمولا چھپا ہوا تھا اور جس پر فی الواقع یہ لوگ کام کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ "جب ہم نے اس دین پر یہ احسان کیا ہے کہ اس کو اپنے ایمان سے سرفراز کیا تو اس کے بدلے میں کم سے کم جو فرض اس دین پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے آگے چلنے کے بجائے ہمارے پیچھے چلنے شروع کر دے۔ یعنی اب ہمارا اور اس کا تعلق یہ نہ ہو کہ ہم اسے اپنے اوپر اور خدا کی زمین پر قائم کرنے کی سعی کریں اور اس سعی کے سلسلے میں جو جو ضرورتیں ہم کو پیش آتی جائیں یہ انہیں پورا کرنے کی ضمانت لیتا جائے' بلکہ تعلق کی صورت اب یہ ہونی چاہئے کہ ہم اس کی اقامت کا کام' حتی کہ اس کا خیال تک چھوڑ کر اپنے نفس کی پیروی میں جس جس وادی کی خاک چھانتے پھریں اس میں یہ ہمارے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہے اور جن جن ادیان باطلہ کے ہم تابع فرمان بنتے جائیں ان کے ماتحت ساری غلامانہ حیثیتیں یہ بھی اختیار کرتا چلا جائے اور اس کے منشاء کے خلاف جو جو طرز زندگی ہم قبول کریں ان میں پیش آنے والی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا یہ ضامن ہو۔" چنانچہ اسی غلط نقطہ نظر کو لئے ہوئے ان لوگوں نے قرآن و سنت میں رہنمائی تلاش کرنی شروع کی اور حاصل یہ ہوا کہ پورے قرآن میں اگر کسی چیز پر جا کر ان کی نگاہ ٹھہری تو وہ سورہ عنکبوت تھی' نہ بقرہ' نہ آل عمران' نہ انفال' نہ توبہ' بلکہ سورہ یوسف تھی۔ اور اس کے بھی صرف وہ مقامات جن سے خان بہادر صاحب استدلال فرما رہے ہیں۔ اسی طرح پوری سیرت نبوی میں بھی اگر کوئی چیز ان کو قابل اتباع ملی تو وہ نہ مکے کی تپتی ہوئی ریت تھی' نہ طائف کی سنگ باری' نہ بدر و احد کے میدان' بلکہ صرف یہ واقعہ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے حبش گئی تھی اور وہاں ایک عیسائی بادشاہ کے ماتحت چند سال رعایا بن کر رہی۔

لیکن جو شخص مطلب جو ذہنیت نہ رکھتا ہو بلکہ طالب حق ہو اس کے لئے یہ سوال غایت درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ درحقیقت یوسف علیہ السلام کے زیر بحث

واقعات سے بھی کیا وہی نتیجہ نکلتا ہے' جو یہ حضرات نکالنا چاہتے ہیں؟ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہی نتیجہ نکلتا ہے' یعنی یہ کہ ایک نبی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ایک نظام کفر کی خدمت اور غیر الٰہی قانون (دین الملک) کے اجراء و نفاذ کی ذمہ داری اسی غرض کے لئے قبول کی تھی کہ ایسا کرنا فی نفسہ مقصود تھا' اور یہ مسلمانوں نے مکہ سے حبش کی طرف اسی بنیاد پر ہجرت کی تھی کہ ایک مسلم جماعت کے لئے ایک غیر مسلم نظام تمدن و سیاست بالکل ایک موزوں جائے قیام ہے بشرطیکہ وہ مسجد میں اپنے منشاء کے مطابق پوجا کر لینے کی اور اپنے سینے میں کچھ عقائد رکھ لینے اور زبان سے ان کے پھاگ اڑا لینے کی اور اس کو اجازت دے دے' تو اس کے بعد کچھ مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر کے سوال سے بدرجہا زیادہ اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات مان لینے کے بعد تو یہی امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ :

چند بنیادی سوالات اور ان کا جواب

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جو دین انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے نوع انسانی کے لئے بھیجا آیا وہ صرف عبادت گاہ کے لئے تھا یا پوری انسانی زندگی کے لئے؟

۲۔ اور جو انبیاء اس دین کو لے کر آئے وہ سارے کے سارے ایک ہی مقصد کے لئے آئے تھے اور ایک ہی ان کا مشن تھا یا مختلف مقاصد اور مختلف مشنوں کے لئے' جن میں سے بعض مشن بعض کی ضد پڑتے ہوں؟

۳۔ اور یہ کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ فی الواقع کیا ہے؟ ———— اپنی پوری زندگی میں اس کی بندگی کرے اور اسی کے قانون کی متابعت میں کام کرے یا صرف پوجا اس کی کرتا رہے اور باقی اپنے سارے معاملات جن طریقوں پر چاہے چلائے؟

ان سوالات کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ نے جو دین بھیجا ہے اس کا تعلق صرف اس محدود زندگی سے ہے جو آج کل کے تصور کے لحاظ سے

"مذہبی" کہلاتی ہے۔ مگر یہ مان لینے کے بعد قرآن میں اور دوسری کتب آسمانی میں تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون دیوانی و فوجداری، ضوابط شہادت و عدالت اور مسائل صلح و جنگ وغیرہ کے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں وہ سب بے معنی قرار پاتی ہیں۔ یا پھر ان کی حیثیت احکام کی نہیں بلکہ سفارشات کی رہ جاتی ہے جن پر عمل ہو جائے تو اچھا اور نہ ہو تو اللہ میاں کو کوئی خاص شکایت نہ ہو گی۔

اسی طرح دوسرے سوال کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے اور ہو سکتا کیا معنی، آج کل عام طور پر نبوت کا تصور یہی ہے کہ مختلف انبیاء مختلف مشن لے کر آئے ہیں، حتیٰ کہ ایک نبی کا مقصد بعثت اگر یہ رہا ہے کہ نظام کفر کو توڑنے کے لئے لڑے اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو زمین پر حکمران ہونے کی حیثیت سے قائم کرے تو دوسرے نبی کا مقصد بعثت اس کے برعکس یہ رہا ہے کہ نظام کفر کے اندر نہ صرف یہ کہ محدود قسم کی مذہبی و اخلاقی اصلاح پر اکتفا کرے، بلکہ اس نظام کفر کا مطیع وفادار بن کر رہے اور موقع ملے تو اس کو چلانے اور فروغ دینے کے لئے خود اپنی خدمات پیش کر دے۔ مگر یہ بات نہ تو قرآن کے بیان کے مطابق ہے جو پورے زور کے ساتھ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ سارے انبیاء کا مقصد بعثت ایک ہی تھا اور نہ عقل یہ باور کرنے کے لئے تیار ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی متضاد اور باہم متصادم حرکات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی معقول آدمی بھی اس خدا کو ایک حکیم خدا ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا جو انسانوں کی طرف اپنے پیغمبر کبھی کسی مقصد کے لئے بھیجے اور کبھی اس کے بالکل برعکس کسی دوسرے مقصد کے لئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک نبی نظام اسلامی کو قائم کرنے کی جدوجہد میں کامیابی کے آخری مرحلوں پر پہنچ جائے، دوسرا نبی بیچ کے کسی مرحلے میں یا ابتدائی مرحلہ ہی میں آخر وقت تک کام کرتا رہے اور کوئی تیسرا نبی دعوت و تبلیغ یا جنگ کے بجائے کسی درمیانی صورت کو اپنے مخصوص حالات میں

قابل عمل پا کر اسے اختیار کرلے۔ اور ان اشکال کے اختلاف کے باوجود مقصد سب کا ایک ہی ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے نظام زندگی کو مکمل طور پر دنیا میں قائم کرنے کی سعی کرنا' لیکن اس اختلاف اشکال کو یہ معنی پہنانا کہ انبیاء کے مقاصد بعثت ہی سرے سے مختلف و متضاد تھے' اللہ پر ایسا بہتان لگاتا ہے جس سے بدتر بہتان شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح تیسرے سوال کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے اور آج کل کے مسلمان بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس کی پوجا کر لیا کرے اور کچھ مسائل غسل و طہارت اور چند مخصو حدود حلال و حرام کی پابندی کرلے۔ اس سے آگے نہ اللہ کا کوئی مطالبہ ہے اور نہ اس سے کچھ بحث کہ آدمی زندگی کے وسیع تر معاملات میں اپنے نفس کے قوانین کی پیروی کرتا ہے یا ان شیاطین جن و انس کے احکام کی جو اس کی وسیع زمین پر مسلط ہو گئے۔ مگر یہ جواب موجودہ زمانے کے دنیا پرستوں کے لئے خواہ کتنا ہی اطمینان بخش ہو اور خواہ "الدین یسر" اور "ما جعل علیکم فی الدین من حرج"[1] کا یہ منشاء قرار دے کر وہ اپنے لئے اس سے کتنی ہی سہولتیں پیدا کر لیں' بہرحال یہ تصور عبدیت و بندگی کے تصور کی قطعی نفی ہے۔ بندگی کا شاید اس سے زیادہ مضحکہ انگیز مفہوم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ بندہ چوبیس گھنٹوں میں سے دو گھنٹوں کے لئے بندہ ہو اور باقی اوقات میں آزاد' یا صرف آقا کو سلامی دے دینے پر اس کی بندگی ختم ہو جائے اور پھر سارے کام اسے اپنے یا دوسروں کے منشاء کے مطابق کرتے رہنے کی آزادی حاصل ہو۔ پھر وہ خدا تو ہرگز خدا مانے جانے کے قابل نہیں ہے جو ایک طرف اپنے آپ کو انسان کا خالق اور رب بھی کہتا ہو اور دوسری طرف پورے انسان کو چھوڑ کر صرف اس کے ایک نہایت ہی قلیل اور غیراہم جز تک اپنے آقائی و فرماں روائی کو اس کی بندگی و غلامی کو محدود رکھنے پر راضی ہو جائے۔ کوئی باپ اپنے بیٹے پر اپنی پدرانہ حیثیت

کو' کوئی شوہر اپنی بیوی پر شوہرانہ حیثیت کو' کوئی حاکم اپنی مملکت اور اپنی رعایا پر اپنی حاکمانہ حیثیت کو اس حد تک محدود کرنے پر راضی نہیں ہوتا کہ چند مراسم اطاعت و وفاداری ادا ہو جانے کے بعد پدریت اور شوہریت اور حاکیت کا مقتضاء پورا ہو جائے اور پھر بیٹے کو اختیار ہو کہ جس جس کو چاہے اپنا باپ بناتا پھرے اور عورت کو اختیار ہو کہ جس جس کے لئے مناسب سمجھے وجہ سکون بنتی پھرے' اور رعایا کو اختیار ہو کہ جس جس کے قانون کی چاہے پیروی کرے' جس کو چاہے ٹیکس دے اور جس کے احکام کی چاہے اطاعت کرتی رہے۔ مگر یہ خدا آخر کیسا خدا ہے کہ جو انسان سارا کا سارا اس کی مخلوق اور اسی کا پروردہ ہے اور اسی کے بل پر قائم و موجود ہے' اس پر وہ اپنی آقائی کو محدود کر لینے اور اس سے بندگی کی چند رسمی باتیں قبول کر کے اسے خود مختار یا ہر ایک کی غلامی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دینے پر راضی ہے؟

دین اور نبوت اور تقاضائے عبدیت کے یہ تصورات اگر صحیح نہیں ہیں' اگر فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا دین انسان کی ساری اجتماعی و انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے' اگر خدا کا مطالبہ اپنے بندوں سے یہی ہے کہ وہ ہر حیثیت سے اس کے قانون کے پیرو اور اس کی ہدایت کے متبع ہو کر رہیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ اس برحق نظام زندگی کو قائم کرنے کی دعوت دیں اور اسی کی اقامت کے لئے سعی کریں جو خدائے واحد کی اطاعت پر مبنی ہو' تو کسی معقول آدمی کے لئے یہ تسلیم کرنا سخت مشکل ہے کہ سارے نبیوں میں سے تنہا ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہی ایسے انوکھی قسم کے نبی تھے جن کے سپرد دین اللہ کو قائم کرنے کی سعی کے بجائے یہ خدمت کی گئی تھی کہ دین الملک کے تحت وزارت مال کی نوکری کریں اور اسی طرح کوئی معقول آدمی

---

[1] الحج : ۷۸

ان دو متضاد باتوں کو بھی باہم منطبق نہیں کر سکتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو عرب کے غیر اسلامی نظام میں دین حق کی اقامت کے لئے جدوجہد بھی فرما رہے تھے اور دوسری طرف آپ کے نزدیک حبش کا غیر اسلامی نظام اس درجہ برحق بھی تھا کہ ایک مسلم جماعت کے لئے وہ ایک مناسب جائے قیام ہو سکتا تھا۔ جو لوگ دین کو ایک معقول و متناسب نظام فکر کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق اجزاء کا مجموعہ سمجھتے ہیں' ان کے لئے تو یہ بہت آسان ہے کہ انبیاء کے حالات زندگی' قرآن کی تعلیمات اور دین کے احکام و اوامر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ایک کی ایسی تاویلیں اور تفسیریں کریں جن سے ایک جز دوسرے جز سے اور ایک پہلو دوسرے پہلو سے صریح تناقض کا رنگ اختیار کر لے۔ لیکن اس دین کو ایک حکیم کے بنائے ہوئے مرتب و مربوط اور متناسب نظام کی حیثیت سے دیکھنے والوں کے لئے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو اور ہر جز کی وہی تفسیر و تاویل اختیار کریں جو کل نظام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہو اور کسی ایسی تعبیر کو' خواہ وہ کیسے ہی بڑے علماء کی طرف سے پیش کی گئی ہو' قبول نہ کریں جس سے اس دین کے اندر تناقض اور اس کی تعلیمات اور انبیاء علیہم السلام کے کاموں کے درمیان تصادم لازم آتا ہو۔

اب ہم سورہ یوسف کے زیر بحث مقامات اور ہجرت حبشہ کے واقعات سے براہ راست بحث کریں گے۔

قصہ یوسف علیہ السلام سے غلط استدلال

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جس طریقے سے سورہ یوسف میں بیان ہوا ہے اس پر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب قبل اس کے کہ نبوت سے سرفراز ہوتے۔ اپنے بھائیوں کی غداری اور ایک تجارتی قافلہ کی خیانت کی بدولت عزیز مصر کے مملوک ہو چکے تھے۔ اس مملوکیت کے زمانے میں' یا اس

سکے بعد جب کہ آپ قید کیے جا چکے تھے' آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا منصب عطا کیا گیا ---------- اغلب یہی ہے کہ یہ سرفرازی قید ہی کے زمانے میں ہوئی ہو گی' کیونکہ قید ہونے سے پہلے آپ کے کلام کا انداز پیغمبرانہ شان کا نہیں بلکہ صرف ایک مرد صالح کا سا نظر آتا ہے ---------- اس حالت میں جب آپ نبوت سے سرفراز ہوئے تو آپ نے معاً" اپنی پیغمبرانہ دعوت کی ابتداء کر دی اور ساتھ کے قیدیوں ہی کو اس چیز کی طرف بلانا شروع کر دیا جس کے لئے آپ مامور ہوئے تھے' اس دعوت کا خلاصہ سورہ یوسف رکوع ۵ میں بیان ہوا ہے جس کا مطالعہ کر کے آج بھی ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کا بلاوا "ارباب متفرقون" کی بندگی کی طرف نہیں تھا' بلکہ ایک رب کی بندگی کی طرف تھا اور وہ بار بار اہل مصر پر یہ واضح کرتے رہے تھے کہ جس بادشاہ کو تم نے رب بنا رکھا ہے وہ میرا رب نہیں ہے' بلکہ میرا رب اللہ ہے اور جس ملت کی میں پیروی کرتا ہوں وہ اللہ ہی کی بندگی سے عبارت ہے۔ یہ تبلیغ جو وہ قید خانہ میں کر رہے تھے' اس کے دوران میں یکایک یہ صورت حال پیش آئی کہ دیانت و تقویٰ اور حکومت و بصیرت کے جو غیر معمولی نشانات ان کی ذات سے ظاہر ہوئے تھے' فرماں روائے مصر ان سے متاثر ہو گیا اور اس حد تک متاثر ہوا کہ انہیں یہ توقع ہو گئی کہ اگر وہ سلطنت کے پورے اختیارات اس سے مانگیں تو وہ انہیں دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اب یوسف علیہ السلام کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ یہ کہ وہ اسلامی انقلاب کے لئے دعوت عام' جدوجہد' کشمکش اور جنگ کے طویل عمل ہی کو اختیار کریں' جو عام حالات میں اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ کہ وہ اس موقع کو جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان کے ہاتھ آ گیا تھا' استعمال کریں اور عقیدت مند بادشاہ سے جو اختیارات مل رہے تھے' انہیں لے کر ملک کے نظام فکر و اخلاق اور نظام تمدن و سیاست کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت ان کو عطا کی تھی اس کی بناء

پر انہوں نے پہلے راستے کی بہ نسبت دوسرے راستے کو اپنے مقصد کے لئے مفید تر اور اپنی منزل مقصود سے قریب تر سمجھا اور اسے اختیار کر لیا۔

یہ غیر اسلامی نظام کی نوکری نہیں تھی جو پیٹ پالنے کے لئے' یا ذاتی جاہ و منزلت کے لئے' یا نظام فاسد کے جزوی مصالح کے لئے کی گئی ہو' بلکہ یہ ایک تدبیر تھی جو اسی ایک مقصد کے لئے اختیار کی گئی تھی جس کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت یوسف علیہ السلام بھی مبعوث ہوئے تھے۔ جن لوگوں نے اسے محض نوکری سمجھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے نظام اسلامی کے قیام کے لئے اس کو ذریعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس غرض کے لئے حاصل کیا تھا کہ کافرانہ نظام بدستور قائم رہے اور وہ اس کے تحت بس فائنانس منسٹر کی خدمت انجام دیتے رہیں' ان کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کا مرتبہ موجودہ حکومتوں اور ریاستوں کے تنخواہ دار ملازموں سے کچھ بھی بلند نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اتنا بلند بھی نہیں جتنا ہمارے اس ملک میں کانگریسی وزارتوں کا مقام ثابت ہوا ہے۔ جن کا طرز عمل تمام ملک دیکھ چکا ہے کہ جب تک انہیں اپنے مقصد (آزادی ملک) کے لئے وزارت کے مفید ہونے کا یقین نہ ہو گیا' انہوں نے اور ان کے کسی گرے پڑے شخص نے بھی وزارت قبول کرنے کا خیال تک نہ کیا اور پھر جب وزارتیں قبول کیں تو یہ دیکھ کر کہ فی الواقع جوہر اقتدار (Substance of Power) ان کی طرف منتقل نہیں کیا گیا ہے' انہوں نے تمام وزارتوں کو لات مار دی۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اختیارات بادشاہ سے مانگے گئے تھے یا اس سے چھینے گئے تھے' اور نہ یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بر سر اقتدار آتے ہی بادشاہ معزول کر دیا گیا یا تخت سلطنت پر قائم رہا۔ اصل اہمیت جو چیز رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو منصب طلب کیا تھا وہ آیا کافرانہ نظام کو چلانے کے لئے اور اس کی ملازمت

قبول کرنے کی خاطر کیا تھا یا اپنے مقصد بعثت یعنی نظام اسلامی کو قائم کرنے کی خاطر' دوسری چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ آیا فی الواقع ان کو ایسے اختیارات ملے تھے یا نہیں جن سے وہ ملک کے نظام میں تبدیلی کرنے کے قابل ہو سکتے؟

ہمارے نزدیک دین اور نبوت کے پورے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے مطالبہ "اجعلنی علی خزائن الارض"[1] کا مقصد نظام اسلامی کا قیام سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ خزائن الارض کے مطالبہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ ملک کے تمام ذرائع و وسائل (Resources) ان کے ہاتھ میں دیئے جائیں۔ خان بہادر صاحب خواہ مخواہ خزائن کے لفظ کو مالیات کے معنی میں لے رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ مالیات کے معنوں میں نہیں آیا ہے۔ قرآنی تعلیمات کا تتبع کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس لفظ کا مفہوم وہی ہے جو "ذرائع و وسائل" کا مفہوم[2] ہے' اور ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ میں کسی ملک کے تمام ذرائع و وسائل کا ہونا اور اس کا ملک کے تمام سپید وسیاہ پر متصرف ہو جانا' دونوں بالکل ہم معنی ہیں۔ اسی بات کی تصدیق بائیبل سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں بصراحت یہ بیان ہوا ہے کہ فرعون مصر صرف برائے نام بادشاہ رہا۔ ورنہ تمام ملک عملاً" حضرت یوسف علیہ السلام کے زیر نگیں ہو گیا۔[3]

[2] مثلاً" آیت وللہ خزائن السموت والارض (منافقون : ۷) وان من شیء الا عندنا خزائنہ (الحجر : ۲۱) ام عندھم خزائن ربک (طور : ۳۷) وقال الذین فی النار لخزنۃ جھنم (مومن : ۴۹)

[3] بائیبل میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرعون کی جو گفتگو نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :-

---

[1] یوسف : ۵۵

"سو فرعون نے اپنے خادموں سے کہا کہ ہم کو ایسا آدمی جیسا یہ ہے' جس میں خدا کی روح ہے' مل سکتا ہے؟ اور فرعون نے یوسفؑ سے کہا چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ دیا ہے' اس لئے تیرے مانند دانش ور اور عقل مند کوئی نہیں۔ سو تو میرے گھر کا مختار ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ صرف تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا اور اس نے اسے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا اور فرعون نے یوسفؑ سے کہا میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔"

(پیدائش باب ۴۱۔ آیت ۳۸ تا ۴۴)

خط کشیدہ فقرے صحیح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کا عقیدت مند ہو چکا تھا اور اگر اس نے آپ کی نبوت تسلیم نہیں کی تھی تب بھی وہ پہلی ہی ملاقات میں ایمان لانے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر اس کے سات آٹھ برس بعد جب حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر پہنچتے ہیں تو حضرت یوسفؑ ان سے کہتے ہیں "پس تم نے نہیں' بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے گویا فرعون کا باپ اور اس کے سارے گھر کا حاکم بنا دیا۔ سو تم جلد میرے باپ کے پاس جا کر اس سے کہو' تیرا بیٹا یوسف یوں کہتا ہے کہ خدا نے مجھے سارے ملک مصر کا مالک بنا دیا ہے۔"

(پیدائش' باب ۴۵' آیت ۸ تا ۹)

اب رہا یہ دعویٰ کہ حضرت یوسفؑ کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی ملک میں سکہ تو دین الملک ہی کا رواں رہا جیسا کہ آیت "ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک" سے ظاہر ہوتا ہے' تو اس کے متعلق پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ عام طور پر اس آیت کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مترجمین اس کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ یوسفؑ کا کام یہ نہ تھا' یا یوسفؑ کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنے بھائی کو دین الملک

کے تحت پکڑتا۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس محاورے کا مفہوم عدم قدرت نہیں، بلکہ عدم موزونیت و عدم مناسبت ہی ہے۔ مثلاً" ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب (آل عمران : ۱۷۹) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تم کو غیب پر مطلع نہیں کر سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمہیں غیب پر مطلع کرے۔ اسی طرح ما کان اللہ لیضیع ایمانکم(البقرہ : ۱۴۳) فما کان اللہ لیظلمھم (التوبہ : ۷۰) اور ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ(آل عمران : ۱۷۹) میں اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ ذکر ہے کہ ظلم اور اضاعت ایمان اور مومنین و منافقین کو خلط ملط چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کا طریقہ نہیں ہے اور خود سورہ یوسف میں اس آیت سے پہلے ایک مقام پر جو ارشاد ہوا ہے، ما کان لنا ان نشرک باللہ من شیئی ء (یوسف : ۳۸) تو اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے پر قادر نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں۔" پس آیت زیر بحث کو بھی یہ معنی پہنانا صحیح نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک پر عمل کرنا چاہتے تھے مگر اس کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے، بلکہ قرآنی استعمالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار کرنا یوسف علیہ السلام کے شایان شان نہیں تھا۔ البتہ اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے صاحب اقتدار ہونے کے باوجود غیر اسلامی قانون تعزیرات کم از کم سات آٹھ برس بعد تک (جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی وہاں پہنچے تھے) ملک میں نافذ تھا۔ لیکن اس کے متعلق اس سے پہلے بھی ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ایک ملک کے نظام تمدن کو ایک رات کے اندر کلی طور پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور اسلامی انقلاب کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اقتدار ہاتھ میں آتے ہی جاہلیت کے تمام قوانین و رسوم کو یک لخت بدل

ڈالا جائے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ملک کے نظام تمدن کو کلی طور پر تبدیل کرنے میں پورے دس برس لگے تھے۔ لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں چند سال تک غیر اسلامی قانون تعزیرات یا اس کے ساتھ کچھ دوسرے غیر اسلامی قوانین بھی جاری رہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پیش نظر خدائی قوانین کا اجراء سرے سے تھا ہی نہیں اور وہ کافرانہ قوانین ہی ملک میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

ہجرت حبشہ سے غلط استدلال

اب بحث ختم کرنے سے پہلے ذرا ایک نظر ہجرت حبشہ کے مسئلے پر بھی ڈال لیجئے۔

اس معاملے کو جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے' وہ یہ ہے کہ حبش میں ایک غیر مسلم حکومت قائم تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وہاں بھیج دیا تاکہ اس کی رعیت بن کر رہیں' پھر صحابہ کرام وہاں غیر مسلم بادشاہ کے وفادار بن کر رہے کیونکہ انہیں اس کے ماتحت عقیدے اور پوجا کی آزادی حاصل تھی' اور جب ایک ہمسایہ بادشاہ نے اس کے ملک پر حملہ کیا تو انہوں نے اس کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگیں۔ لیکن یہ واقعات کی بالکل غلط نقشہ کشی ہے۔

۱۔ اول تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حبش بھیجا تھا اسی وقت آپ کو اس امر کا اندازہ تھا کہ نجاشی صالحین نصاریٰ میں سے ہے' چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ نے مہاجرین سے اس کی مملکت کے متعلق فرمایا تھا وھی ارض صدق۔

۲۔ دوسرے' مہاجرین کو وہاں بھیجنے کی غرض یہ نہ تھی کہ وہاں کی رعایا بن کر رہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی ہجرت کا مشورہ دیتے

وقت یہ فرمایا تھا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشۃ حتی یجعل اللہ لکم فرجا و مخرجا۔ "کاش تم لوگ حبش کی طرف چلے جاتے یہاں تک کہ اللہ تمہارے لئے کوئی صورت نکالے۔" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ جو مسلمان کشمکش کے اس مرحلے میں اپنی قوت برداشت سے زیادہ مصائب کے شکار ہو رہے تھے ان کو آپ نے عارضی طور پر ایک ایسی جگہ بھیج دیا جہاں اس قسم کے مصائب کی توقع نہ تھی اور مقصود یہ تھا کہ بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں تو یہ لوگ وہاں سے واپس آ جائیں۔ اس کو نظیر بنا کر یہ نتیجہ نکالنا آخر کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اگر کسی غیر مسلم حکومت میں عقیدہ اور پوجا کی آزادی حاصل ہو تو یہ اس کے تحت ان کے وفادار رعیت بن کر رہ پڑنے کے لئے کافی ہے اور اس کے آگے کچھ اور مطلوب نہیں ہے۔

۳۔ پھر جب مہاجرین وہاں پہنچے اور کفار مکہ نے نجاشی سے ان کو واپس مانگنے کے لئے اپنا وفد روانہ کیا اور حضرت جعفر اور نجاشی کے درمیان مکالمہ ہوا تو محدثین اور اہل سیرت کی متفقہ روایت کے مطابق نجاشی نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق اس عقیدے کی تصدیق کی جو قرآن میں بیان ہوا ہے، بلکہ مزید برآں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار بھی کیا۔ اس کے بعد نجاشی کے مسلمان ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ امام احمد نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے (جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں) نجاشی کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ اس نے کہا مرحبا بکم ولمن جئتم من عندہ اشھد انہ رسول اللہ وانہ الذی نجد فی الانجیل و انہ الرسول الذی بشربہ عیسی ابن مریم۔[1] کیا یہ الفاظ کسی غیر مسلم کے ہو سکتے ہیں۔ بیہقی میں خود عمرو بن عاص سے (جو مہاجرین کو واپس لانے کے لئے کفار مکہ کی طرف سے حبش بھیجے گئے تھے) یہ الفاظ مروی ہیں کہ انہوں نے آ کر اہل مکہ کو جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ ان اصحمۃ یزعم

ان صاحبکم نبی۔ احمر نجاشی بیان کرتا ہے کہ تمہارا ساتھی نبی ہے۔ کیا کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر کے بھی غیر مسلم قرار پا سکتا ہے۔

ابن ہشام نے اپنی سیرت نبوی میں حضرت عمرو بن عاص کے قبول اسلام کا جو قصہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول نجاشی ہی کی تبلیغ نے ان کے دل میں ایمان پیدا کیا تھا اور صلح حدیبیہ سے پہلے وہ نجاشی کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر چکے تھے۔ اس موقع پر جو الفاظ اس نے حضرت عمرو بن عاص سے کہے تھے وہ یہ تھے کہ اطعنی واتبعه فانه واللہ لعلی الحق ولیظهرن علیٰ من خالفه کما ظهر موسیٰ علیٰ فرعون وجنودہ۔ "میری بات مانو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کر لو' کیونکہ وہ حق پر ہیں اور وہ اسی طرح اپنے مخالفین پر غالب آ کر رہیں گے جس طرح موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے لشکروں پر غالب آئے تھے۔" علامہ ابن عبدالبر نے استیعاب میں وہ خطبہ نقل کیا ہے جو نجاشی نے حضرت ام حبیبہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غائبانہ نکاح پڑھاتے ہوئے دیا تھا۔ اس میں صاف طور پر یہ الفاظ موجود ہیں۔ اشهد ان محمدا رسول اللہ وانه الذی بشر به عیسیٰ بن مریم۔ "میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جن کی آمد کی خبر عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی۔" ان سب سے بڑھ کر مستند و معتبر وہ روایت ہے جو بخاری و مسلم

---

[1] خوش آمدید ہو تمہارے لئے اور ان کے لئے جن کے پاس سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ نے دی ہے۔

میں آئی ہے کہ نجاشی کی وفات کی خبر پا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی اور فرمایا **مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمة** "آج ایک مرد صالح نے وفات پائی ہے' اٹھو اور اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ پڑھو۔" اس کے بعد تو سرے سے اس استدلال کی بناء ہی منہدم ہو جاتی ہے جو ہجرت حبشہ کے واقعہ سے کیا جاتا ہے۔

باب دوم

اسلام کا سیاسی نظریہ

- ❑ بنیادی مقدمات
- ❑ نظریہ سیاسی کے اولین اصول
- ❑ اسلامی ریاست کی نوعیت
- ❑ نظریہ خلافت اور اس کے سیاسی مضمرات

ہندوستان میں مسلمانوں کی جدید سیاسی بیداری اپنے جلو میں نت نئے مسائل لائی۔ ان میں سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ مستقبل میں مسلمانوں کا سیاسی نظام کیا ہو؟ ہر مسلمان کی یہ دلی خواہش تھی اور ہے کہ اس کا اجتماعی نظام اسلام کی بنیادوں پر قائم ہو۔ لیکن آج کی دنیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے محبت تو کرتے ہیں مگر اس کا صحیح فہم نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کے لئے جان دینے کو تو تیار رہتے ہیں مگر اسلام کے مطابق جینا نہیں جانتے۔

مسلمانوں کے ذہن کی اس حالت کو محسوس کر کے مولانا مودودی نے اسلامی نظام حیات کے بنیادی خدوخال کو مناسب تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مقالہ انٹر کالجیٹ مسلم براورہڈ لاہور کے اجتماع منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پڑھا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان ابھی تک اپنا کوئی واضح قومی مقصد متعین نہیں کر سکے تھے۔ مولانا نے اپنے اس مقالہ میں ملت اسلامیہ کو بتایا کہ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں۔ یہ ریاست کن مقاصد کے لئے قائم ہوتی ہے اور اس کے اساسی اصول کون کون سے ہیں۔

آئندہ صفحات میں یہی مقالہ نظرثانی کے بعد دیا جا رہا ہے۔ تکرار سے بچنے کے لئے اصل مقالہ کا وہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے جس میں عملی پہلو کی طرف اشارے کئے گئے تھے۔ کیونکہ آئندہ ابواب میں مصنف محترم کی دوسری چیزیں پیش کی جا رہی ہیں جن میں وہ مباحث زیادہ تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں۔

مرتب

اسلام کا سیاسی نظریہ

اسلام کے متعلق اس قسم کے فقرے آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ یہ ایک "جمہوری نظام ہے۔" "اسلام آمریت کا حامی ہے۔" "اسلامی سوشلزم کا علمبردار ہے۔" وغیرہ۔ پچھلی صدی کے آخری دور سے اس قسم کے فقروں کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے مگر جو لوگ ان کو زبان سے نکالتے ہیں' مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام کا نظام حیات کیا ہے اور اس میں جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے' یا عدل اجتماعی اور سیاسی استحکام کے لئے اس نے کیا اصول وضع کئے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظام جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر اس پر جمہوریت یا آمریت یا سوشلزم کا نام چسپاں کر دیتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جن کی ذہنیت کچھ اس طور پر بنی ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً" عالمی قیادت پر فائز طاقتوں اور اپنے ممالک کے برسراقتدار لوگوں میں) جو چیز مقبول عام ہو اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شاید وہ اسلام کو اس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اس طرح بچ سکتا ہے کہ کسی باا ثر شخص کی سرپرستی اس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً" ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی' بلکہ صرف اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ

لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید ایڈیشن ہے۔ اور جب ڈکٹیٹر شپ کا آوازہ اٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعت امیر' اطاعت امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں اور کہنے لگے کہ یہاں سارا نظام جماعت' ڈکٹیٹر شپ ہی پر قائم ہے۔ غرض اسلام کا نظریہ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستان' ایک چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گیا ہے جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھا دی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ ہے کیا۔ اس طرح نہ صرف ان پراگندہ خیالیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور نہ صرف ان لوگوں کا منہ بند ہو جائے گا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ "اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا۔" بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہو جائے گی جس کی وہ سخت حاجت مند ہے' اگرچہ اپنی اس حاجت مندی کا شعور نہیں رکھتی۔

(۲)

بنیادی مقدمات

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں ادھر ادھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں' بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصول اولیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں' اور جڑوں سے تنا' اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں' کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن

اسلام کے متعلق دو باتیں قریب قریب ہر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا مشن ہے۔ یہ صرف محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن ہی نہیں ہے۔ بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی

خدا کی طرف سے آئے ہیں، ان سب کا یہی مشن تھا۔ دوسری یہ کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاء بھی دنیا میں آئے ہیں ان کی آمد کا مقصد وحید خدائے واحد کی خدائی منوانا اور صرف اسی ایک کی عبادت کرانا تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لئے بظاہر یہ دونوں باتیں بالکل پیش پاافتادہ حقیقتیں ہیں۔ ہر مسلمان ان کو سن کر کہے گا کہ یہ معلوم و معروف باتیں ہیں جنہیں ایک دیہاتی مسلمان بھی جانتا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اتریں۔ سب کچھ اسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھئے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا؟ صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی کون سی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مالکم من الہ غیرہ[1] کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آج کل سمجھی جاتی ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے سامنے سجدہ کر لو اور پھر باہر نکل کر حکومت وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی غیر مشروط وفاداری اور اطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا۔

آیئے ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین، جن سے انبیاء کی لڑائی تھی۔ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ وہی پانی برساتا

---

[1] الاعراف : ۶۵۔ ترجمہ۔ اس کے سوا کوئی تمہارا الہ نہیں۔

ہے۔ وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

قل لمن الارض ومن فیہا ان کنتم تعلمون ○ سیقولون للہ ط قل افلا تذکرون ○ قل من رب السموات السبع ورب العرش العظیم ○ سیقولون للہ ط قل افلا تتقون ○ قل من بیدہ ملکوت کل شیء وھو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون ○ سیقولون للہ ط قل فانی تسحرون ○

(المومنون: ۸۴: ۸۹)

ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے' بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا ہے کہو پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو' ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ وہ کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ۔ کہو' پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیئے گئے ہو؟

ولئن سالتہم من خلق السموات والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ ج فانی یوفکون۔

(عنکبوت: ۶۱)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟

ولئن سالتہم من نزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض من بعد موتہا لیقولن اللہ ط۔

(عنکبوت: ۶۳)

اور اگر تم ان سے یہ پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔

ولئن سالتہم من خلقہم لیقولن اللہ فانی یوفکون○

(الزخرف۔ ۸۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے خالق ہونے اور مالک ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے۔ لہذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لئے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کی آمد کس لئے تھی اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے' جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے' اس کے سوا کسی کو الٰہ اور رب نہ مانو۔ مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔

آیئے ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہہ میں کیا ہے؟ الٰہ سے کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو الٰہ اور رب مانو؟ اور دنیا کیوں اس بات پر لڑنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

الٰہ اور رب کا مفہوم

الٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں۔ مگر معاف کیجئے گا معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں۔ معبود کا مادہ عبد ہے۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں' بلکہ بندہ اور غلام' جو زندگی' غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے' وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت کے لئے کھڑا ہونا' احترام میں ہاتھ باندھنا۔ اعتراف بندگی میں سر جھکانا' جذبہ

وفاداری سے سرشار ہونا' فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی وجہد کرنا' جس کام کا اشارہ ہو اسے بجا لانا' جو کچھ آقا طلب کرے اسے پیش کر دینا' اس کی طاقت و جبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا' جو قانون وہ بنائے اس کی اطاعت کرنا' جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا' جہاں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا' یہ عبادت کا اصل مفہوم ہے اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح کرتا ہے۔

اور "رب" کا مفہوم کیا ہے؟ عربی زبان میں رب کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرماں برداری کی جاتی ہے۔ لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے۔ چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں۔ آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے' جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے' جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو' جس کی نگاہ لطف کے پھر جانے سے اپنی زندگی برباد ہو جانے کا خوف کرے' جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرماں برداری اور اطاعت کرے۔ وہی اس کا رب[1] ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھیے اور پھر غور سے دیکھیے' انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں اور میں تیرا رب ہوں' میری بندگی و عبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آ کر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں

---

[1] ان دونوں اصطلاحوں کی مفصل تشریح کے لئے ملاحظہ ہو "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" از سید ابوالاعلیٰ مودودی' مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ لاہور

سما سکتی ہے۔ انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اقتدار یا خواہش اتباع اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے' ان سے اپنی بندگی کرائے' ان کے سر اپنے آگے جھکوائے' ان پر اپنا حکم چلائے' ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے۔ جس کو کچھ طاقت یا دولت یا چالاکی یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے' پھیل جائے اور آس پاس کے جانوروں پر' جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بیوقوف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں' اپنی خدائی کا سکہ جماوے۔

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

راست دعوے دار

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرات ہوتی ہے یا جن کے پاس خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے کافی ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً" ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا کہ انا ربکم الاعلی[1] (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور ما علمت لکم من الہ غیری[2] (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی الٰہ ہے)۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا اور اس سے کہا کہ تو خود بھی اللہ العالمین کی بندگی اختیار کر' تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں لہٰذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو۔ لئن اتخذت الٰہا غیری لا جعلنک من المسجونین[3] (اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید

---

[1] النزعت: ۲۴ [2] القصص: ۳۸ [3] الشعراء: ۲۹

کر دوں گا"۔ اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بحث ہوئی تھی۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور سے پڑھیے:

الم تر الی الذی حاج براھیم فی ربہ ان اتاہ اللہ الملک' اذ قال ابراھیم ربی الذی یحیی ویمیت قال انا احی وامیت ط قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر ط

(بقرہ: ۲۵۸)

تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم علیہ السلام سے بحث کی اس بارے میں کہ ابراہیم علیہ السلام کا رب کون ہے اور یہ بحث اس نے اس لئے کی کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت تو میرے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا' اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے' تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا' یہ سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

غور کیجئے! وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا؟ اس لئے کہ وہ اللہ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا بھی قائل تھا کہ کائنات کا فرمانروا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے۔ جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے۔ بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً" سرزمین عراق کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعوٰی نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعوٰی رکھتا تھا کہ سلطنت عراق کے باشندوں کا رب میں ہوں اور یہ دعوٰی اس بناء پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی۔ لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرف تھا۔ اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے' اور جس کی چاہے جان بخشی کر دے۔ یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لئے

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ تم مجھے رب تسلیم کرو' میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں تو اسی کو رب مانوں گا اور اسی کی بندگی و عبادت کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے اور جس کی عبادت یہ سورج کر رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لئے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیونکر قابو میں لاؤں۔[1]

یہ خدائی جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا' کچھ انہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا میں ہر جگہ فرماں رواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لئے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسم عبودیت بجا لائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدایگاں (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمانروا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے ------ چنانچہ سورج بنسی اور چندر بنسی آج تک مشہور ہیں ------ راجہ کو ان داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کئے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور اور پرماتما ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی۔ ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بعض جگہ فرمانرواؤں کے لئے اللہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً" بولے جاتے ہیں مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خداوندی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں اللہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے۔ نہیں' وہ سب لوگ جو انسانوں پر اس اقتدار' اس فرمانروائی و حکمرانی' اس آقائی خداوندی کو قائم کرتے ہیں جسے فرعون اور

---

[1] اس مضمون کی مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔" مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ' لاہور۔

نمرود نے قائم کیا تھا' دراصل وہ الہ اور رب کے معنی و مفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں' چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں اور وہ سب لوگ جو ان کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہرحال ان کے الٰہ و رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں' چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

۲- بالواسطہ دعویدار

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہ راست اپنی الٰہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی' اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لے کر اٹھیں اور اسے منوا لیں' البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں' سو ان ذرائع سے کام لے کر وہ کسی روح' کسی دیوتا' کسی بت' کسی قبر' کسی سیارے یا کسی درخت کو الٰہ بنا دیتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں۔ یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں۔ یہ تمہارے ولی اور محافظ اور مددگار ہیں۔ ان کو خوش نہ کرو گے تو یہ تمہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے۔ انہیں خوش کر کے حاجتیں طلب کرو گے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچیں گے' مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں۔ لہٰذا ہماری بزرگی تسلیم کرو' ہمیں خوش کرو اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان' مال' آبرو سب کچھ دے دو۔ بہت سے بیوقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے۔

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں' مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے'

اس کی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں۔ عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے اور تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائے گی۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکام دینے شروع کر دیتے ہیں۔ یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنا لیتے ہیں۔ یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ جما رکھا ہے۔

فتنہ کی جڑ

اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتداء ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے، مگر اب تو ہزارہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا الٰہ اور رب نہ ہو۔ اگر اللہ کو نہ مانے گا تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے الٰہ اور ارباب اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں گے۔ آج بھی آپ جدھر نگاہ ڈالیں گے یہی نظر آئے گا کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے۔ کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے۔ کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ کہیں قومی ریاست خدائی کے مقام پر براجمان ہے اور کہیں کوئی ڈکٹیٹر ھا

علمت لکم من الہ غیری [1] کی منادی کر رہا ہے انسان کسی ایک جگہ بھی اللہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل کو وزیراعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لئے جس علم کی ضرورت ہے اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں ظلم' طغیان' ناجائز انتفاع' بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی۔ انسان کے دل و دماغ پر' اس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر ہی رہیں' جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقاء کو روک دیا۔ کس قدر سچ فرمایا اس صادق و مصدوق علیہ وعلیٰ آلہ والصلوۃ والسلام نے :

قال اللہ عزوجل انی خلقت عبادی حنفاء فجائتہم الشیطین فلجتالتہم من دینہم وحرمت علیہم ما احللت لہم

(حدیث قدسی)

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا' انہیں فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لئے حلال کیا تھا ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

---

[1] القصص : ۳۸

یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب' اس کی ساری تباہیوں' اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے۔ یہی اس کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے۔ یہی وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو' اس کی علمی و فکری قوتوں کو' اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو' اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الہوں کا انکار کرکے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لئے نہیں ہے کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

انبیاء کا اصل اصلاحی کام

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی میں کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لئے یہ لوگ آئے۔ ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے' ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے' اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں' جو اس حد سے نیچے گرا دیئے گئے ہیں انہیں ابھار کر اس حد تک اٹھا لائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظام زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود' بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتداء سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیام تھا اور وہ یہ تھا۔ یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ۔ "لوگو! اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا کوئی تمہارا الٰہ نہیں ہے۔" یہی

---

[1] ملاحظہ ہو سورہ ہود رکوع ۴' ۵' ۶' ۸

حضرت نوح علیہ السلام نے کہا۔ یہی حضرت ہود علیہ السلام نے کہا۔ یہی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا۔ یہی حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا۔[1] اور اسی کا اعلان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے:

انما انا منذر وما من اله الا الله الواحد القهار ہ رب السموات والارض وما بینهما۔

(ص: ۶۵-۶۶)

میں بس ایک متنبہ کرنے والا ہوں۔ کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے' جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

ان ربکم الله الذی خلق السموات والارض .... والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ۔ الا له الخلق والامر ط (اعراف: ۵۴)

یقیناً" تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو .... اور سورج اور چاند اور تاروں کو۔ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی۔

ذالکم الله ربکم لا اله الا هو خالق کل شیء فاعبدوه وهو علیٰ کل شیء وکیل۔ (انعام: ۱۰۲)

وہی ایک اللہ تمہارا رب ہے' اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' ہر چیز کا خالق' لہذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

وما امروا الا لیعبدوا الله مخلصین له الدین حنفاء۔ (البینتہ: ۵)

لوگوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرکے' یک سو ہو کر۔

تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا الله ولا نشرک به

شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ۔ (آل عمران: ۶۴)

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی ہم بندگی نہ کریں اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنائے۔

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کر دیا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لئے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

ویضع عنہم اصرھم والاغلل التی کانت علیہم۔ (سورہ اعراف: ۱۵۷)

یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔

---

(۲)

نظریہ سیاسی کے اولین اصول

انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور' اس کی روح اور اس کا جوہری عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریہ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے "فرداً" اور "مجتمعاً" سلب کر لئے جائیں' کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں' وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

ان الحکم الا للہ ط امر الا تعبدوا الا ایاہ ط ذالک الدین القیم۔

(یوسف : ۴۰)

حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

یقولون ھل لنا من الامر من شیء ط قل ان الامر کلہ للہ۔

(آل عمران : ۱۵۴)

وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال و ھذا حرام۔

(النحل : ۱۱۶)

اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون ۝ (مائدہ: ۴۴)

جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل کافر ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز (Law Giver) صرف خدا ہے۔[1] کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ کے حکم ہی کا پیرو ہے۔ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی۔ (انعام: ۵۰) "میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔" عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اس لئے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن (Sanction) کے تحت اس کی اطاعت کی جائے۔

اولئک الذین اتینھم الکتب والحکم والنبوۃ۔ (انعام: ۸۹)

یہ نبی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی کتاب دی۔ حکم (Authority) سے سرفراز کیا اور نبوت عطا کی۔

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین۔ (آل عمران: ۷۹)

کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو۔

---

[1] حاکمیت الٰہی کے تصور کی مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو باب ۸ ۔ مرتب

پس اسلامی اسٹیٹ کی ابتدائی خصوصیات جو قرآن کی مذکورہ بالا تصریحات سے نکلتی ہیں یہ ہیں:

۱۔ کوئی شخص، خاندان، طبقہ یا گروہ بلکہ اسٹیٹ کی ساری آبادی مل کر بھی حاکمیت کی مالک نہیں ہے۔ حاکم اعلیٰ (Sovereign) صرف خدا ہے، اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لئے کوئی قانون بنا سکتے ہیں اور نہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔[1]

۳۔ اسلامی اسٹیٹ بہرحال اس قانون پر قائم ہو گا جو خدا کی طرف سے اس کے نبی نے دیا ہے۔ اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہو گی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

---

[1] تشریح کے لئے ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب ۸

(۳)

اسلامی ریاست کی نوعیت

ایک شخص بیک نظران خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ مغربی طرز کی لادینی جمہوریت (Secular Democracy) نہیں ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے جمہوریت تو نام ہی اس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت اعلیٰ حاصل ہو۔ انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور صرف انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو۔ جس قانون کو وہ چاہیں نافذ ہو اور جسے وہ نہ چاہیں وہ کتاب آئین میں سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے۔ یہاں ایک بالاتر بنیادی قانون خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ سے دیتا ہے جس کی اطاعت ریاست اور قوم کو کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام "الٰہی حکومت" ہے جس کو انگریزی میں (Theocracy) کہتے ہیں۔ مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے اسلامی تھیاکریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (Priest-Class) خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے۔[1]

---

[1] عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح علیہ السلام کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہہ کر انہیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فویل للذین یکتبون الکتب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ (البقرہ: ۷۹)

اور عملاً" اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیا کریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی' بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو (Theo-Democracy) یعنی "الٰہی جمہوری حکومت" کے نام سے موسوم کروں گا۔ کیونکہ اس میں خدا کے اقتدار اعلیٰ (Paramountcy) کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کی گئی ہے۔ اس میں انتظامیہ (Executive) اور مقننہ (Legislature) مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے' مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہو گا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہو گا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے' جہاں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا حکم موجود ہو' وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو' کسی مقننہ کو' کسی مجتہد اور عالم دین کو بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سرمو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تھیا کریسی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود و قیود کیوں عائد کیے گئے ہیں' اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے۔ اعتراض کرنے والا اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے

انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کرلی' حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ خدا کی الہیت انسان کو عقل و فکر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں' بلکہ اس کو محفوظ کرنے کے لئے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد لادینی جمہوریت' جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) ہوتی ہے' اس کا ذرا تجزیہ کرکے دیکھیے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انھیں اپنی حاکمیت چند مخصوص لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ ان کی طرف سے وہ قانون بنائیں اور اسے نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے اور چونکہ سوسائٹی اخلاق اور امانت و دیانت کی نعمتوں سے محروم ہے اور ان تصورات کو کوئی اہمیت بھی نہیں دیتی' اس لیے اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت' اپنے علم' اپنی چالاکی اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈے' کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے الٰہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لئے قوانین بناتے ہیں اور اسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے' ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے' یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو جمہوریت کی جنت ہونے کا دعویٰ ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کرکے اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں' تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں

دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (Judgement) عموماً" یک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے بلکہ بسا اوقات عقلی اور علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لئے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (Prohibition Law) کی مثال پیش کروں گا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لئے مضر ہے' عقلی و ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے اور انسانی تمدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کر کے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لئے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا۔[1]

مگر جب وہ نافذ کیا گیا تو انہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا اس کے خلاف بغاوت کی۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پیں۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا۔ جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار انہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی' حلال کر دی گئی۔[2]

یہ حرمت کا فتوئی حلت سے جو بدلا گیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کر دی تھی۔ اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا تھا اور اس الٰہ کی بندگی میں وہ اس قانون کو بدلنے پر مصر تھے جسے انہوں نے خود ہی علمی اور عقلی

---

[1] یہ قانون ۱۹۱۸ء میں امریکی کانگرس نے پاس کیا تھا۔ مرتب

[2] یہ تنسیخ دسمبر ۱۹۳۳ء میں واقع ہوئی۔ مرتب

حیثیت سے صحیح تسلیم کر کے پاس کیا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضع قانون (Legislator) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائے گا اور اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنا لے گا۔ لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگا دی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں "حدود اللہ" (Divine Limits) کہا جاتا ہے یہ حدود زندگی کے ہر شعبہ میں چند اصول' چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبہ کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں' ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لئے ضمنی اور فروعی ضوابط (Regulations) بنا سکتے ہو' مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے۔ ان سے تجاوز کرو گے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق' زکوٰۃ کی فرضیت' سود کی حرمت' جوئے اور سٹے کی ممانعت' وراثت کا قانون اور دولت کمانے' جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دیے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal Liberty) بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (Class War) اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی (Family Life) میں اللہ تعالیٰ نے حجاب شرعی' مرد کی قوامیت' شوہر' بیوی' بچوں اور والدین کے حقوق و فرائض' طلاق اور خلع کے احکام' تعداد ازواج کی مشروط اجازت' زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو منضبط کرے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں اور نہ ان گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون' چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا' شراب کی حرمت' جسمانی ستر کے حدود' اور ایسے چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے ہیں۔

میرے لئے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کر کے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لئے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل ناقابل تغیر و تبدل دستور (Constitution) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روح آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا' بلکہ اس کے لئے ایک صاف' واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے' اس کی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں' اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ پرپیچ پہاڑی راستوں میں' جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں' سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے

کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی سلب کرنا ہے؟ نہیں! دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ' ہر موڑ اور ہر امکانی خطرے کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ ادھر نہیں ادھر ہے' تجھے اس رخ پر نہیں اس رخ پر مڑنا چاہیے' تاکہ تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد ان حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رخ معین کرتی ہیں اور ہر پر پیچ مقام' ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے' تجھے ان سمتوں پر نہیں بلکہ اس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیے۔

خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو بعض مغربیت زدہ مسلمان ملکوں کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں' مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کے لئے اٹل دستور ہے۔ اسلامی ریاست جب بنے گی اسی دستور پر بنے گی۔ جب تک قرآن اور سنت رسول ﷺ دنیا میں باقی ہے' اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی۔ جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

اسلامی ریاست کا مقصد

اس دستور کی حدود کے اندر جو ریاست بنے اس کے لئے ایک مقصد بھی خدا نے متعین کر دیا ہے اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیه باس شدید و منافع للناس۔ (الحدید: ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا

اتارا جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت یا قوت قاہرہ (Coercive Power) ہے اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح ہدایات اور اپنی کتاب میں جو میزان ان کو دی ہے' یعنی جس ٹھیک ٹھیک متوازن (Well Balanced) نظام زندگی کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی ہے' اس کے مطابق اجتماعی عدل (Social Justice) قائم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا'

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتو الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ (الحج: ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن و حکومت عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے' زکوۃ دیں گے' نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا'

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

(الف) ایجابی اور ہمہ گیر ریاست

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس ریاست کا تخیل پیش کر رہا ہے' اس کا مقصد سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے' ان کی آزادی کی حفاظت

کرے اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے' بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اس کا مقصد بدی کی ان تمام صورتوں کو مٹانا اور نیکی کی ان تمام شکلوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے۔ اس کام میں حسب موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائے گی' تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا' تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

اس نوعیت کی ریاست ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتی۔ یہ ہمہ گیر ریاست ہے۔ اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ ریاست فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتی ہے۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس ہمہ گیریت کے باوجود اس میں موجودہ زمانے کی کلی (Totalitarion) اور استبدادی (Authoritarion) ریاستوں کا سا رنگ نہیں ہے۔ اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قائم کیا گیا ہے' اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں' انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔

(ب) جماعتی اور اصولی ریاست

دوسری بات جو اسلامی ریاست کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ریاست

کو صرف وہ لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے بھی واقف ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے ۔جو شخص بھی اسے قبول کر لے، خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک، کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس ریاست کو چلانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور جو اسے قبول نہ کرے اسے ریاست کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ریاست کے حدود میں ذمی (Protected Citizen) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ لیکن بہرحال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہ دی جائے گی، کیونکہ یہ ایک اصولی ریاست ہے جس کے نظم و نسق کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے اصولوں کو مانتے ہوں۔[1]

یہاں بھی اسلامی ریاست اور کیمونسٹ اسٹیٹ میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی ریاست کرتی ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں جو کیمونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے، جائیدادیں ضبط کی جائیں، قتل و خون کا بازار گرم ہو اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ کر زمین کے جہنم، سائبیریا کی طرف پیک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لئے

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو باب سیزدہم

جو فیاضانہ برتاؤ اپنی ریاست میں اختیار کیا ہے اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو ایک خط امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' ان کا طریق کار کیا ہوتا ہے۔

---

(۴)

نظریہ خلافت اور اس کے سیاسی مضمرات

اب میں آپ کے سامنے اسلامی ریاست کی ترکیب اور اس کے طرز عمل کی تھوڑی سی تشریح کروں گا۔ یہ بات میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے اٹھیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیے تو آپ کا ذہن خود بخود پکارے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہئیں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

> وعد اللّٰہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت یستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم (النور: ۵۵)
>
> جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریہ ریاست (Theory of State) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ

(Vicegerent) ہونا چاہئے جو محض تفویض کردہ اختیارات (Delegated Powers) استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے۔ وہ عمومی خلافت (Popular Vicegerency) ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً" فرداً" ہر ایک خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ (کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتہ[1] اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت کی حیثیت

یہ ہے اسلام میں جمہوریت کی اصل بنیاد۔ عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

ا۔ ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو' طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہوں گے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہو گی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہو گی۔ یہی بات ہے جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے۔ حجتہ الوداع کے موقع پر آپؐ نے فرمایا:

---

[1] مشہور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم سب خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہو۔ (حدیث)

یا ایھا الناس، الا ان ربکم واحد، لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی لسود الا بالتقوٰی، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم [1]

لوگو، سن رکھو، تمہارا رب ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے۔ فضیلت اگر ہے تو تقویٰ کی بناء پر ہے۔ درحقیقت تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی ریاست کے دائرے میں آ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان والوں کو، جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

الحمد للہ الذی اذھب عنکم عیبۃ الجھالیۃ و تکبرھا یا ایھا الناس، الناس رجلان، برتقی کریم علی اللہ، وفاجر شقی ھین علی اللہ، الناس کلھم بنو آدم وخلق اللہ آدم من تراب، قال اللہ تعالٰی یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثٰی.... الایہ [2]

شکر ہے اس خدا کا جس نے جاہلیت کا عیب اور تکبر تم سے دور کر دیا۔ لوگو، انسان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نیک اور پرہیزگار ہو، وہ اللہ کے نزدیک معزز ہے۔ دوسرا وہ جو بد اعمال اور شقی ہو، وہ اللہ کے نزدیک فرومایہ ہے۔ اصل کے اعتبار سے سب انسان اولاد آدم ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "لوگو، ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے......"

۲۔ ایسی سوسائٹی میں کسی فرد یا کسی گروہ افراد کے لئے اس کی پیدائش یا

۱۔ تفسیر روح المعانی، بحوالہ بیہقی و ابن مردویہ، ج ۲۶، ص ۱۴۸

اس کے معاشرتی مرتبے (Social Status) یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں (Disabilities) نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقاء میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور پر بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلام زادے فوجوں کے سپہ سالار اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے شیوخ نے ان کی ماتحتی کی۔ چمار جوتیاں گانٹھتے گانٹھتے اٹھے اور امامت کی مسند پر بیٹھ گئے۔ جولاہے اور بزاز مفتی اور قاضی اور فقیہہ بنے اور آج اُن کے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ **اسمعوا واطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی**۔ "سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا سردار ایک حبشی ہی کیوں نہ بنا دیا جائے۔" (بخاری کتاب الاحکام)

۳۔ ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ (Group) کی ڈکٹیٹرشپ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لئے اس کی ذات میں مرکوز (Concentrate) کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاع مطلق یعنی آمر (Dictator) بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ آمریت دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ

اسلامی ریاست ایک ہمہ گیر ریاست ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا دائرہ وسیع ہے' مگر اس کلیت اور ہمہ گیری کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون ہمہ گیر ہے جسے اسلامی حکومت کو نافذ کرنا ہے۔ خدا نے زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یقیناً پوری ہمہ گیری کے ساتھ نافذ کی جائیں گی۔ مگر ان ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکومت خود ضابطہ بندی (Regimentation) کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتی۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتی کہ فلاں پیشہ کریں اور فلاں پیشہ نہ کریں' فلاں فن سیکھیں اور فلاں نہ سیکھیں' اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلوائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں۔ اپنے سر پر فلاں قسم کی ٹوپی پہنیں' اپنی زبان کے لئے فلاں رسم الخط اختیار کریں' اپنی عورتوں کو فلاں قسم کا لباس پہنائیں۔ یہ خداوندانہ اختیارات جو روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے اور جن کو اتاترک نے ترکی میں استعمال کیا' اسلام نے اپنے نظام میں امیر کو ہرگز عطا نہیں کئے ہیں۔ علاوہ بریں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر فرد شخصی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ یہ شخصی جوابدہی (Personal Accountability) ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں۔ لہذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری آزادی ہونی چاہئے کہ اپنے لئے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور جدھر اس کا میلان ہو' اپنی قوتوں کو اسی طرف بڑھنے کے لئے استعمال کرے۔ اگر امیر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے گا تو وہ خود اس ظلم کے لئے اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفائے راشدین کی حکومت میں ضابطہ بندی (Regimentation) کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

۴۔ ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئے' اس لئے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے'

بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے۔ دوسری طرف ایسی انفرادیت (Individualism) کا سدباب کر دیا ہے جو اجتماعیت کی نفی کرتی ہو۔ یہاں افراد و جماعت کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت جماعت میں گم ہو جائے، جس طرح کمیونزم اور فاشزم کے نظام اجتماعی میں ہو جاتی ہے اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لئے نقصان دہ ہو، جیسا کہ مغربی جمہوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصد حیات وہی ہے جو جماعت کا مقصد حیات ہے۔ یعنی قانون الٰہی کا نفاذ اور رضائے الٰہی کا حصول۔ مزید برآں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح تسلیم کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لئے مخصوص فرائض بھی عائد کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت پیدا ہو گئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشوونما کا پورا موقع بھی ملتا ہے اور پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود میں مددگار بھی بن جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سدباب کرنا تھا جو اسلامی جمہوریت کی مذکورہ بالا تشریح سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

باب ۳

قرآن کا فلسفہ سیاست

- علم سیاست کے بنیادی سوال
- چند بنیادی حقیقتیں
- اسلامی تصور حیات
- دین اور قانون حق
- حکومت کی ضرورت اور اہمیت
- تصور حاکمیت و خلافت
- اصول اطاعت و وفاداری

قرآن کریم خدا کی وہ آخری کتاب ہے جس میں خالق ارض و سماء نے زندگی کے تمام بنیادی مسائل کے متعلق اپنی ہدایت مکمل ترین شکل میں انسان کو دے دی ہے اور ہمیشہ کے لئے یہ اصول بھی ارشاد فرما دیا ہے کہ جو اس ہدایت کو دانتوں سے پکڑے گا اور اس پر عمل پیرا ہو گا وہی کامیاب و کامران ہے۔

فمن تبع ھدی فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ○ والذین کفروا و کذبوا بایتنا اولئک اصحب النار ھم فیھا خالدون ○ (البقرہ: ۳۸-۳۹)

"تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے اور جنہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔"

یہ قرآن زندگی کے ہر شعبے کے متعلق بنیادی ہدایت دیتا ہے۔ اس کا اصل موضوع انسان کی ہدایت ہے اور مہد سے لحد تک ------ بلکہ لحد کے بعد کی زندگی کے لئے بھی یہ واضح رہنمائی دیتا ہے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ بنیادی سیاسی مسائل کے متعلق خدا کی یہ کتاب خاموش رہتی۔ قرآن' دین اور دنیا کی تقسیم کو ایک فتنہ قرار دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ادخلوا فی السلم کافتہ (داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے) زیر نظر مقالہ میں قرآن کے سیاسی تصورات کو مرتب کیا گیا ہے۔

تفہیم القرآن' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بھی وہ عظیم الشان تفسیر ہے جس میں دور حاضر کے مسائل اور مسلمانوں کے جدید ذہن کو سامنے رکھ کر قرآن پاک کے حقیقی مطالب کی تشریح و توضیح بڑے دل نشین انداز میں کی گئی ہے۔ یہ تفسیر چھ

جلدوں پر مشتمل ہے۔ راقم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس تفسیر سے ان تمام مباحث کو منتخب کر کے تین مقالوں میں منسلک کر دے جو سیاسی نظام کے متعلق ہیں۔ کتاب کے پہلے حصہ میں ہم "قرآن کا فلسفہ سیاست" کے عنوان سے ان مباحث کو پیش کر رہے ہیں جو فلسفہ سیاست کے بنیادی امور سے متعلق ہیں۔ بعد کے حصوں میں ان سے متعلقہ حصے مقالہ کی شکل میں پیش کئے جائیں گے۔

مرتب

علم سیاست کے بنیادی سوال

علم سیاست کا اصل موضوع فرد اور ریاست کے باہم تعلق کا مسئلہ ہے۔ اس علم کے چند بنیادی سوال یہ ہیں:

۱۔ ریاست کی ضرورت کیا ہے؟
۲۔ ریاست میں حاکمیت اعلیٰ کس کو حاصل ہو؟
۳۔ اطاعت اور وفاداری کا اصول کیا ہو؟
۴۔ حکومت کا مقصد اور اس کے بنیادی وظائف کیا ہوں؟

مندرجہ ذیل صفحات میں ان سوالات کے جواب قرآن پاک سے دیئے جا رہے ہیں اور چونکہ قرآن کے سیاسی تصورات کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کائنات میں انسان کے مقام اور اس کے پورے تصور زندگی کے متعلق قرآن نے جو نقطہ نظر دیا ہے وہ سامنے رہے اس لئے پہلے اسلام کے تصور حیات کے متعلق چند بنیادی باتیں دی جا رہی ہیں اور اس کے بعد قرآن کے سیاسی تصورات کو پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

چند بنیادی حقیقتیں

سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہونا چاہئے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے' مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لئے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہو گی جو خود اس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے اور وہ یہ ہے:

۱۔ خداوند عالم نے' جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے' اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصے میں' جسے زمین کہتے ہیں' انسان کو پیدا کیا۔ اسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲۔ اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور سارے جہان کا مالک' معبود اور حاکم میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو' نہ کسی دوسرے کے بندے ہو اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لئے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس آنا ہو گا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد

معبود اور حاکم تسلیم کرو' جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لئے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لئے تم آزاد ہو) تو تمہیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہو گا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمہیں ابدی راحت و مسرت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رویہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لئے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہو گا اور دنیا سے گزر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے' تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیئے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳۔ یہ فہمائش کر کے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اولین افراد (آدم و حوا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انہیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اولین انسان' جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انہیں ان کا قانون حیات بتا دیا گیا تھا۔ ان کا طریق زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مطیع خدا (مسلم) بن کر رہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریق زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رویوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے اس کو گم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مسخ بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی' خیالی اور مادی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھہرا لیا۔ انہوں نے خدا کے دیئے ہوئے علم حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اوہام اور نظریوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذاہب پیدا کر لئے۔ انہوں نے خدا کے مقرر کئے ہوئے

عادلانہ اصول اخلاق و تمدن (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاڑ کر اپنی خواہشات نفس اور اپنے تعصبات کے مطابق ایسے قوانین زندگی گھڑ لئے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

۴۔ خدا نے جو محدود خود اختیاری انسان کو دی تھی اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑنے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رویہ کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لئے جو مہلت اس نوع کے لئے اور اس کی مختلف قوموں کے لئے مقرر کی تھی اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اس بغاوت کے رونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرینش سے اس نے اپنے ذمہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے' اس کی مہلت عمل کے دوران میں' اس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس نے ان کو اپنا نمائندہ بنایا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ ان کو علم حقیقت بخشا۔ انہیں صحیح قانون حیات عطا کیا اور انہیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اسی راہ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

۵۔ یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اٹھتے رہے۔ ہزارہا برس تک ان کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزارہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ ان سب کا ایک ہی دین تھا' یعنی وہ صحیح رویہ جو اول روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے' یعنی اخلاق و تمدن کے وہ ازلی و ابدی اصول جو آغاز ہی میں انسان کے لئے تجویز کر دیئے گئے تھے اور ان سب کا ایک ہی مشن تھا' یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے ابنائے نوع کو دعوت دیں' پھر جو لوگ اس دعوت کو

قبول کرلیں ان کو منظم کر کے ایک ایسی امت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانون الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لئے جدوجہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی اور جنہوں نے اسے قبول کر کے امت مسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض امتیں ہدایت الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔

۶۔ آخر کار خداوند عالم نے سرزمین عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کام کے لئے مبعوث کیا جس کے لئے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ ان کے مخاطب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاء کے بگڑے ہوئے پیرو بھی۔ سب کو صحیح روئیہ کی طرف دعوت دینا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں، انہیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرے ------ اسی دعوت اور ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن مقدمہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۶۔ ۱۹

(۲)

اسلامی تصور حیات

قرآن اس دنیا میں انسان کے صحیح مقام اور زندگی کے متعلق اس کے پورے نظریہ کو ایک آیت میں بیان کرتا ہے:

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ ط یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون' وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقرآن ط ومن اوفی بعھدہ من اللہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ ط وذالک ھو الفوز العظیم۔ (التوبہ: ۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے' تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

یہاں ایمان کے اس معاملے کو جو خدا اور بندے کے درمیان طے ہوتا ہے بیع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان محض ایک مابعد الطبیعاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں خدا کی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اسے جنت عطا

کرے گا۔ اس اہم مضمون کے مضمرات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس بیع کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے' اس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے' کیونکہ وہی اس کا اور ان ساری چیزوں کا خالق ہے جو اس کے پاس ہیں اور اسی نے وہ سب کچھ اسے بخشا ہے جس پر وہ تصرف کر رہا ہے۔ لہٰذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نہ انسان کا اپنا کچھ ہے کہ وہ اسے بیچے' نہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے۔ لیکن ایک چیز انسان کے اندر ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کلیتہ اس کے حوالے کر دیا ہے اور وہ ہے اس کا اختیار' یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا (Free will and Freedom of Choice) اس اختیار کی بنا پر حقیقت نفس الامری تو نہیں بدلتی مگر انسان کو اس امر کی خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ چاہے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کر دے۔ بالفاظ دیگر اس اختیار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتوں کا اور ان اقتدارات کا جو اسے دنیا میں حاصل ہیں' مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسے اس امر کی آزادی دے دی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جبر کے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حقوق مالکانہ کو تسلیم کرنا چاہے تو کرے ورنہ آپ ہی اپنا مالک بن بیٹھے اور اپنے زعم میں یہ خیال کر لے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حدود اختیار نہیں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بیع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بیع اس معنی میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا اسے خریدنا چاہتا ہے بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے انسان

کو دے رکھی ہے' اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو برضا و رغبت (نہ کہ بمجبوری) میری چیز کو میری ہی چیز مان لے اور زندگی بھر اس میں خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کر لے اور خیانت کی جو آزادی تجھے میں نے دی ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو جا۔ اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خود مختاری کو (جو تیری حاصل کردہ نہیں بلکہ میری عطا کردہ ہے) میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تجھے بعد کی جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے ساتھ بیع کا یہ معاملہ طے کر لے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بیع کا دوسرا نام ہے اور جو شخص اس سے انکار کر دے یا اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے' وہ کافر ہے اور اس بیع ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بیع کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے تضمنات کا تجزیہ کیجئے۔

۱۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو بہت بڑی آزمائشوں میں ڈالا ہے۔ پہلی آزمائش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیئے جانے پر اتنی شرافت دکھاتا ہے یا نہیں کہ مالک ہی کو مالک سمجھے اور نمک حرامی و بغاوت پر نہ اتر آئے۔ دوسری آزمائش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر اتنا اعتماد کرتا ہے یا نہیں کہ جو قیمت آج نقد نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملے گی' جس کے ادا کرنے کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے' اس کے عوض اپنی آج کی خود مختاری اور اس کے مزے بیچ دینے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

۲۔ دنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی بنتی ہے اس کی رو سے تو ایمان بس چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کے غیر مومن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی صریح ثبوت اسے نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے لیکن خدا کے ہاں جو ایمان

معتبر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خود مختاری کو خدا کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے حق میں اپنے ادعائے ملکیت سے کلیتہ دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص کلمہ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم و صلوۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم و جان کا' اپنے دل و دماغ اور بدن کی قوتوں کا' اپنے مال اور وسائل و ذرائع کا اور اپنے قبضہ و اختیار کی ساری چیزوں کا مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو اور ان میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کی آزادی اپنے لئے محفوظ رکھتا ہو' تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہ مومن سمجھا جاتا رہے' مگر خدا کے ہاں یقیناً" وہ غیر مومن ہی قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ بیع کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں جو قرآن کی رو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو وہاں جان و مال کھپانے سے دریغ کرنا اور جہاں اس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھپانا' یہ دونوں طرز عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعی ایمان نے یا تو جان و مال کو خدا کے ہاتھ بیچا نہیں ہے یا بیع کا معاہدہ کر لینے کے بعد بھی وہ بیچی ہوئی چیز کو بدستور اپنی سمجھ رہا ہے۔

۳۔ ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رویہ زندگی اور کافرانہ رویہ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان لایا ہو' اپنی زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی مرضی کا تابع بن کر کام کرتا ہے اور اس کے رویہ میں کسی جگہ بھی خود مختاری کا رنگ نہیں آنے پاتا۔ الا یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ خدا کے ساتھ اپنے معاہدہ بیع کو بھول کر کوئی خود مختارانہ حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح جو گروہ اہل ایمان سے مرکب ہو وہ اجتماعی طور پر بھی کوئی پالیسی' کوئی سیاست' کوئی طرز تمدن و تہذیب' کوئی طریق معیشت و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانون شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے متنبہ ہو گا اسی وقت وہ آزادی کا رویہ

چھوڑ کر بندگی کے رویہ کی طرف پلٹ آئے گا۔ خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و متعلقات نفس کے بارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں بہر حال ایک کافرانہ رویہ زندگی ہے' خواہ اس پر چلنے والے لوگ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہوں یا "غیر مسلم" کے نام سے۔

۴۔ اس بیع کی رو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع آدمی پر لازم آتا ہے وہ آدمی کی اپنی تجویز کردہ مرضی نہیں بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود بتائے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی ٹھہرا لینا اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا اتباع نہیں' بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاہدہ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاہدہ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گروہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رویہ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اس بیع کے مضمرات ہیں اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس خرید و فروخت کے معاملہ میں قیمت (یعنی جنت) کو موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمہ پر کیوں موخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ "بائع نے اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا۔" بلکہ وہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ "بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس بیچی ہوئی چیز پر خود مختارانہ تصرف چھوڑ دے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرے۔" لہذا یہ فروخت مکمل ہی اس وقت ہو گی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقعہ یہ ثابت ہو کہ اس نے معاہدہ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحہ تک بیع کی شرائط پوری کی ہیں۔ اس سے پہلے وہ از روئے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

ان امور کی توضیح کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس سلسلہ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے۔ اوپر سے جو سلسلہ تقریر چل رہا تھا اس میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے ایمان لانے کا اقرار کیا تھا' مگر جب امتحان کا نازک موقع

آیا تو ان میں سے بعض نے تساہل کی بنا پر' بعض نے اخلاص کی کمی کی وجہ سے اور بعض نے قطعی منافقت کی راہ سے خدا اور اس کے دین کی خاطر اپنے وقت' اپنے مال' اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہٰذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رویہ پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان جسے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے' محض یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہی ہے' بلکہ دراصل وہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا ہی تمہارے نفس اور تمہارے مال کا مالک ہے۔ پس یہ اقرار کرنے کے بعد اگر تم اس نفس و مال کو خدا کے حکم پر قربان کرنے سے جی چراتے ہو اور دوسری طرف اپنے نفس کی قوتوں کو اور اپنے ذرائع کو خدا کے منشاء کے خلاف استعمال کرتے ہو' تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو۔ سچے اہل ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں اور اسی کو ان چیزوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ جہاں اس کا حکم ہوتا ہے وہاں انہیں بے دریغ قربان کرتے ہیں اور جہاں اس کا حکم نہیں ہوتا وہاں نفس کی طاقتوں کا کوئی ادنیٰ سا جز اور مالی ذرائع کا کوئی ذرا سا حصہ بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اس امر پر بہت اعتراضات کئے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ تورات اور انجیل میں موجود نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انجیل کا تعلق ہے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو اناجیل اس وقت دنیا میں موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنی ہیں' مثلاً:

> "مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے سبب ستائے گئے ہیں' کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے۔" (متی ۵:۱۰)
>
> "جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔" (متی ۱۰:۳۹)

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہو گا۔" (متی ۱۹:۲۹)

البتہ توراۃ جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا اور یہی مضمون کیا' وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور اخروی جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دین حق کا جزو لاینفک رہا ہے۔ لیکن موجودہ توراۃ میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ واقعی توراے اس سے خالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زمانہ تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوش حالی کے بھوکے ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو۔ اس لئے کتاب الٰہی میں بندگی و اطاعت کے بدلے جن جن انعامات کے وعدے ان سے کئے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں اتار لائے اور جنت کی ہر تعریف کو انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ امیدوار تھے۔ مثال کے طور پر توراۃ میں متعدد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے:

"سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت کر۔" (استثناء ۶: ۴' ۵)

اور یہ کہ:

"کیا وہ تمہارا باپ نہیں جس نے تم کو خریدا ہے؟ اسی نے تم کو بنایا اور قیام بخشا۔" (استثناء ۳۲۔۶)

لیکن اس تعلق باللہ کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے' یعنی فلسطین۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ توراۃ جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے اول تو پوری نہیں ہے اور پھر وہ

خالص کلام الٰہی پر بھی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام خدا کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کے اندر یہودیوں کی قومی روایات' ان کے نسلی تعصبات' ان کے اوہام' ان کی آرزوؤں اور تمناؤں' ان کی غلط فہمیوں اور ان کے فقہی اجتہادات کا ایک معتدبہ حصہ ایک ہی سلسلہ عبارت میں کلام الٰہی کے ساتھ کچھ اس طرح رل مل گیا ہے کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو ان زوائد سے تمیز کرنا قطعاً" غیر ممکن ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۳۵۔۲۳۹

(۳)

دین اور قانون حق

الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تاخذکم بهما رافة فی دین الله ان کنتم تومنون بالله والیوم الاخر۔ (النور: ۲)

"زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامن گیر نہ ہو' اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

اولین چیز جو اس آیت میں قابل توجہ ہے وہ یہ کہ یہاں فوجداری قانون کو "دین اللہ" فرمایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف نماز اور روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی دین نہیں ہیں بلکہ مملکت کا قانون بھی دین ہے۔ دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کا قانون اور نظام شریعت قائم کرنا بھی ہے۔ جہاں یہ چیز قائم نہ ہو وہاں نماز اگر قائم ہو بھی تو گویا ادھورا دین قائم ہوا۔ جہاں اس کو رد کر کے دوسرا کوئی قانون اختیار کیا جائے وہاں کچھ اور نہیں خود دین اللہ رد کر دیا گیا۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد سوئم صفحہ ۳۴۴

(۴)

حکومت کی ضرورت اور اہمیت

و قل رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا۔ (بنی اسرائیل: ۸۰)

"اور دعا کرو کہ پروردگار' مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔"

یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں' فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں' اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقران۔ یعنی "اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا۔"
اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لئے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ

غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لئے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لئے حکومت کا طالب ہونا۔ تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضہ ہے۔[1]

یہی چیز ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں نظر آتی ہے۔ جس اخلاقی اور اصلاحی انقلاب کے وہ داعی تھے اس کے لئے اقتدار کی قوت ناگزیر تھی۔ جب حالات نے اس کا موقعہ فراہم کیا تو آپ نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اسلامی حکومت قائم کی۔ قرآن میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وقال الملک ائتونی بہ استخلصہ لنفسی فلما کلمہ قال انک الیوم لدینا مکین امین ○ قال اجعلنی علٰی خزائن الارض انی حفیظ علیم

(یوسف: ۵۴ - ۵۵)

بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس لاؤ۔ تاکہ میں ان کو اپنے لئے مخصوص کر لوں۔ جب یوسف نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر بھروسہ ہے۔" یوسف نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے' میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔"

اس سے پہلے اس سورۃ میں جو مضامین گزر چکے ہیں ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ کوئی نوکری کی درخواست نہیں تھی جو نعوذ باللہ کسی "طالب جاہ" نے وقت کے بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے پیش کر دی ہو۔ درحقیقت یہ اس انقلاب کا دروازہ کھولنے کے لئے آخری ضرب تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی طاقت سے پچھلے دس بارہ سال کے اندر نشوونما پا کر ظہور کے لئے تیار ہو چکا تھا اور اب جس کا فتح باب صرف ایک ٹھوکے ہی کا محتاج

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوم۔ صفحہ ۶۳۸

تھا۔ حضرت یوسفؑ آزمائشوں کے ایک طویل سلسلے سے گزر کر آ رہے تھے اور یہ آزمائشیں کسی گمنامی کے گوشے میں پیش نہیں آئی تھیں بلکہ بادشاہ سے لے کر عام شہریوں تک مصر کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ ان آزمائشوں میں انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ امانت، راست بازی، حلم، ضبط نفس، عالی ظرفی، ذہانت و فراست اور معاملہ فہمی میں کم از کم اپنے زمانہ کے لوگوں کے درمیان تو اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی شخصیت کے یہ اوصاف اس طرح کھل چکے تھے کہ کسی کو ان سے انکار کی مجال نہ رہی تھی۔ زبانیں ان کی شہادت دے چکی تھیں۔ دل ان سے مسخر ہو چکے تھے۔ خود بادشاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ ان کا "حفیظ" اور "علیم" ہونا اب محض ایک دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک ثابت شدہ واقعہ تھا جس پر سب ایمان لا چکے تھے۔ اب اگر کچھ کسر باقی تھی تو وہ صرف اتنی کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود حکومت کے ان اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے پر رضامندی ظاہر کریں جن کے لئے بادشاہ اور اس کے اعیان سلطنت اپنی جگہ بخوبی جان چکے تھے کہ ان سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وہ کسر تھی جو انہوں نے اپنے اس فقرے سے پوری کر دی۔ ان کی زبان سے اس مطالبہ کے نکلتے ہی بادشاہ اور اس کی کونسل نے جس طرح اسے بسرو چشم قبول کیا، وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پھل اتنا پک چکا تھا کہ اب ٹوٹنے کے لئے ایک اشارہ ہی کا منتظر تھا (تلمود کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حکومت کے اختیارات سونپنے کا فیصلہ تنہا بادشاہ ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ پوری شاہی کونسل نے بالاتفاق اس کے حق میں رائے دی تھی)

یہ اختیارات جو حضرت یوسف علیہ السلام نے مانگے اور ان کو سونپے گئے، ان کی نوعیت کیا تھی؟ ناواقف لوگ یہاں "خزائن ارض" کے الفاظ اور آگے چل کر غلہ کی تقسیم کا ذکر دیکھ کر قیاس کرتے ہیں کہ شاید یہ افسر خزانہ یا افسر مال یا قحط کمشنر یا وزیر مالیات یا وزیر غذائیات قسم کا کوئی عہدہ ہو گا۔ لیکن قرآن، بائبل اور تلمود کی متفقہ شہادت ہے کہ درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام سلطنت مصر کے مختار

کل (رومی اصطلاح میں ڈکٹیٹر) بنائے گئے تھے اور ملک کا سیاہ و سپید سب کچھ ان کے اختیار میں دے دیا گیا تھا قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر پہنچے ہیں تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام تخت نشین تھے۔ (ورفع ابویه علی العرش۔ یوسف : ۱۰۰) حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنی زبان سے نکلا ہوا یہ فقرہ قرآن میں منقول ہے کہ "اے میرے رب! تو نے مجھے بادشاہی عطا کی۔" (رب قد اتیتنی من الملک۔ یوسف : ۱۰۱) پیالے کی چوری کے موقع پر سرکاری ملازم حضرت یوسف علیہ السلام کے پیالے کو بادشاہ کا پیالہ کہتے ہیں (قالوا نفقد صواع الملک۔ یوسف : ۷۲) اور اللہ تعالیٰ مصر پر ان کے اقتدار کی کیفیت یہ بیان کرتا ہے کہ ساری سرزمین مصر ان کی تھی (یتبوا منها حیث یشاء۔ یوسف : ۵۶) رہی بائیبل تو وہ شہادت دیتی ہے کہ فرعون نے یوسفؑ سے کہا:

> "سو تو میرے گھر کا مختار ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا...... دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بناتا ہوں ...... اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ ہلائے گا اور فرعون نے یوسف علیہ السلام کا نام ضفنات فعینح (دنیا کا نجات دہندہ) رکھا۔"
>
> (پیدائش ۴۱: ۳۹۔ ۴۵)

اور تلمود کہتی ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے مصر سے واپس جا کر اپنے والد سے حاکم مصر (یوسف علیہ السلام) کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا:

> "اپنے ملک کے باشندوں پر اس کا اقتدار سب سے بالا ہے اس کے حکم پر وہ نکلتے اور اس کے حکم پر وہ داخل ہوتے ہیں۔ اس کی زبان سارے ملک پر فرماں روائی کرتی ہے کسی معاملہ میں فرعون کے اذن کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ اختیارات کس غرض کے لئے مانگے تھے؟ انہوں نے اپنی خدمات اس لئے پیش کی تھیں کہ ایک کافر حکومت کے نظام کو اس کے کافرانہ اصول و قوانین ہی پر چلائیں؟ یا ان کے پیش نظر یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے نظام تمدن و اخلاق و سیاست کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں؟ اس سوال کا بہترین جواب وہ ہے جو علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر "کشاف" میں دیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

> "حضرت یوسف علیہ السلام نے اجعلنی علی خزائن الارض جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور عدل پھیلانے کا موقع مل جائے اور وہ اس کام کو انجام دینے کی طاقت حاصل کریں جس کے لئے انبیاء بھیجے جاتے ہیں انہوں نے بادشاہی کی محبت اور دنیا کے لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی دوسرا شخص ان کے سوا ایسا نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔"

اور سچ یہ ہے کہ یہ سوال دراصل ایک اور سوال پیدا کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام آیا پیغمبر بھی تھے یا نہیں؟ اگر پیغمبر تھے تو کیا قرآن میں ہم کو پیغمبری کا یہ تصور ملتا ہے کہ اسلام کا داعی خود نظام کفر کو کافرانہ اصولوں پر چلانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرے؟ بلکہ یہ سوال اس پر بھی ختم نہیں ہوتا' اس سے بھی زیادہ نازک اور سخت ایک دوسرے سوال پر جا کر ٹھہرتا ہے' یعنی یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک راست باز آدمی بھی تھے یا نہیں؟ اگر راست باز تھے تو کیا ایک راست باز انسان کا یہی کام ہے کہ قید خانے میں تو وہ اپنی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز اس سوال سے کرے کہ "بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔" اور بار بار اہل مصر پر بھی واضح کر دے۔ کہ تمہارے ان بہت سے متفرق خود ساختہ خداؤں میں

سے ایک یہ شاہ مصر بھی ہے اور صاف صاف اپنے مشن کا بنیادی عقیدہ یہ بیان کرے کہ "فرماں روائی کا اقتدار خدائے واحد کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔" مگر جب عملی آزمائش کا وقت آئے تو وہی شخص خود اس نظام حکومت کا خادم' بلکہ ناظم اور محافظ اور پشت پناہ تک بن جائے جو شاہ مصر کی ربوبیت میں چل رہا تھا اور جس کا بنیادی نظریہ "فرماں روائی کے اختیارات خدا کے لئے نہیں بلکہ بادشاہ کے لئے ہیں" تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دور انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں' ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتار لائے تاکہ اپنے لئے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس کہ یہی کچھ مسلمانوں نے بھی کیا۔ انہیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی' مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انہیں شرم آئی' لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لئے یہ اپنے ساتھ اس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمتِ کفر کی گہرائی میں لے گرے جس کی زندگی دراصل انہیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف ایک مرد مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تنہا مجرد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے اور یہ کہ مومن کی اخلاقی طاقت (بشرطیکہ وہ اس کا استعمال جانتا ہو اور اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو) فوج اور اسلحہ اور سروسامان کے بغیر بھی ملک فتح کر سکتی ہے اور سلطنتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔"[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوئم صفحات ۴۱۱ - ۴۱۳

(۵)

تصور حاکمیت و خلافت

اسلام کا تصور حاکمیت بہت صاف اور واضح ہے۔ خدا اس کائنات کا خالق ہے اور وہی اس کا حاکم اعلیٰ بھی۔ اقتدار اعلیٰ صرف اسی کا حصہ ہے۔ انسان کی حیثیت حاکم اعلیٰ کے خلیفہ اور نمائندہ کی ہے اور سیاسی نظام کو اسی حاکم اعلیٰ کے قانون کے تابع ہونا چاہیے۔ خلیفہ کا کام حاکم اعلیٰ کے قانون کو اس کے اصل منشاء کے مطابق نافذ کرنا ہے اور نظام سیاسی کو اس کی ہدایات کے مطابق چلاتا ہے۔

یصاحبی السجن ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار ○ ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم واباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطن ط ان الحکم الا للہ ط امر الا تعبدوا الا ایاہ ط ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون○ (یوسف: ۳۹ ـ ۴۰)

"اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں' اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تقریر کا ایک حصہ ہے اور توحید اور حاکمیت

الٰہی پر بہترین تقریروں میں سے ہے۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے' یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان سے مخاطب تھے ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہو گی' کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا' اور سارے جہاں کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو اور میرے دین میں آ جاؤ' بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو' اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑ کر اپنے رب بناتے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں' مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری کے ہر شائبے کے بغیر۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم ان داتا' کسی کو خداوند نعمت' کسی کو مالک زمین اور کسی کو رب دولت یا خود مختار صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو' یہ سب خالی خولی نام ہی ہیں' ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی اور مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو اور اس نے ان میں سے کسی کے لئے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اس نے تو فرمانروائی کے سارے حقوق اور اختیارات اپنے ہی لئے مخصوص رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن ج ۲' ص ۴۰۱' ۴۰۲

(الف) وقال فرعون یایھا الملا ما علمت لکم من الٰہ غیری۔
(القصص: ۳۸)

اور فرعون نے کہا: "اے اہل دربار میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔"

اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہی تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں' کیونکہ ایسی بات صرف ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی تھی۔ اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے کیونکہ اہل مصر کے مذہب میں بہت سے معبودوں کی پرستش ہوتی تھی اور خود فرعون کو جس بنا پر معبودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ سب سے بڑی شہادت قرآن مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا۔

اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن ان ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد و خود مختار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکمیت کی مدعی ہیں۔ وہ خواہ سرچشمہ قانون اور صاحب امرو نہی کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو' بہرحال جب تک وہ یہ موقف اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ ہمارا حکم چلے گا۔ اس وقت تک ان کے اور فرعون کے موقف میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بے شعور لوگ فرعون پر لعنت بھیجتے رہیں اور ان ریاستوں کو سند جواز عطا کرتے رہیں۔ حقائق کی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی تو معنی اور روح کو دیکھے گا نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون نے اپنے لئے "الٰہ" کا لفظ استعمال کیا تھا اور یہ اسی معنی میں "حاکمیت" کی اصطلاح

استعمال کرتی ہیں۔[1]

(ج) الذی لہ ملک السموات والارض ولم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شیٔ فقدرہ تقدیرا○ (الفرقان : ۲)

"وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے' جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے' جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔"

یہاں لفظ ملک استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں بادشاہی' اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت (Sovereignty) کے لئے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختار مطلق ہے اور فرمانروائی کے اختیارات میں ذرہ برابر بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ اس بات کو مستلزم ہے کہ پھر معبود بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان جس کو بھی معبود بناتا ہے یہ سمجھ کر بناتا ہے کہ اس کے پاس کوئی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے اور ہماری قسمتوں پر اچھا یا برا اثر ڈال سکتا ہے۔ بے زور اور بے اثر ہستیوں کو ملجا و ماویٰ بنانے کے لئے کوئی احمق سے احمق انسان بھی کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ جل شانہ کے سوا اس کائنات میں کسی کے پاس بھی کوئی زور نہیں ہے تو پھر نہ کوئی گردن اس کے سوا کسی کے آگے اظہار عجز و نیاز کے لئے جھکے گی' نہ کوئی ہاتھ اس کے سوا کسی کے آگے نذر پیش کرنے کے لئے بڑھے گا' نہ کوئی زبان اس کے سوا کسی کی حمد کے ترانے گائے گی یا دعا و التجا کے لئے کھلے گی اور نہ دنیا کے کسی نادان سے نادان آدمی سے بھی کبھی یہ حماقت سرزد ہو سکے گی کہ وہ اپنے حقیقی خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت و بندگی بجا لائے' یا کسی کو بذات خود حکم چلانے کا حق دار مانے۔ اس مضمون کو مزید تقویت

---

[1] تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۶۳۷ - ۶۳۸

اوپر کے اس فقرے سے پہنچتی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اسی کے لئے ہے۔[1]

(د) لله ما فی السموات وما فی الارض ط وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه یحاسبکم به الله ط فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ط والله علیٰ کل شیء قدیر۔ (البقرہ: ۲۸۴)

"آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو خواہ چھپاؤ۔ اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے لے گا۔ پھر اسے اختیار ہے جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی اولین بنیاد خدا کی حاکیت کا عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مالک زمین و آسمان ہونا اور ان تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں' اللہ ہی کی ملک ہونا' دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لئے کوئی دوسرا طرز عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دے۔ پھر اس آیت میں جوابدہی کے تصور اور انفرادی ذمہ داری کے اصول کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان فرداً" فرداً" اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہے' دوسرے یہ کہ جس بادشاہ زمین و آسمان کے سامنے انسان جوابدہ ہے' وہ غیب و شہادت کا علم رکھنے والا ہے حتیٰ کہ دلوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں اور آخر میں اللہ کے اختیار مطلق کا بیان ہے۔ اس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبور ہو بلکہ وہ مالک مختار ہے۔ سزا دینے اور معاف کرنے

---

[1] تفہیم القرآن' جلد سوم۔ صفحہ ۲۲۳' ۲۲۴

کے کل اختیارات اس کو حاصل ہیں۔[1]

(ھ) ومصدقا لما بین یدی من التوراۃ ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم وجئتکم بایۃ من ربکم فاتقوا اللہ واطیعون ○ ان اللہ ربی وربکم فاعبدوہ ط ھذا صراط مستقیم ○ (آل عمران: ۵۰-۵۱)

"اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں' لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ لہٰذا تم اسی کی بندگی اختیار کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے:

ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ' جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے' صرف اللہ کے لئے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اس مقتدر اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو اور دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں۔

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحات ۲۲۲' ۲۲۳

پس درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مشن میں یک سرمو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیئے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدار اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح اوپر قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ مسیح علیہ السلام صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے ان کے اس ارشاد سے صاف ظاہر ہوتی ہے:

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (متی ۴:۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امر شرعی کی اسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امر تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے:

"تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔" (متی ۶:۱۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی

طرف دعوت دیتے تھے۔ ان کے متعدد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہل شہران کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس پر متی، مرقس اور لوقا تینوں کی متفقہ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا۔" اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انہوں نے جواب دیا "ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔" (لوقا ۱۳: ۳۳) آخری مرتبہ جب وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا "مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔" اس پر یہودی علماء ناراض ہوئے اور انہوں نے حضرت مسیح سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چپ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ "اگر یہ چپ رہیں گے تو پتھر پکار اٹھیں گے۔" (لوقا ۱۹: ۳۸۔ ۴۰) ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

> "اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو، سب میرے پاس آؤ، میں تم کو آرام دوں گا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو...... میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔" (متی ۱۱: ۲۸۔ ۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساختہ کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے متی اور مرقس کی اس روایت سے صاف طور پر مترشح ہوتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علماء نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یسعیاہ نبی کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ "یہ امت زبان سے تو میری تعظیم کرتی ہے مگر ان کے دل مجھ سے دور ہیں، کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔" تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا

نے توراۃ میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کہے وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمہارے کام آ سکتی تھیں انہیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں' اس کے لئے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔" (متی ۱۵ : ۳-۹- مرقس ۷ : ۵-۱۳)[1]

(و) ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستتہ ایام ثم استوٰی علی العرش قف یغشی الیل النہار ایطلبہ حثیثا لا والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ط الا لہ الخلق والامر ط تبرک اللہ رب العلمین ○ (الاعراف : ۵۴)

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر اپنے تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ' سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔"

خدا کے استوا علی العرش (تخت سلطنت پر متمکن ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی اس لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز فرما دیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر بھی فرمائی جا رہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدار فرمانروائی ہو اور اس پر متمکن ہو جانے سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے

---

[1] تفہیم القرآن ج ا- ص ۲۵۳-۲۵۶

کائنات کو پیدا کر کے اس کی زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہر حال استوا علی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو' قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالی محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کہیں بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ سلطانی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں' ہر چیز اس کے امر کی تابع ہے' ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائما" اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خود سری کی ضلالت میں۔ خدا کو کائنات کے انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھ لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ سمجھے اور ان کے آگے سر جھکا دے یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خود مختار بن بیٹھے۔

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ قرآن مجید میں خدا اور خلق کے تعلق کو واضح کرنے کے لئے انسانی زبان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ' مصطلحات' استعارے اور انداز بیان انتخاب کئے گئے ہیں جو سلطنت و بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن کو پڑھتا ہو اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی "تصنیف" ہے۔ اس زمانہ میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام کا تسلط تھا اس لئے مصنف نے (جس سے مراد ان ظالموں کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں پادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور حاکمیت (Sovereignty) جس شے کا نام ہے وہ اسی ذات کے لئے مخصوص

ہے اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے' لہٰذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے انسان کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو مذہبی معنوں میں واحد معبود بھی مانے اور سیاسی و تمدنی معنوں میں واحد سلطان (Sovereign) بھی تسلیم کرے۔

لہ الخلق والامر کے الفاظ سے اسی مضمون کی مزید تشریح کی گئی ہے جو "استوا علی العرش" کے الفاظ میں مجملاً" بیان کیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے۔ بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیل و نہار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے' جب چاہے اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔ سورج اور چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل مسخر ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کئے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔[1]

(ز) ان اللہ یحکم مایرید (المائدہ:۱)

"بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔"

یعنی اللہ حاکم مطلق ہے اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے بندوں کو اس کے احکام میں چون و چرا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں۔ لیکن بندہ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۳۶۔۳۷

نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مصلحت سمجھتا ہے بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حاکم ہے جو چیز اس نے حرام کر دی ہے وہ صرف اس لئے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے۔ وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ اشیاء کی حرمت و حلت کے لئے مالک کی اجازت و عدم اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً" کوئی ضرورت نہیں اور اسی طرح بندے کے لئے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خدا جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز۔[1]

(ک) ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلل و ھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ط ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون ط ○

(النحل: ۱۱۶)

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔"

یہ آیت صاف تصریح کرتی ہے کہ خدا کے سوا تحلیل و تحریم کا حق کسی کو بھی نہیں، یا بالفاظ دیگر قانون ساز صرف اللہ ہے۔ دوسرا جو شخص بھی جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنے کی جرات کرے گا وہ اپنی حد سے تجاوز کرے گا، الا یہ کہ وہ قانون الٰہی کو سند مان کر اس کے فرامین سے استنباط کرتے ہوئے یہ کہے کہ فلاں چیز یا فلاں فعل جائز ہے اور فلاں ناجائز۔

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۳۸

اس خود مختارانہ تحلیل و تحریم کو اللہ پر جھوٹ اور افترا اس لئے فرمایا گیا کہ جو شخص اس طرح کے احکام لگاتا ہے' اس کا یہ فعل دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جسے وہ کتاب الٰہی کی سند سے بے نیاز ہو کر جائز و ناجائز کہہ رہا ہے اسے خدا نے جائز یا ناجائز ٹھہرایا ہے یا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ نے تحلیل و تحریم کے اختیارات سے دست بردار ہو کر انسان کو خود اپنی زندگی کی شریعت بنانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے جو دعویٰ بھی وہ کرے وہ لامحالہ جھوٹ اور اللہ پر افترا ہے۔[1]

(ل) قل ارئیتم ما انزل اللہ لکم من رزق فجعلتم منہ حرام و حلال ط قل اللہ اذن لکم ام علی اللہ تفترون۔ (یونس: ۵۹)

"اے نبی! ان سے کہو تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لئے اتارا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرا لیا' ان سے پوچھو اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افتراء کر رہے ہو؟"

اردو زبان میں رزق کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دسترخوان کی چھوٹی سی دنیا میں مذہبی اوہام یا رسم و رواج کی بنیاد پر لوگوں نے کر ڈالی ہے۔ اس غلط فہمی میں جہلاء یا عوام ہی نہیں' علماء تک مبتلا ہیں۔ حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوراک تک محدود نہیں ہے بلکہ عطا اور بخشش اور نصیب کے معنوں میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے وہ سب اس کا رزق ہے حتیٰ کہ اولاد تک رزق ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں بکثرت راویوں کے نام رزق اور رزیق اور رزق اللہ ملتے ہیں جس کے معنی تقریباً" وہی ہیں جو

---

[1] تفہیم القرآن۔ جلد دوم صفحہ ۵۷۸

اردو میں اللہ دینے کے معنی ہیں۔ مشہور دعا ہے ----- اللھم ارنا الحق وارزقنا اتباعہ' یعنی ہم پر حق واضح کر اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق دے۔ محاورے میں بولا جاتا ہے رزق علماء' فلاں شخص کو علم دیا گیا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق اور اس کی مدت عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں رزق سے مراد صرف وہ خوراک ہی نہیں ہے جو اس بچے کو آئندہ ملنے والی ہے بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اسے دنیا میں دیا جائے گا۔ خود قرآن میں ہے ومما رزقنھم ینفقون (البقرہ : ۳) جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں' پس رزق کو محض دسترخوان کی سرحدوں تک محدود سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان پابندیوں اور آزادیوں پر اعتراض ہے جو کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں لوگوں نے بطور خود اختیار کرلی ہیں' سخت غلطی ہے اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ اس کی بدولت خدا کے دین کی ایک بہت بڑی اصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ یہ اسی غلطی کا تو نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کا معاملہ تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے لیکن تمدن کے وسیع تر معاملات میں اگر یہ اصول طے کرلیا جائے کہ انسان خود اپنے لئے حدود مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے اور اسی بنا پر خدا اور اس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کی جانے لگے تو عامی تو درکنار علمائے دین و مفتیان شرع متین اور مفسرین قرآن و شیوخ حدیث تک کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی دین سے اسی طرح ٹکراتی ہے جس طرح ماکولات و مشروبات میں شریعت الٰہی سے بے نیاز ہو کر جائز و ناجائز کے حدود بطور خود مقرر کرلینا۔

پھر فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ کتنا سخت باغیانہ جرم ہے جو تم کر رہے ہو۔ رزق اللہ کا ہے اور تم خود اللہ کے ہو' پھر یہ حق آخر تمہیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ اللہ کی املاک میں اپنے تصرف' استعمال اور انتفاع کے

لئے خود حد بندیاں مقرر کرو؟ کوئی نوکر اگر یہ دعویٰ کرے کہ آقا کے مال میں اپنے تصرف اور اختیارات کی حدیں اسے خود مقرر کر لینے کا حق ہے اور اس معاملہ میں آقا کے کچھ بولنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں' تو اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ تمہارا اپنا ملازم اگر تمہارے گھر میں اور تمہارے گھر کی سب چیزوں میں اپنے عمل اور استعمال کے لئے اس آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے تو تم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرو گے؟ --------- اس نوکر کا معاملہ تو دوسرا ہی ہے جو سرے سے نہیں مانتا کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور کوئی اس کا آقا بھی ہے اور یہ کسی اور کا مال ہے جو اس کے تصرف میں ہے۔ اس بدمعاش غاصب کی پوزیشن یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ یہاں سوال اس نوکر کی پوزیشن کا ہے جو خود مان رہا ہے کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ مال اسی کا ہے جس کا وہ نوکر ہے اور پھر کہتا ہے کہ اس مال میں اپنے تصرف کے حقوق مقرر کر لینے کا حق مجھے آپ ہی حاصل ہے اور آقا سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ تمہاری یہ پوزیشن صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی کہ آقا نے خود تم کو مجاز کر دیا ہو تاکہ میرے مال میں تم جس طرح چاہو تصرف کرو' اپنے عمل اور استعمال کے حدود' قوانین' ضوابط سب کچھ بنا لینے کے جملہ حقوق میں نے تمہیں سونپے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا تمہارے پاس واقعی اس کی کوئی سند ہے کہ آقا نے تم کو یہ اختیارات دے دیئے ہیں یا تم بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ وہ تمام حقوق تمہیں سونپ چکا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم وہ سند دکھاؤ ورنہ بصورت دیگر یہ کھلی بات ہے کہ تم بغاوت پر جھوٹ اور افترا پردازی کا مزید جرم کر رہے ہو۔[1]

(ج) ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الكفرون ○ ....

---

[1] تفہیم القرآن جلد پنجم۔ صفحات ۲۹۳ تا ۲۹۴

(ج) الظالمون......... الفاسقون.... (المائدہ: ۴۴-۴۵-۴۷)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں........ ظالم ہیں......... فاسق ہیں........"

یہاں اللہ تعالٰی نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں' دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں' تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے' وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً" اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً" اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے' کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا' اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً" انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے درجات و مراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً" حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر' ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم الٰہی سے انحراف اختیار کر لیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر' ظالم اور

فاسق ہے اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان و اسلام اور کفر و ظلم و فسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لئے کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل ان کانت لہم کل مرۃ ولکم کل حلوۃ کلا واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراک۔** (کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لئے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لئے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لئے! ہرگز نہیں، خدا کی قسم تم انہی کے طریقہ پر قدم بہ قدم چلو گے۔"[1]

حاکمیت الٰہی کا یہی اصل الاصول ہے جس پر قرآن میں جگہ جگہ گفتگو کی گئی ہے۔ خدا کے سوا جس کو بھی مختار مطلق مانا جائے گا اس کی حیثیت قرآن کی اصطلاح میں طاغوت کی ہے اور یہ بندگی الٰہی کی ضد ہے۔

(ت) **فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لہا ط واللہ سمیع علیم** (البقرہ: ۲۵۶)

"اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

---

[1] تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۴۷۵۔۴۷۶

"طاغوت" لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً" اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے اور مگر عملاً" اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اصولاً" منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے' یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے اسی کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔[1]

ایک دوسری آیت پر غور کیجئے۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم امنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ط

(النساء: ٦٠)

"اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔"

یہاں صریح طور پر "طاغوت" سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحہ ١٩٦۔١٩٧

دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت "طاغوت" کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلے کے لئے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم و ملزوم ہیں اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔[1]

مندرجہ بالا بحث سے قرآن کا تصور حاکمیت واضح ہو جاتا ہے۔ اس تصور کے لحاظ سے حاکمیت میں انسان کا سرے سے کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیتا ہے اور اس نائب کا اصل مشن یہ بتاتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنے مالک کے حکم کے مطابق کام کرے۔ اسی چیز کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

واذقال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ ط

(البقرہ: ۳۰)

جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ وہ مالک نہیں ہوتا' بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے' بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا' بلکہ اس کا کام مالک کے منشا

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحہ ۳۷۶

کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے، تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔ [۲]

۲۔ تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحہ ۶۲

(۶)

اصول اطاعت و وفاداری

مندرجہ بالا تصور حاکمیت و خلافت کا فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ اطاعت اور وفاداری کا مرجع بھی خالق اور اس کی ہدایات ہوں اور ریاست میں باقی تمام وفاداریاں اسی بنیادی وفاداری کی تابع ہوں۔ اس اصول کی وضاحت قرآن نے اس طرح کی ہے:

یایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ج فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ط ذلک خیر و احسن تاویلا ○ (النساء: ۵۹)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو' اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔"

یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی' تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اولین دفعہ ہے۔ اس میں حسب ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں۔

۱۔ اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندہ خدا ہے' باقی جو کچھ بھی ہے اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی اور

مسلمانوں کے اجتماعی نظام' دونوں کا مرکز و محور خدا کی فرماں برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدمقابل نہ ہوں' بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقہ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعت خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسول اس لئے مطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اسی طریقہ سے کر سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعت خدا رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے: من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ "جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔" اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔

۳۔ مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان "اولی الامر" کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ "اولی الامر" کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں' خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر' یا ملکی انتظام کرنے والے حکام' یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج یا تمدنی و معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں

اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے اور ان سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے' بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا و رسول کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں ان اطاعت کے لئے لازمی شرطیں ہیں اور یہ نہ صرف آیت مذکورہ صدر میں صاف طور پر درج ہیں بلکہ حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً" حسب ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

السمع والطاعة على المرء المسلم فى اما احب وكره مالم يومر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔ (بخاری و مسلم)

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند' تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے ار جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہیے نہ ماننا چاہیے۔

لا طاعته فى معصية' انما الطاعة فى المعروف۔ (بخاری و مسلم)

خدا اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے "معروف" میں ہے۔

يكون عليكم امراء تعرفون وتنكرون' فمن انكر فقد برى ومن كره فقد سلم ولكن من رضى و تابع؟ فقالوا افلا نقاتلهم؟ قال لا ما صلوا۔

(مسلم)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہو گا۔ صحابہ نے پوچھا' پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ

نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔"
یعنی ترک نماز وہ علامت ہو گی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعت خدا اور رسول سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر ان کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہو گا۔

شرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم۔ قلنا یا رسول اللہ افلا ننابذھم عند ذالک؟ قال لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ۔ (مسلم)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لئے مبغوض ہوں اور تم ان کے لئے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں۔" فرمایا "نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں، نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔"

اس حدیث میں اوپر والی شرط کو اور واضح کر دیا گیا ہے۔ اوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابند نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم اقامت صلوۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ ان کی حکومت اپنی اصلی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے الٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لئے جائز ہو جائے گی۔
اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہم

سے من جملہ اور باتوں کے ایک اس امر کا عہد بھی لیا کہ ان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بوحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔ یعنی یہ "کہ ہم اپنے سرداروں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے' الا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے دلیل موجود ہو۔" (بخاری و مسلم)

۴۔ چوتھی بات جو آیت زیر بحث میں ایک مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہو گی اس میں فیصلہ کے لئے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہو گا اس کے سامنے سب سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو سند اور مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے ممیز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائل زندگی کے فیصلے کے لئے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف کیسے رجوع کیا جا سکتا ہے جب کہ میونسپلٹی اور ریلوے اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ اصول دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعی ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اسکے رب نے اسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول اور قوانین و ضوابط

کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملہ میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرتا ہے' پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اسی صورت میں آزادی عمل برتتا ہے اور اس کی یہ آزادی عمل اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادی عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔

۵- پھر اس آیت کی رو سے مسلمان اپنے اولی الامر سے نزاع کا حق رکھتے ہیں اور نزاع کی صورت میں فیصلہ جس چیز پر چھوڑا جائے گا وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہو گی۔ یہ آخری سند جس کے حق میں بھی فیصلہ دے اسے ماننا پڑے گا۔ خواہ فیصلہ اولی الامر کے حق میں ہو یا رعایا کے حق میں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لئے کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہئے جس کے پاس نزاع لے جائی جائے اور جس کا کام یہ ہو کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ یہ ادارہ خواہ کوئی مجلس علماء ہو یا سپریم کورٹ یا کوئی اور' اس کے تعین کی کسی خاص شکل پر شریعت نے ہمیں مجبور نہیں کر دیا ہے۔ مگر بہرحال ایسا کوئی ادارہ مملکت میں ہونا چاہئے اور اس کی یہ حیثیت خاص ہونی چاہئے کہ انتظامیہ اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام اور فیصلوں کے خلاف .... اس کے پاس مرافعہ کیا جا سکے اور اس کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ کتاب و سنت کی ہدایات کے مطابق وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔

مزید برآں قرآن مجید چونکہ محض کتاب آئین ہی نہیں ہے بلکہ کتاب تعلیم و تلقین اور صحیفہ وعظ و ارشاد بھی ہے' اس لئے پہلے فقرے میں جو قانونی اصول بیان کیے گئے تھے' اب اس دوسرے فقرے میں ان کی حکمت و مصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ مذکورہ بالا چاروں اصولوں کی پیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ اور ان اصولوں سے

انحراف' یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظام زندگی کو تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری بھی ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دنیا میں صراط مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی درست ہو سکتی ہے۔ یہ نصیحت ٹھیک اس تقریر کے خاتمہ پر ارشاد ہوئی ہے جس میں یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک نہایت لطیف طریقہ سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری پیش رو امت دین کے ان بنیادی اصولوں سے منحرف ہو کر جس پستی میں گر چکی ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ جب کوئی گروہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کو پس پشت ڈال دیتا ہے' اور ایسے سرداروں اور رہنماؤں کے پیچھے لگ جاتا ہے جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان نہ ہوں اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حاکموں سے کتاب و سنت کی سند پوچھے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے تو وہ ان خرابیوں میں مبتلا ہونے سے کسی طرح بچ نہیں سکتا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحہ ۳۶۳۔۳۶۷

باب ۴

معنی خلافت

اسلام کے سیاسی نظریہ ہی میں نہیں اس کے پورے نظام حیات میں انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کو ایک مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ پچھلے ابواب میں اسلام کے سیاسی فلسفہ پر جو گفتگو کی گئی ہے اس میں بھی اس تصور کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ لغت اور قرآن کے استعمالات کی روشنی میں اس لفظ کے معنی کی پوری پوری تحقیق کی جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ایک گروہ اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ لوگوں کو باور کرائے کہ خلافت کے معنی نیابت نہیں بلکہ جانشینی ہے اور قرآن میں اس لفظ سے مراد انسان کو اختیارات کی تفویض اور دنیا کے انصرام کے لئے حق نیابت نہیں بلکہ زمین پر انسان کی آمد سے پہلے جو مخلوق یہاں بستی تھی اس کی جانشینی ہے۔ یہ استدلال منکرین حدیث کی طرف سے خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس گروہ کے ایک سرخیل نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آدم علیہ السلام کو جو خلافت اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھی وہ اس معنی میں نہ تھی کہ اللہ نے ان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تھا' بلکہ اس معنی میں تھی کہ ان کو اپنے سے پہلے ساکنان زمین کا جانشین بنایا گیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ خلافت کے معنی صرف جانشینی کے ہیں' اس لئے خلافت الٰہیہ کا تصور بے معنی ہے۔ اس نادر استدلال کو متجددین' منکرین حدیث اور لادینیت کے علمبردار بار بار پیش کرتے رہے ہیں اور چونکہ اب بھی کبھی کبھی یہ آوازیں سنائی دیتی ہیں اس لئے اس مسئلہ کا صاف ہو جانا بہت ضروری ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے ترجمان القرآن میں اس طرز استدلال پر گرفت کی تھی۔ ایک دوسرے اہل قلم نے مولانا کے جواب پر تعاقب کیا جس کے جواب میں مولانا مودودی نے یہ مضمون لکھا جو ترجمان القرآن کے ذی القعدہ ۱۳۵۲ مطابق فروری ۱۹۳۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

مرتب

معنی خلافت

خلافت کی بحث میں سب سے پہلے ہم کو لغت عرب کی طرف رجوع کر کے یہ تحقیق کرنا چاہئے کہ کیا فی الواقع عربی زبان میں اس لفظ کے معنی صرف "جانشینی" ہی کے ہیں یا اس کے معنی نیابت کے بھی آتے ہیں۔

لغوی بحث

امام راغب اصفہانی اپنی مفردات میں لکھتے ہیں:

والخلافت نیابة عن الخیر اما لغیبة المنوب عنه و امالموته واما لعجزة واما لتشریف المستخلف۔

خلافت کسی دوسرے کی نیابت ہے' خواہ منوب عنہ' کے غائب ہونے کی وجہ سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے عجز کے سبب سے یا اس شخص کو بزرگی عطا کرنے کے لئے جسے خلیفہ بنایا گیا ہے۔

لین (Lane) نے اپنی مشہور لغت مدالقاموس (Arabic English Lexicon) میں لفظ خلیفہ کے معنی (Successor) کے علاوہ (Vicegerent) کے بھی لکھے ہیں۔

خلافت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ منوب عنہ مرجائے یا موجود نہ ہو۔ امام راغب لکھتے ہیں خلف فلان فلانا قام بالامر عنه اما معه و اما بعده۔ "فلاں شخص فلاں شخص کا خلیفہ ہوا یعنی اس کی طرف سے کارپرداز ہوا خواہ اس کے ساتھ یا اس کے بعد۔"

اس مادے سے جو ابواب مشتق ہوئے ہیں ان کی خاصیتوں سے اس کے معنی میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔

خلف خلافة کے معنی خلیفہ ہونے یا بعد میں آنے یا پیچھے رہنے کے ہیں۔ خلفه خلافة کان خلیفته وبقی بعده وجاء بعده۔ (تاج العروس) قرآن مجید میں ہے۔ فخلف من بعدهم خلف ورثوا الکتاب (اعراف : ۱۶۹) یعنی "ان کے بعد ایسے ناخلف آئے یا ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث ہوئے۔" وقال موسیٰ لاخیه هارون اخلفنی فی قومی (اعراف : ۱۴۲) "اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تو میری قوم کے اندر میرے بعد میرا جانشین یا نائب ہو۔" قال بئسما خلفتمونی من بعدی۔ (اعراف : ۱۵۰) "موسیٰ نے کہا کہ میرے بعد تم نے میری بہت بری نیابت کی۔" ولو نشاء لجعلنا منکم ملئکة فی الارض یخلفون (الزخرف : ۶۰) "اگر ہم چاہیں تو زمین میں تم میں سے ملائکہ پیدا کریں جو تمہاری جگہ آباد ہوں۔"

تخلف کے معنی پیچھے رہ جانے کے ہیں۔ ما کان لاهل المدینة و من حولهم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول الله (التوبہ : ۱۲۰)

اخلف کے معنی کھوئی ہوئی چیز واپس دینے یا دلانے یا اس کا بدل عطا کرنے کے ہیں اخلف الله لک وعلیک خیرا ای ابدلک بما ذهب عنک و عوضک عنه (نہایہ ابن اثیر) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وما انفقتم من شیء فهو یخلفه وهو خیر الرازقین (سبا : ۳۹) "جو تم خرچ کرو گے اللہ اس کا نعم البدل تم کو دے گا اور وہ بہترین رازق ہے۔" حدیث میں ہے تکفل الله للغازی ان یخلف نفقته "اللہ نے غازی کے لئے ذمہ لیا ہے کہ جو کچھ وہ خرچ کرے گا اللہ اس کا بدل عطا کرے گا۔"

خلف اور استخلف کے معنی اپنا خلیفہ بنانے کے ہیں' یقال خلف فلانا اذ جعله خلیفته کاستخلفه (تاج العروس)

استخلف کہ کر اگر منوب عنہ کی تصریح نہ کی گئی ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ اپنا

خلیفہ بنایا' استخلف فلانا ای جعلہ خلیفۃ لہ اور اگر منوب عنہ کی تصریح ہو تو پھر معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص کا جانشین بنایا جس کا ذکر کیا گیا ہے' استخلف فلانا من فلان ای جعلہ مکانہ (اقرب الموارد) پس جہاں قرآن مجید نے محض استخلاف کا ذکر کیا ہے اور مستخلف لہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا مثلاً" لیستخلفنم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم (النور : ۵۵) ایسے مقامات پر استخلاف کے معنی یہی ہوں گے کہ اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا۔ اور جہاں مستخلف لہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں معنی یہ ہوں گے کہ دوسرے کی جگہ یا دوسرے کے بعد خلیفہ بنایا۔ لیکن واضح رہے کہ جب کبھی پچھلے نائب کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نائب مقرر کرنے کا ذکر کیا جائے گا تو اس میں دونوں مفہوم شامل ہوں گے یعنی اس کا مفہوم یہ بھی ہو گا کہ حاکم اعلیٰ نے فلاں شخص کو فلاں شخص کی جگہ مقرر کیا اور یہ بھی کہ اس نے فلاں شخص کے بعد فلاں شخص کو اپنا نائب مقرر کیا۔ مثلاً" اگر کہا جائے کہ استخلف الملک اللورد اردن بعد اللورد ریڈنک فی ولایۃ الہند تو اس کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ بادشاہ نے لارڈ ارون کو لارڈ ریڈنگ کے بعد اس کی جگہ ہندوستان کا وائسرائے بنایا اور یہ بھی ہوں گے کہ اس نے ارون کو ریڈنگ کے بعد ہندوستان کی ولایت میں اپنا وائسرے مقرر کیا۔ ان دونوں مفہوموں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے کہ بیک وقت صادق نہ آسکیں پس ان یشا یذہبکم و یستخلف من بعدکم ما یشاء کا یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو دے دے گا اور یہ بھی کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو اپنا خلیفہ بنا لے گا۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے کوئی امران دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں مفہوم لینے میں مانع نہیں ہے۔

جعلہ خلیفۃ کے معنی صرف خلیفہ بنانے کے ہیں۔ خلیفہ کے معنی خواہ نائب کے ہوں یا جانشین کے' دونوں صورتوں میں اس کا مفہوم ایک اضافی مفہوم ہے اور اس کا اتمام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ کوئی مستخلف لہ اور منوب عنہ بھی ہو' عام اس سے مقدر ہو یا مذکور۔ پس جس جگہ جعل خلیفہ کے ساتھ قرآن مجید نے

مستخلف لہ کی تصریح کر دی ہے وہاں تو مفہوم واضح ہے۔ مثلاً" واذکروا از جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح (اعراف : ۶۹) اور واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم عاد (اعراف : ۷۴) اور ثم جعلنکم خلئف فی الارض من بعد ھم لننظر کیف تعملون (یونس : ۱۴) لیکن جہاں مستخلف لہ کی طرف قطعاً" کوئی اشارہ نہیں ہے وہاں ایک مستخلف لہ مقدر ماننا پڑے گا' مثلاً" یاداؤد انا جعلنک خلیفۃ فی الارض (ص : ۲۶) اور ویجعلکم خلفاء الارض (النمل : ۶۲) اور وھو الذی جعلکم خلئف الارض (انعام : ۱۶۵) اور انی جاعل فی الارض خلیفۃ (بقرہ : ۳۰) اس طرح کی تمام آیات کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں انسان یا انسانوں کو کس کا خلیفہ بنانے کا ذکر ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ پچھلی مخلوقات یا گزشتہ اقوام' یا شاہان پیشین کا خلیفہ' تو قطع نظر اس سے کہ یہ ایک تکلف ہے' بعض آیتوں میں یہ معنے کھپتے ہی نہیں۔ مثال کے طور پر ویجعلکم خلفاء الارض میں خلفاء کو زمین کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ زمین کے خلفاء ہے۔ اس سے یہ معنے نکالنے کی کہاں گنجائش ہے کہ زمین پر پہلے جو لوگ متمکن تھے ان کے خلفاء؟ پھر انی جاعل فی الارض خلیفۃ کے معنی اگر یہ لئے جائیں کہ "میں پچھلے ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں ان ساکنین ارض کا ذکر کیا ہے جن کی خلافت انسان کے سپرد کی گئی ہے؟ اگر کیا ہے تو حوالہ پیش کیجئے۔ اگر نہیں کیا تو فرمایئے کہ ایسی صورت میں محض زبان اور ادب کے نقطہ نظر سے اس فقرے کا یہ مفہوم زیادہ اقرب الی الفہم ہے کہ "میں پچھلے مجہول الحال ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" یا یہ کہ "میں زمین میں اپنا ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں؟" اگر سامع صرف عربی جانتا ہو اور ان عقلی مقدمات سے ناآشنائے محض ہو جنہیں مولانا .... نے ترتیب دے کر ایک نتیجہ اخذ کیا ہے' تو اس فقرے کو سن کر وہ ان دونوں معنوں میں سے کون سے معنی مراد لے گا؟

خلافت میں فرماں روائی کا مفہوم

اس لغوی تحقیق کے بعد میں آپ کو دعوت دوں گا کہ آپ خلافت کے اس مفہوم پر غور کیجئے جس کو خود آپ نے اور مولانا ...... نے مراد لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

"خلافت فی الارض سے مراد زمین کی سلطنت و حکومت کی جانشینی ہے۔"

مولانا .... انی جاعل فی الارض خلیفة کا ترجمہ "میں زمین میں ایک بادشاہ بنانے والا ہوں۔" کرتے ہیں اور اس پر نوٹ لکھتے ہیں:

"حضرت آدم اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے بجائے بادشاہ بنائے گئے تھے۔"

غور فرمایئے کہ خلافت کے معنی تو محض جانشینی یا قائم مقامی یا بعد میں آنے کے ہیں۔ پھر اس میں بادشاہی اور فرمانروائی کا مفہوم کہاں سے آ گیا؟ اگر نفس خلافت اس مفہوم سے خالی ہے اور یقیناً خالی ہے تو اس میں یہ مفہوم اس اعتبار ہی سے آ سکتا ہے کہ خلیفہ کو خلافت کسی فرمانروا اور کسی سلطان سے ملی ہو۔ پھر جب انسان کو وہ خلافت ملی جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق سلطنت و فرمانروائی کی جھلک ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ انسان جس کا خلیفہ ہوا وہ کوئی فرمانروا تھا۔ اب فرمایئے کہ کیا قرآن سے علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر کوئی ایسی مخلوق تھی جس میں فرمانروائی کی شان تھی؟ فرمانروائی کے لئے علم، حکمت، اختیار، ارادہ، قدرت وغیرہ صفات کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ ان کے بغیر زمین اور اس کی موجودات پر فرمانروائی نہیں ہو سکتی۔ علمی تحقیقات نے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کرہ خاکی پر انسان سے پہلے کوئی مخلوق ایسی موجود نہ تھی جو ان صفات سے متصف ہوتی۔ اسی کی تصدیق قرآن بھی کرتا ہے۔ وہ ہم کو بتاتا ہے کہ انسان سے پہلے خدا کی جو مخلوق سب سے افضل تھی یعنی ملائکہ جن کو عباد مکرمون۔ (الانبیاء: ۲۶) کہا گیا ہے۔ اس کا بھی یہ حال تھا کہ وہ علم اشیاء سے بے خبر تھی ثم عرضھم علی الملئکة فقال انبؤنی باسماء ھؤلاء ان کنتم صدقین ○ قالوا سبحنک

لا علم لنا الا ما علمتنا۔ (بقرہ: ۳۱-۳۲) اور ارادہ و اختیار کی آزادی سے بالکل محروم تھی لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون۔ (التحریم: ۶) دوسری مخلوق جن تھے' سو ان کے متعلق کوئی بات قرآن مجید نے ایسی بیان نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ ان کو زمین کی فرمانروائی حاصل تھی۔ رہے حیوانات و نباتات و جمادات' تو ان کا حال آپ جانتے ہیں۔ پھر آخر وہ کون سی مخلوق تھی جس کی خلافت' زمین کی فرمانروائی کے اعزاز کے ساتھ انسان کو حاصل ہوئی؟

تاہم اگر مان لیا جائے کہ یہ پرانے ساکنین ارض ہی کی خلافت ہے اور وہ ساکنین ارض انسان سے پہلے زمین کے فرمانروا تھے' تو کیا وہ بالاصالت فرمانروا تھے' یا ان کی فرمانروائی بھی نائبانہ تھی؟ پہلی شق تو آپ اختیار نہیں کر سکتے' کیونکہ اسلامی عقیدہ کی رو سے بالاصل اور بالذات فرمانروا صرف حق تعالیٰ ہے اور اس کے سوا سب کی فرمانروائی محض عطائی ہے۔ اب رہی دوسری شق تو اس کو اختیار کرنے کی صورت میں یا تو آپ کو خلافت در خلافت کا ایک لامتناہی سلسلہ ماننا پڑے گا' یا پھر یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ فرمانروائی کی شان خواہ یکے بعد دیگرے کتنے ہی خلفاء کو ملی ہو' بہرحال اس کا سرچشمہ وہی ذات حق تعالیٰ ہے اور خلافت میں بادشاہی کی جھلک اسی وقت آ سکتی ہے جب کہ وہ خلافت الٰہی ہو۔

قرآنی اشارات

اب میں آپ کو ان قرآنی اشارات کی طرف توجہ دلاؤں گا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جس خلافت سے سرفراز کیا گیا ہے وہ دراصل خلافت الٰہی ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین: ۴) اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا' قال یا بلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی (ص: ۷۵) اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی' ثم سوہ ونفخ فیہ من روحہ (السجدہ: ۹) اس کو علم کی نعمت سے سرفراز کیا' وعلم ادم الاسماء کلھا (البقرہ: ۳۱) زمین و آسمان کی ساری چیزوں کو اس کے

حق میں مسخر کر دیا' وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منه (الجاثیه : ۱۳)

ان صفات کے ساتھ جب انسان کی تخلیق پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔ یہ حکم سورہ ص کے آخر میں جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ خاص طور پر قابل غور ہے۔

اذ قال ربک للملئکة انی خالق بشرا من طین ○ فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعوا له ساجدین ○ فسجد الملئکة کلهم اجمعون ○ الا ابلیس ط استکبر و کان من الکفرین ○ قال یا ابلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی ط استکبرت ام کنت من العالین ○ قال انا خیر منه ط خلقتنی من نار و خلقته من طین ○ قال فاخرج منها فانک رجیم۔
(ص : ۷۱-۷۷)

جبکہ تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں' پس جب میں اس کو پورا بنا لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ چنانچہ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ گھمنڈ میں پڑ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس کس چیز نے تجھے اس ہستی کو سجدہ کرنے سے منع کیا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ تو نے اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا ہے یا واقعی تو کچھ بڑے لوگوں میں سے ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تو یہاں سے تو نکل جا کیونکہ تو مردود ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یعنی وہ قدرت

اور صنعت الٰہی کا مظہر اتم تھا اور اس کے اندر خود اپنی طرف سے ایک خاص روح پھونکی تھی اور ایک محدود پیمانے پر اس میں وہ صفات پیدا کر دی تھیں جو بدرجہ فوق التمام خود باری تعالٰی میں پائی جاتی ہیں۔ اس شان اور ان صفات پر انسان کو پیدا کرنے کے بعد اعلان کیا گیا کہ ہم اس کو زمین میں خلیفہ بنانے والے ہیں' جیسا کہ سورہ بقرہ کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرشتوں نے اس معاملہ میں کچھ اپنے شکوک پیش کئے تو اللہ تعالٰی نے ان کے سامنے انسان کی سب سے افضل صفت یعنی علم کا مظاہرہ کرایا۔ اس طرح جب خلافت کے لئے انسان کی اہلیت ثابت کر دی گئی تو فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی خلافت تسلیم کرو اور علامت تسلیم کے طور پر اسے سجدہ کرو۔ تمام فرشتوں نے اسے تسلیم کیا اور سربسجود ہو گئے' مگر شیطان نے اس کی خلافت ماننے سے انکار کیا' اس لئے اس کو راندہ درگاہ کر دیا گیا۔

یہ تمام اشارات کیا ظاہر کر رہے ہیں؟ تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ عام مقابلہ میں اس کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہماری صفات کا مظہر اتم ہے ہم نے اس میں اپنی طرف سے ایک خاص روح پھونکی ہے۔ حکم ہوتا ہے اور وہ بھی کس کو؟ فرشتوں کو کہ اس کو سجدہ کرو۔ ان سب باتوں کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم اس کو خلیفہ بنانے والے ہیں۔ ان تیاریوں کے ساتھ جس خلیفہ کی خلافت کا اعلان کیا گیا' کیا وہ محض پرانے ساکنین ارض ہی کا خلیفہ تھا؟ اگر صرف بات اتنی ہی تھی کہ پرانے بسنے والوں کی جگہ کسی دوسرے کو بسایا جا رہا تھا تو اس کے لئے فرشتوں کے سامنے اس کی خلافت کا اعلان کرنے اور یوں اس کی فضیلت کا مظاہرہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ملائکہ کو یہ حکم کیوں دیا گیا کہ اس کرہ خاکی کے نو آباد کار کو' جو فقط دوسرے لوگوں کی جگہ لینے کے لئے جا رہا تھا' سجدہ کریں؟

خلافت الٰہی سے مراد کیا ہے؟

دوسری بات جو قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ارشاد ہوئی ہے' خلافت الٰہی

کے مفہوم پر صاف روشنی ڈالتی ہے۔ فرمایا:

انا عرضنا الا مانة علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان ط انه کان ظلوما جهولا۔

(احزاب: ۷۲)

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے' اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور انجام سے بے خبر نکلا۔

اس آیت میں بار امانت سے مراد اختیار (Freedom of Choice) اور زمہ داری و جواب دہی (Responsibility) ہے اور ارشاد الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں میں اس بار کو اٹھانے کی تاب نہ تھی' انسان سے پہلے کوئی مخلوق ایسی نہ تھی جو یہ پوزیشن قبول کر سکتی۔ آخر کار انسان آیا اور اس نے یہ بار اٹھا لیا۔ اس بیان سے متعدد نکات نکلتے ہیں:

۱۔ انسان سے پہلے زمین و آسمان میں کوئی مخلوق بار امانت کی حامل نہیں تھی۔ انسان پہلی مخلوق ہے جس نے یہ بار اٹھایا ہے۔ لہٰذا منصب امانت میں وہ کسی مخلوق کا جانشین (Successor) نہیں ہے۔

۲۔ جس چیز کو سورہ بقرہ میں خلافت کہا گیا ہے وہی چیز یہاں امانت کے لفظ سے تعبیر کی گئی ہے۔ کیونکہ وہاں فرشتوں پر ثابت کیا گیا تھا کہ تم خلافت کے اہل نہیں ہو' اس کا اہل انسان ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی مخلوق ہماری امانت کا بار اٹھانے کی اہل نہ تھی' صرف انسان اس کا متحمل ہوا۔

۳۔ خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ نظام عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے۔ مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ

(Delegated) ہے۔ لہٰذا اللہ نے اس کے اختیارات مفوضہ (Delegated Power) کو امانت سے تعبیر کیا ہے' اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ کو استعمال کرتا ہے اسے خلیفہ (Vicegerent) کہا ہے۔ اس تشریح کے مطابق خلیفہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔"

(Person Excercising Delegated Powers)

باب ۵

اسلامی تصور قومیت

☐ اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم

تقسیم ملک سے پہلے متحدہ ہندوستان کے سیاسی مباحث میں سب سے اہم مسئلہ قومیت کا تصور رہا ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے اپنا جداگانہ تصور قومیت رکھتے ہیں اور انہوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بن جانے کا تصور قبول نہیں کیا ہے لیکن بیسویں صدی میں مغربی اثرات اور ہندو سیاست کی وجہ سے متحدہ قومیت کا فتنہ ابھرا اور اس کے بڑے دور رس اثرات تعلیم یافتہ طبقے پر پڑے۔ علامہ اقبال' مولانا مودودی اور دوسرے مفکرین نے اس چیلنج کا جواب دیا اور متحدہ قومیت کے تصور پر شدید ترین تنقید کی۔ یہ اسی بروقت فکری رہنمائی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان متحدہ قومیت کے فتنہ سے بچ گئے اور دو قومی نظریئے کی بنیاد پر پاکستان کی تحریک برپا ہوئی۔ مولانا مودودی کی تحریرات نے اس بیداری کے پیدا کرنے میں خصوصی حصہ ادا کیا۔ ہم اس مجموعہ کے موضوع کی مناسبت سے مولانا کے دو مضامین اس میں شامل کر رہے ہیں۔ یہ مضامین ترجمان القرآن بابت ماہ نومبر و دسمبر ۳۳ء و بابت جون ۳۹ء سے لئے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے یہ مضامین دوسرے مضامین کے ساتھ کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں اور بلاشبہ لاکھوں افراد کے ذہنوں کو متاثر کر چکے ہیں۔

مرتب

اسلامی تصور قومیت

وحشت[1] سے مدنیت کی طرف انسان کا پہلا قدم اٹھتے ہی ضروری ہو جاتا ہے کہ کثرت میں وحدت کی ایک شان پیدا ہو اور مشترک اغراض و مصالح کے لئے متعدد افراد آپس میں مل کر تعاون اور اشتراک عمل کریں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس اجتماعی وحدت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی مجموعہ افراد کا نام "قوم" ہے۔ اگرچہ لفظ "قوم" اور "قومیت" اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں حدیث العہد ہیں۔ مگر جس معنی پر ان کا اطلاق ہوتا ہے وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تمدن قدیم ہے۔ "قوم" اور "قومیت" جس ہیئت کا نام ہے وہ بابل' مصر' روم اور یونان میں بھی ویسی ہی تھی جیسی آج فرانس' انگلستان' جرمنی اور اٹلی میں ہے۔

قومیت کے غیر منفک لوازم

اس میں شک نہیں کہ قومیت کی ابتدا ایک معصوم جذبہ سے ہوتی ہے' یعنی اس کا مقصد اول یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشترک مفاد و مصالح کے لئے عمل کریں اور اجتماعی ضروریات کے لئے ایک "قوم" بن کر رہیں۔ لیکن جب ان میں "قومیت' پید ہو جاتی ہے تو لازمی طور پر "عصبیت" کا رنگ

---

[1] ترجمان القرآن' دسمبر ۱۹۳۳ء۔ مرتب

اس میں آ جاتا ہے اور جتنی جتنی "قومیت" شدید ہوتی جاتی ہے اسی قدر "عصبیت" میں بھی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب کبھی ایک قوم اپنے مفاد کی خدمت اور اپنے مصالح کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو ایک رشتہ اتحاد میں منسلک کرے گی یا بالفاظ دیگر' اپنے گرد "قومیت" کا حصار چن لے گی تو لازماً" وہ اس حصار کے اندر والوں اور باہر والوں کے درمیان اپنے اور غیر کا امتیاز کرے گی۔ اپنے کو ہر معاملہ میں غیر پر ترجیح دے گی۔ غیر کے مقابلہ میں اپنے کی حمایت کرے گی۔ جب کبھی دونوں کے مفاد و مصالح میں اختلاف واقع ہو گا تو وہ اپنے کے مفاد کی حفاظت کرے گی اور اس پر غیر کے مفاد کو قربان کر دے گی۔ انہی وجوہ سے ان میں صلح بھی ہو گی اور جنگ بھی۔ مگر رزم اور بزم دونوں میں قومیت کی حد فاصل دونوں گروہوں کے درمیان قائم رہے گی۔ اسی چیز کا نام عصبیت و حمیت ہے اور قومیت کی یہ وہ لازمی خصوصیت ہے جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

قومیت کے عناصر ترکیبی

قومیت کا قیام وحدت و اشتراک کی کسی ایک جہت سے ہوتا ہے' خواہ وہ کوئی جہت ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں ایسی زبردست قوت رابطہ و ضابطہ ہونی چاہئے کہ اجسام کے تعدد اور نفوس کے تکثر کے باوجود وہ لوگوں کو ایک کلمہ' ایک خیال' ایک مقصد اور ایک عمل پر جمع کر دے اور قوم کے مختلف کثیر التعداد اجزاء کو قومیت کے تعلق سے اس طرح بستہ و پیوستہ کر دے کہ وہ سب ایک ٹھوس چٹان بن جائیں اور افراد قوم کے دل و دماغ پر اتنا تسلط و غلبہ حاصل کرے کہ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ سب متحد ہوں اور ہر قربانی کے لئے آمادہ رہیں۔

یوں تو اشتراک اور وحدت کی جہتیں بہت سی ہونی ممکن ہیں' لیکن آغاز عہد تاریخ سے آج تک دنیا میں جتنی قومیتیں بنی ہیں ان سب کی تعمیر بجز ایک اسلامی قومیت کے' حسب ذیل اشتراکات میں سے کسی ایک قسم کے اشتراک پر ہوئی ہے اور اس عنصر کے ساتھ چند دوسرے اشتراکات بھی بطور مددگار کے شریک ہو گئے

ہیں:

اشتراک نسل' جس کو "نسلیت" کہتے ہیں۔

اشتراک مرزبوم' جس کو "وطنیت" کہتے ہیں۔

اشتراک زبان' جو وحدت خیال کا ایک زبردست ذریعہ ہونے کی وجہ سے قومیت کی تعمیر میں خاص حصہ لیتا ہے۔

اشتراک رنگ' جو ایک رنگ کے لوگوں میں یک جنسی کا احساس پیدا کرتا ہے اور پھر یہی احساس ترقی کر کے ان کو دوسرے رنگ کے لوگوں سے احتراز و اجتناب پر آمادہ کر دیتا ہے۔

معاشی اغراض کا اشتراک' جو ایک معاشی نظام کے لوگوں کو دوسرے معاشی نظام والوں کے مقابلہ میں ممتاز کرتا ہے اور جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنے معاشی حقوق و منافع کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

نظام حکومت کا اشتراک' جو ایک سلطنت کی رعایا کو مشترک نظم و نسق کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے اور دوسری سلطنت کی رعایا کے مقابلہ میں حدود فاصلہ قائم کر دیتا ہے۔

قدیم ترین عہد سے لے کر آج بیسیوں صدی کے روشن زمانے تک' جتنی قومیتوں کے عناصر اصلیہ کا آپ تجسس کریں گے' ان سب میں آپ کو یہی مذکورہ بالا عناصر ملیں گے۔

اب سے دو تین ہزار برس پہلے یونانیت' رومیت' اسرائیلیت' ایرانیت وغیرہ بھی انہی بنیادوں پر قائم تھیں جن پر آج جرمنیت' اطالویت' فرانسیسیت' انگریزیت' امریکنیت' روسیت اور جاپانیت وغیرہ قائم ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ بنیادیں جن پر دنیا کی مختلف قومیتیں تعمیر کی گئی ہیں انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ جماعتوں کی شیرازہ بندی کی ہے مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس قسم کی قومیتیں بنی نوع انسان کے لئے ایک شدید

عصبیت ہیں۔ انہوں نے عالم انسانی کو سینکڑوں ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور حصے بھی ایسے کہ ایک حصہ فنا کیا جا سکتا ہے مگر دوسرے حصہ میں کسی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نسل دوسری نسل میں نہیں بدل سکتی۔ ایک وطن دوسرا وطن نہیں بن سکتا۔ ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبان کے بولنے والے نہیں بن سکتے۔ ایک رنگ دوسرا رنگ نہیں بن سکتا۔ ایک قوم کی معاشی اغراض بعینہ دوسری قوم کی اغراض نہیں بن سکتیں۔ ایک سلطنت کبھی دوسری سلطنت نہیں بن سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو قومیتیں ان بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں' ان کے درمیان مصالحت کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ قومی عصبیت کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے خلاف مسابقت' مزاحمت اور منافست کی ایک دائمی کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آپس میں لڑ لڑ کر فنا ہو جاتی ہیں اور پھر انہی بنیادوں پر دوسری قومیتیں ایسے ہی ہنگامے برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ دنیا میں فساد' بدامنی اور شرارت کا ایک مستقل سرچشمہ ہے' خدا کی سب سے بڑی لعنت ہے' شیطان کا سب سے زیادہ کامیاب حربہ ہے جس سے وہ اپنے ازلی دشمن کا شکار کرتا ہے۔

عصبیت جاہلیہ

اس قسم کی قومیت کا فطری اقتضا یہ ہے کہ وہ انسان میں جاہلانہ عصبیت پیدا کرے۔ وہ ایک قوم کو دوسری قوم سے مخالفت اور نفرت برتنے پر صرف اس لئے آمادہ کرتی ہے کہ وہ دوسری قوم کیوں ہے؟ اسے حق' صداقت' دیانت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ صرف یہ بات کہ ایک شخص کالا ہے' گورے کی نظر میں اسے حقیر بنا دیتی ہے۔ صرف اتنی سی بات کہ ایک انسان ایشیائی ہے' فرنگی کی نفرتوں اور جابرانہ دراز دستیوں اور حق تلفیوں کو اس کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ آئن سٹائن جیسے فاضل کا اسرائیلی ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ جرمن اس سے نفرت کرے۔

تشکیدی[1] کا محض سیاہ فام حبشی ہونا' اس کو جائز کر دیتا ہے کہ یورپین کو سزا دینے کے جرم میں اس کی ریاست چھین لی جائے۔ امریکہ کے مہذب باشندوں کے لئے یہ قطعاً" جائز ہے کہ وہ حبشیوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں کیونکہ وہ حبشی ہیں۔ ان کو اپنے محلوں میں نہ رہنے دیں' عام سڑکوں پر نہ چلنے دیں' تعلیمی اداروں میں تعلیم نہ پانے دیں اور ووٹ تک سے محروم رکھیں۔ جرمن کا جرمن ہونا اور فرانسیسی کا فرانسیسی ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کریں۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے محاسن یکسر معائب نظر آئیں۔ سرحد کے آزاد افغانیوں کا افغانی ہونا اور دمشق کے باشندوں کا عرب ہونا' انگریز اور فرانسیسی کو اس کا پورا حق بخش دیتا ہے کہ وہ ان کے سروں پر طیاروں سے بم برسائیں اور ان کی آبادیوں کا قتل عام کریں' خواہ یورپ کے مہذب شہریوں پر اس قسم کی گولہ باری کتنی ہی وحشیانہ حرکت سمجھی جاتی ہو۔ غرض یہ جنسی امتیاز وہ چیز ہے جو انسان کو حق اور انصاف سے اندھا بنا دیتی ہے اور اس کی وجہ سے عالمگیر اصول اخلاق و شرافت بھی قومیتوں کے قالب میں ڈھل کر کہیں ظلم اور کہیں عدل' کہیں سچ اور کہیں جھوٹ' کہیں کمینگی اور کہیں شرافت بن جاتے ہیں۔

کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ

---

[1] یہ بچوانا لینڈ کے بامنگ واٹو قبیلہ کا سردار تھا جس کو ایک یورپین پر سزائے تازیانہ جاری کرنے کے جرم میں سلطنت برطانیہ نے حقوق ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ حالانکہ دیسی باشندوں کے ساتھ اس فرنگی شخص کے افسوسناک برتاؤ کا خود برطانوی ہائی کمشنر کو بھی اعتراف تھا۔ بعد میں غریب تشکیدی کو صرف اس وقت بحال کیا گیا جب کہ اس نے ہمیشہ کے لئے یہ عہد کر لیا کہ وہ کبھی کسی ایسے مقدمہ کا فیصلہ نہ کرے گا جسکا تعلق کسی یورپین سے ہو۔ مگر ایسی کوئی شرط اس عہد نامہ میں نہ رکھی گئی کہ یورپین حضرات بھی دیسی باشندوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہ فرمائیں گے۔

نالائق' بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق' صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لئے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سپید ہے اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان۔ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے اور دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی و کدورت میں بھی کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق و اوصاف انسانی کے صلاح و فساد سے پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے' کیا کوئی صحیح الدماغ انسان یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس چیز کے تصور کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ نیکی' شرافت اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون' زبان کی بولی' مولد و مسکن کی خاک کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دے گی۔ مگر نسلیت' وطنیت اور اس کے بھن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

قومیت کے عناصر پر ایک عقلی تنقید

تھوڑی دیر کے لئے اس پہلو سے قطع نظر کر لیجئے۔ یہ جتنے اشتراکات آج قومیت کی بنیاد بنے ہوئے ہیں ان کو خود ان کی ذاتی حیثیت سے دیکھئے اور غور کیجئے کہ آیا یہ بجائے خود کوئی مضبوط عقلی بنیاد بھی رکھتے ہیں یا ان کی حقیقت محض سراب تخیل کی ہے۔

نسلیت کیا ہے؟ محض خون کا اشتراک۔ اس کا نقطہ آغاز ماں اور باپ کا نطفہ ہے جس سے چند انسانوں میں خونی رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی نطفہ پھیل کر خاندان بنتا ہے' پھر قبیلہ' پھر نسل۔ اس آخری حد یعنی نسل تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے اس باپ سے جس کو اس نے اپنی نسل کا مورث اعلیٰ قرار دیا ہے' اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی موروثیت محض ایک خیالی چیز بن جاتی ہے۔ نام نہاد "نسل" کے اس دریا

میں بیرونی خون کے بہت سے ندی نالے آ کر مل جاتے ہیں اور اگر کوئی صاحب عقل و علم انسان یہ دعوئی نہیں کر سکتا کہ یہ دریا خالص اسی پانی کا ہے جو اپنے اصلی سرچشمہ سے نکلا تھا۔ پھر اگر اس خلط ملط کے باوجود خون کے اشتراک کی بنا پر انسان ایک "نسل" کو اپنے لئے مادہ اتحاد قرار دے سکتا ہے' تو کیوں نہ اس خون کے اشتراک کو بنائے وحدت قرار دیا جائے جو تمام انسانوں کو ان کے پہلے باپ اور پہلی ماں سے ملاتا ہے؟ اور کیوں نہ تمام انسانوں کو ایک ہی نسل اور ایک ہی اصل کی طرف منسوب کیا جائے؟ آج جن لوگوں کو مختلف نسلوں کا بانی و مورث قرار دے لیا گیا ہے ان سب کا نسب اوپر جا کر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتا ہے اور آخر میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں۔ پھر یہ آریت اور سامیت کی تقسیم کیسی؟

مرزبوم کے اشتراک کی حقیقت اس سے زیادہ موہوم ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ یقیناً ایک گز مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس رقبہ کو اگر وہ اپنا وطن قرار دے تو شاید وہ کسی ملک کو اپنا وطن نہیں کہہ سکتا۔ لیکن وہ اس چھوٹے سے رقبہ کے گرد میلوں اور کوسوں اور بسا اوقات سینکڑوں اور ہزاروں میل تک ایک سرحدی خط کھینچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں تک میرا وطن ہے اور اس سے باہر جو کچھ ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اس کی نظر کی تنگی ہے' ورنہ کوئی چیز اسے تمام روئے زمین کو اپنا وطن کہنے سے مانع نہیں ہے۔ جس دلیل کی بنا پر ایک مربع گز کا وطن پھیل کر ہزاروں مربع گز بن سکتا ہے' اسی دلیل کی بنا پر وہ پھیل کر پورا کرہ ارضی بھی بن سکتا ہے۔ اگر آدمی اپنے زاویہ نظر کو تنگ نہ کرے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ یہ دریا اور پہاڑ اور سمندر وغیرہ جن کو اس نے محض اپنے خیال میں حدود فاصل قرار دے کر ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان فرق کیا ہے' سب کے سب ایک ہی زمین کے اجزاء ہیں۔ پھر کس بنا پر اس نے دریاؤں اور پہاڑوں اور سمندروں کو یہ حق دے دیا کہ وہ اسے ایک خاص خطہ

میں قید کر دیں؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ میں زمین کا باشندہ ہوں، سارا کرہ زمین میرا وطن ہے، جتنے انسان ربع مسکون میں آباد ہیں، میرے ہم وطن ہیں، اس پورے سیارے پر میں وہی پیدائشی حقوق رکھتا ہوں، جو اس گز بھر زمین پر مجھے حاصل ہیں جہاں میں پیدا ہوا ہوں؟

اشتراک زبان کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں وہ باہمی تفاہم اور تبادلہ خیالات کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ اس سے اجنبیت کا پردہ بڑی حد تک اٹھ جاتا ہے، اور ایک زبان بولنے والے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے قریب تر محسوس کرتے ہیں۔ مگر ادائے خیال کے وسیلہ کا مشترک ہونا خود خیال کے اشتراک کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک ہی خیال دس مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا ہے اور ان سب کے بولنے والوں کا اس خیال میں متحد ہو جانا ممکن ہے۔ بخلاف اس کے دس مختلف خیالات ایک زبان میں ادا ہو سکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اس ایک ہی زبان کے بولنے والے ان مختلف خیالات کے معتقد ہو کر باہم مختلف ہو جائیں۔ لہٰذا وحدت خیال جو حقیقتاً" قومیت کی جان ہے، اشتراک زبان کی محتاج نہیں ہے اور نہ اشتراک زبان کے ساتھ وحدت خیال ضروری ہے۔ پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ آدمی کی آدمیت اور اس کے ذاتی حسن و قبح میں اس کی زبان کو کیا دخل ہے؟ ایک جرمن بولنے والے شخص کو ایک فرنچ بولنے والے کے مقابلہ میں کیا محض اس بنا پر ترجیح دی جا سکتی ہے کہ وہ جرمن زبان بولتا ہے؟ دیکھنے کی چیز اس کا جوہر ذاتی ہے نہ کہ اس کی زبان۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک ملک کے انتظامی معاملات اور عام کاروبار میں وہی شخص مفید ہو سکتا ہے جو اس ملک کی زبان جانتا ہو۔ مگر انسانیت کی تقسیم اور قومی امتیاز کے لئے یہ کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

انسانی جماعتوں میں رنگ کا امتیاز سب سے زیادہ لغو اور مہمل چیز ہے۔ رنگ محض جسم کی صفت ہے، مگر انسان کو انسان ہونے کا شرف اس کے جسم کی بنا پر

نہیں' اس کی روح' اس کے نفس ناطقہ کی بنا پر ہے' جس کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ پھر انسان اور انسان میں زردی اور سرخی' سیاہی اور سپیدی کا امتیاز کیسا؟ ہم کالی گائے اور سپید گائے کے دودھ میں کوئی فرق نہیں کرتے اس لئے کہ مقصود اس کا دودھ ہے نہ کہ اس کا رنگ۔ لیکن عقل کی بے راہ روی کا برا ہو کہ اس نے ہم کو انسان کی نفسی صفات سے قطع نظر کر کے اس کی جلد کے رنگ کی طرف متوجہ کر دیا۔

معاشی اغراض کا اشتراک انسانی خود غرضی کا ایک ناجائز بچہ ہے۔ قدرت نے اس کو ہرگز پیدا نہیں کیا۔ آدمی کا بچہ کام کرنے کی قوتیں ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جدوجہد کے لئے اسے ایک وسیع میدان ملتا ہے اور زندگی کے بے شمار وسائل اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر وہ اپنی معیشت کے لئے صرف اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے رزق کے دروازے کھلیں' بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں کے لئے وہ بند ہو جائیں۔ اسی خود غرضی میں انسانوں کی کسی بڑی جماعت کے مشترک ہو جانے سے وہ وحدت پیدا ہوتی ہے جو انہیں ایک قوم بننے میں مدد دیتی ہے۔ بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معاشی اغراض کا ایک حلقہ قائم کر کے اپنے حقوق و مفاد کا تحفظ کر لیا۔ لیکن جب اس طرح بہت سی جماعتیں اپنے گرد اسی قسم کے حصار کھینچ لیتی ہیں تو انسان پر اس کے اپنے ہاتھوں سے عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کی اپنی خود غرضی اس کے لئے پاؤں کی بیڑی اور ہاتھ کی ہتھکڑی بن جاتی ہے۔ دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کرنے کی کوشش میں وہ خود اپنے رزق کی کنجیاں گم کر دیتا ہے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے یہ منظر موجود ہے کہ یورپ' امریکہ اور جاپان کی سلطنتیں اسی کا خمیازہ بھگت رہی ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان معاشی قلعوں کو کس طرح مسمار کریں جن کو انہوں نے خود ہی حفاظت کا بہترین وسیلہ سمجھ کر تعمیر کیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم یہ نہ سمجھیں گے کہ کسب معیشت کے لئے حلقوں کی تقسیم اور ان کی بنا پر قومی امتیازات کا قیام ایک

غیر عاقلانہ فعل ہے؟ خدا کی وسیع زمین پر انسان کو اپنے رب کا فضل تلاش کرنے کی آزادی دینے میں آخر کون سی قباحت ہے؟

نظام حکومت کا اشتراک بجائے خود ایک ناپائیدار اور ضعیف البنیان چیز ہے اور اس کی بنا پر ہرگز کسی مستحکم قومیت کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتہ میں منسلک کر کے ایک قوم بنا دینے کا خیال کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ سلطنت جب تک غالب و قاہر رہتی ہے' رعایا اس کے قانون کی گرفت میں بندھی رہتی ہے۔ یہ گرفت جہاں ڈھیلی ہوئی مختلف عناصر منتشر ہو گئے۔ سلطنت مغلیہ میں مرکزی طاقت کے کمزور ہونے کے بعد کوئی چیز ہندوستان کے مختلف علاقوں کو اپنی الگ الگ سیاسی قومیتیں بنا لینے سے نہ روک سکی۔ یہی حشر سلطنت عثمانیہ کا ہوا۔ آخری دور میں جوان ترک نے عثمان قومیت کا قصر تعمیر کرنے کے لئے بہت کچھ زور لگایا۔ مگر ایک ٹھیس لگتے ہی سب اینٹ پتھر جدا ہو گئے۔ تازہ ترین مثال آسٹریا' ہنگری کی ہے اور تاریخ سے بہت سی مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد جو لوگ سیاسی قومیتوں کی تعمیر ممکن سمجھتے ہیں وہ محض اپنے تخیل کی شادابی کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اس تنقید سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نسل انسانی میں یہ جتنی تفریقیں کی گئی ہیں۔ ان کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ یہ صرف حسی اور مادی تفریقیں ہیں جن کا ہر دائرہ زاویہ نظر کی ہر وسعت پر ٹوٹ جاتا ہے ان کا قیام و بقا جہالت کی تاریکی' نگاہ کی محدودیت اور دل کی تنگی پر منحصر ہے۔ علم و عرفان کی روشنی جس قدر پھیلتی ہے' بصیرت کی رسائی جس قدر بڑھتی ہے' قلب میں جتنی جتنی وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے' یہ مادی اور حسی پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں' یہاں تک کہ نسلیت کو انسانیت کے لئے اور وطنیت کو آفاقیت کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اختلاف رنگ و زبان میں جوہر انسانی کی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ خدا کی زمین میں خدا کے سب بندوں کی معاشی اغراض مشترک پائی جاتی ہیں۔ سیاسی نظامات کے دائرے محض

چند سائے نظر آتے ہیں جو آفتاب اقبال کی گردش سے روئے زمین پر چلتے پھرتے اور گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔

اسلام کا وسیع نظریہ

ٹھیک یہی بات ہے جو اسلام کہتا ہے۔ اس نے انسان اور انسان کے درمیان کسی مادی اور حسی فرق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب انسان ایک ہی اصل سے ہیں:

خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیر ونساء۔ (النساء:۱)

خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو (دنیا میں) پھیلا دیا۔

تمہارے درمیان مرزبوم اور مولد و مدفن کا اختلاف کوئی جوہری چیز نہیں ہے۔ اصل میں تم سب ایک ہی ہو۔

وھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ فمستقر و مستودع۔ (الانعام: ۹۸)

اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کا ایک ٹھکانہ ہے اور ایک جگہ اس کے سپرد خاک ہونے کی ہے۔

اس کے بعد نسل اور خاندان کے اختلاف کی بھی یہ حقیقت بتلا دی کہ:

یایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقکم (الحجرات: ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

یعنی یہ شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف کے لئے ہے، آپس کے بغض،

ایک دوسرے پر تفاخر' ایک دوسرے سے جھگڑنے کے لئے نہیں ہے۔ اس اختلاف میں انسانی اصل کی وحدت کو نہ بھول جاؤ۔ تم میں اگر کوئی حقیقی تفریق ہے تو وہ اخلاق و اعمال کی نیکی اور بدی کی بنا پر ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ گروہوں کی تفریق اور جماعتوں کا اختلاف خدا کا عذاب ہے جو تم کو آپس کی دشمنی کا مزہ چکھاتا ہے:

او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض۔ (الانعام: ۶۵)

یا تو تم کو گروہ گروہ بنا دے اور تمہیں ایک دوسرے کی قوت کا مزہ چکھائے۔

اس گروہ بندی کو اس نے من جملہ ان جرائم کے قرار دیا ہے جن کی بنا پر "فرعون لعنت و عذاب کا مستحق ہوا۔

ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا۔ (القصص: ۴)

فرعون نے زمین پر تکبر کیا اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔[1]

پھر کہا زمین خدا کی ہے' اس نے نوع انسانی کو اس میں اپنی خلافت سے سرفراز کیا ہے' اس کی سب چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے' کچھ ضروری نہیں کہ انسان ایک خطہ کا بندہ بن کر رہ جائے۔ یہ وسیع زمین اس کے لئے کھلی ہوئی ہے' ایک جگہ اس کے لئے تنگ ہو تو دوسری جگہ چلا جائے' جہاں جائے گا خدا کی نعمتیں موجود پائے گا۔

انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ (البقرہ: ۳۰)

(آدم کی تخلیق کے وقت خدا نے فرمایا کہ) میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر

---

[1] یہ آیت اس تاریخی جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ فرعون نے مصر کے باشندوں میں قبطی اور غیر قبطی کی تفریق قائم کی اور دونوں کے ساتھ مختلف طرز عمل اختیار کیا۔

کرنے والا ہوں۔

الم تران اللہ سخر لکم ما فی الارض۔ (الحج: ۶۵)
کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے تمہارے لئے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ہے جو زمین میں ہیں۔

الم تکن ارض اللّٰہ واسعۃ فتھاجروا فیھا۔ (النساء: ۹۷)
کیا اللہ کی زمین وسیع اور کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر کے چلے جاتے۔

ومن یھاجر فی سبیل اللّٰہ یجد فی الارض مراغما کثیرا وسعۃ۔
(النساء: ۱۰۰)
جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں وافر جگہ اور کشائش پائے گا۔

آپ پورے قرآن کو دیکھ جایئے۔ اس میں ایک لفظ بھی آپ کو نسلیت یا وطنیت کی تائید میں نہ ملے گا۔ اس کی دعوت کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے۔ تمام روئے زمین کی انسانی مخلوق کو وہ خیر و صلاح کی طرف بلاتا ہے۔ اس میں نہ کسی قوم کی تخصیص ہے اور نہ کسی سرزمین کی۔ اس نے اگر کسی زمین کے ساتھ خاص تعلق پیدا کیا ہے تو وہ صرف مکہ کی زمین ہے' لیکن اس کے متعلق بھی صاف کہہ دیا کہ سواء ن العاکف فیہ والباد۔ (الحج: ۲۵) یعنی مکہ کے اصلی باشندے اور باہر والے سب مسلمان برابر ہیں۔[1] اور جو مشرکین وہاں کے اصلی باشندے تھے ان

---

[1] اسی وجہ سے فقہائے اسلام کے ایک گروہ نے مکہ کی سرزمین پر کسی کے حق ملکیت کو تسلیم نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ اہل مکہ کو گھروں کے دروازے تک بند کرنے سے روکتے تھے تاکہ حجاج و زائرین جہاں چاہیں اتریں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز مکہ میں مکانات کرائے پر لینے سے منع کرتے تھے اور انہوں نے امیر مکہ کو فرمان لکھا تھا کہ لوگوں کو اس سے روکیں۔ بعض

کے متعلق کہا کہ وہ نجس ہیں' ان کو وہاں سے نکال باہر کرو۔ **انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا۔** (التوبہ : ۲۸) مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ اس تصریح کے بعد اسلام میں وطنیت کا کلی استیصال ہو جاتا ہے اور درحقیقت ایک مسلمان یہی کہہ سکتا ہے کہ:

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

عصبیت اور اسلام کی دشمنی

اسلام جب ظاہر ہوا تو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی نسل و وطن کے تعصبات و امتیازات تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم ان تعصبات میں سب سے پیش پیش تھی۔ خاندانوں کے مفاخر اور نسبی و ذاتی وجاہتوں کے تخیلات ان کے اور اسلام کے درمیان شدت کے ساتھ حائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن اگر خدا کی طرف سے اترتا تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر اترتا۔ **وقالوا لولا نزل هذا القران علی رجل من القریتین عظیم**[1] (الزخرف : ۳۱) ابوجہل سمجھتا کہ محمد ﷺ

بقیہ حاشیہ

فقہاء نے کہا ہے کہ جس نے اپنے خرچ سے وہاں مکان بنایا وہ کرایہ لے سکتا ہے مگر میدان اور خرابات اور مکانوں کے صحنوں پر سب کا حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ **مکة حرام لا یحل بیع رباعها ولا اجور بیتها۔** ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا: **انما هی مناخ من سبق۔** یہ اس زمین کا حال ہے جس سے اسلام نے خصوصیت پیدا کی۔

[1] "انہوں نے کہا یہ قرآن دو بستیوں میں سے کسی بستی کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترا؟"

رسالت کا دعویٰ کر کے اپنے خاندانی مفاخر میں ایک اور فخر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا قول تھا کہ "ہم سے اور بنو عبد مناف سے مقابلہ تھا۔ ہم شہسواری میں ان کے حریف تھے۔ کھانے اور کھلانے میں' عطا اور بخشش میں ان کے برابر تھے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وحی آنی شروع ہوئی ہے۔ خدا کی قسم ہم تو محمد ﷺ کی تصدیق نہ کریں گے۔" یہ صرف ابوجہل ہی کے خیالات نہ تھے بلکہ تمام مشرکین قریش کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ دین کا یہی عیب تھا کہ:

مذہب او قاطع ملک و نسب	از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست	با غلام خویش بریک خواں نشست
قدر احرار عرب نشناختہ	با کلفتان حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند	آبروئے دودمانے ریختند

اسی بناء پر قریش کے تمام خاندان بنی ہاشم سے بگڑ گئے اور بنی ہاشم نے بھی اسی قومی عصبیت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی' حالانکہ ان میں سے اکثر مسلمان نہ تھے۔ شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کو اسی لئے محصور کیا گیا اور تمام قریش نے اسی وجہ سے ان سے مقاطعہ کر لیا۔ جن مسلمانوں کے خاندان کمزور تھے ان کو شدید مظالم سے تنگ آ کر حبش کی جانب ہجرت کرنی پڑی اور جن کے خاندان طاقتور تھے وہ اپنی حق پرستی کی بنا پر نہیں بلکہ خاندانی طاقت کی بنا پر قریش کے ظلم و ستم سے ایک حد تک محفوظ رہے۔

عرب کے یہودی انبیائے بنی اسرائیل کی پیشین گوئیوں کی بنا پر مدتوں سے ایک نبی کے منتظر تھے۔ انہی کی دی ہوئی خبروں کا نتیجہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت شائع ہوئی تو مدینہ کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔ مگر خود یہودیوں کو جس چیز نے آپ کی تصدیق سے روکا وہ یہی نسلی عصبیت تھی۔ ان کو اس پر اعتراض تھا کہ آنے والا نبی' بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں کیوں آیا؟ اس تعصب نے ان کو یہاں تک مدہوش کر دیا کہ وہ موحدین کو چھوڑ کر مشرکین کے ساتھی ہو گئے۔

یہی حال نصاریٰ کا تھا۔ آنے والے نبی کے وہ بھی منتظر تھے مگر ان کو توقع تھی کہ وہ شام میں پیدا ہو گا۔ عرب کے کسی نبی کے ماننے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ ہرقل کے پاس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پہنچا تو اس نے قریش کے تاجروں سے کہا کہ "مجھے معلوم تھا کہ ایک نبی ابھی اور آنے والا ہے۔ مگر یہ امید نہ تھی کہ وہ تم میں سے ہو گا۔"

مقوقس مصر کے پاس جب دعوت نامہ اسلام پہنچا تو اس نے بھی یہی کہا کہ "ابھی ایک نبی آنا باقی ہے' یہ مجھے معلوم ہے مگر مجھے امید تھی کہ وہ شام میں آئے گا۔"

اسی تعصب کا دور دورہ عجم میں بھی تھا۔ خسرو پرویز کے پاس جب حضور اکرم ﷺ کا نامہ مبارک پہنچا تو کس چیز نے اس کو غضب ناک کیا؟ یہی کہ "ایک غلام قوم کا فرد اور بادشاہ عجم کو اس طرح مخاطب کرے!" وہ عرب کی قوم کو ذلیل سمجھتا تھا۔ اپنا ماتحت خیال کرتا تھا۔ یہ بات ماننے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھا کہ ایسی قوم میں کوئی حق کی طرف بلانے والا پیدا ہو گا۔

اسلام کے خلاف اس کے دشمن یہودیوں کے پاس سب سے بڑا کارگر حربہ یہی تھا کہ مسلمانوں میں قبائلی عصبیت پیدا کریں۔ اسی بنیاد پر مدینہ کے منافقین سے ان کی سازباز تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ کر انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) میں عصبیت کی ایک ایسی آگ بھڑکائی کہ تلواریں کھنچنے کی نوبت آ گئی۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ..... **یایھا الذین امنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتو الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین۔**[1] (آل عمران : ۱۰۰)

---

[1] مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مانو گے تو وہ تم کو ایمان سے کفر کی طرف پھیر دیں گے۔

یہی نسل و وطن کا تعصب تھا جس نے مدینہ میں قریش کے نبی کو حکمران دیکھ کر اور مہاجرین کو انصار کے باغوں اور نخلستانوں میں چلتے پھرتے دیکھ کر' مدینہ کے منافقین کو آتش زیر پا کر رکھا تھا۔ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کہا کرتا تھا کہ "یہ قریش کے فقیر ہمارے ملک میں آ کر پھل پھول گئے ہیں۔ ان کی مثل ایسی ہے کہ کتے کو کھلا پلا کر موٹا کر تاکہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔" وہ انصار سے کہتا تھا کہ "تم نے ان کو اپنے سر چڑھا لیا ہے۔ اپنے ملک میں جگہ دی۔ اپنے اموال میں ان کو حصہ دیا۔ خدا کی قسم آج تم ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔" ان کی ان باتوں کا جواب قرآن مجید میں اس طرح دیا گیا ہے:

هم الذين يقولون لا تنفقوا علٰى من عند رسول الله حتّٰى ينفضوا ط ولله خزائن السمٰوات والارض ولكن المنفقين لا يفقهون ○ يقولون لئن رجعنا الى المدينة ليخرجن الاعز منها الاذل ط ولله العزة ولرسوله وللمومنين ولكن المنفقين لا يعلمون۔ (منافقون: ۷ ۔ ۸)

یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں پر کچھ خرچ نہ کرو تاکہ یہ تتر بتر ہو جائیں۔ حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک اللہ ہے مگر منافقین اس کو نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم (میدان جنگ سے) مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔ حالانکہ عزت دراصل اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کی ہے مگر منافقین اس بات کو نہیں جانتے۔

یہی عصبیت کا جوش تھا جس نے عبداللہ بن ابی سے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگوائی اور خزرج والوں کی حمایت نے اس دشمن خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کئے کی سزا پانے سے بچا لیا۔

عصبیت کے خلاف اسلام کا جہاد

اس بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کفر و شرک کی جہالت کے بعد اسلام کی دعوت حق کا اگر کوئی سب سے بڑا دشمن تھا تو وہ یہی نسل و وطن کا شیطان تھا اور یہی وجہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ حیات نبویہ میں ضلالت کفر کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کو مٹانے کے لئے جہاد کیا وہ یہی عصبیت جاہلیہ تھی۔ آپ احادیث و سیر کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ حضور سرور کائنات ﷺ نے کس طرح خون اور خاک، رنگ اور زبان، پستی اور بلندی کی تفریقوں کو مٹایا، انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری امتیازات کی تمام سنگین دیواروں کو مسمار کیا اور انسان ہونے کی حیثیت سے تمام بنی آدم کو یکساں قرار دیا۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم یہ تھی:

لیس منا من مات علی العصبیۃ۔ لیس منا من دعا الی العصبیۃ۔ لیس منا من قاتل علی العصبیۃ۔

جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

آپ ﷺ فرماتے تھے:

لیس لاحد فضل علی احد الا بدین و تقوی۔ الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب۔

پرہیز گاری اور دین داری کے سوا کسی اور چیز کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت نہیں ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

نسل، وطن، زبان اور رنگ کی تفریق کو آپ ﷺ نے یہ کہہ کر مٹایا کہ:

لا فضل لعربی علٰی عجمی ولا لعجمی علٰی عربی' کلکم ابناء آدم

(بخاری و مسلم)

نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو۔

لا فضل لعربی علٰی عجمی ولا لعجمی علٰی عربی ولا لابیض علٰی اسود ولا لاسود علٰی ابیض الا بالتقوٰی۔ (زاد المعاد)

کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر' اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر فضیلت نہیں ہے' اگر فضیلت ہے تو وہ صرف پرہیزگاری کی بنا پر ہے۔

اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ۔

(بخاری کتاب الاحکام)

سنو اور اطاعت کرو چاہے تمہارے اوپر کوئی حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے جس کا سر کشمش جیسا ہو۔[1]

فتح مکہ کے بعد جب تلوار کے زور نے قریش کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا دیا تو حضور اکرم ﷺ خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور اس میں پورے زور کے ساتھ یہ اعلان فرمایا:

الا کل ماثرۃ او دم او مال یدعی فھو تحت قدمی ھاتین۔

خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ' خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے ان قدموں کے نیچے ہے۔

یا معشر قریش ان اللہ اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا الاباء۔

---

[1] یہ خطاب شرفائے عرب سے ہو رہا ہے کہ اگر تمہارا امیر کوئی حبشی ہو' تو اس کی اطاعت کرنا! کیا کوئی نیشنلسٹ اس چیز کا تصور بھی کر سکتا ہے؟

اے اہل قریش اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔

ایھا الناس کلکم من آدم و آدم من تراب۔ لا فخر للانساب لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم

اے لوگو! تم سب آدم علیہ السلام سے ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے تھے۔ نسب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ہے۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

عبادت الٰہی کے بعد آپؐ اپنے خدا کے سامنے تین باتوں کی گواہی دیتے تھے۔ پہلے اس بات کی کہ "خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔" پھر اس بات کی کہ "محمد ﷺ اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔" پھر اس بات کی کہ "اللہ کے بندے سب بھائی بھائی ہیں۔" (ان العباد کلھم اخوۃ)

اسلامی قومیت کی بنیاد

اس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جاہلیت کی ان تمام محدود مادی، حسی اور وہمی بنیادوں کو جن پر دنیا کی مختلف قومیتوں کی عمارتیں قائم کی گئی تھیں ڈھا دیا۔ رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت اور سیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو جن کی بنا پر انسان نے اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے انسانیت کو تقسیم کر رکھا تھا، مٹا دیا اور انسانیت کے مادے میں تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا ہم مرتبہ قرار دے دیا۔

اس تخریب کے ساتھ اس نے خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعمیر کی۔ اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی، مگر مادی اور ارضی امتیاز پر نہیں، بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی، جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی پاکیزگی

وطہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوع بشری کو دعوت دی۔ پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کر دے وہ دوسری قوم سے ہے۔ ایک قوم ایمان اور اسلام کی ہے اور اس کے سب افراد ایک امت ہیں۔ وکذالک جعلنکم امۃ وسطا۔[1] اور ایک قوم کفر اور گمراہی کی ہے اور اس کے متبعین اپنے اختلاف کے باوجود ایک گروہ ہیں۔ واللہ لا یھدی القوم الکفرین۔[2]

ان دونوں قوموں کے درمیان بنائے امتیاز نسل اور نسب نہیں، اعتقاد اور عمل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے اسلام اور کفر کی تفریق میں جدا جدا ہو جائیں، اور دو بالکل اجنبی آدمی اسلام میں متحد ہونے کی وجہ سے ایک قومیت میں مشترک ہوں۔

وطن کا اختلاف بھی ان دونوں قوموں کے درمیان وجہ امتیاز نہیں ہے۔ یہاں امتیاز حق اور باطل کی بنیاد پر ہے جس کا کوئی وطن نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شہر، ایک محلہ، ایک گھر کے دو آدمیوں کی قومیتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جائیں اور ایک حبشی رشتہ اسلام میں مشترک ہونے کی وجہ سے ایک مراکشی کا قومی بھائی بن جائے۔

رنگ کا اختلاف بھی یہاں قومی تفریق کا سبب نہیں ہے۔ یہاں اعتبار چہرے کے رنگ کا نہیں، اللہ کے رنگ کا ہے اور وہی بہترین رنگ ہے۔ صبغۃ اللہ ط ومن احسن من اللہ صبغۃ[3] ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اعتبار سے ایک گورے اور ایک کالے کی ایک قوم ہو اور کفر کے اعتبار سے دو گوروں کی دو الگ

---

[1] البقرہ۔ ۱۴۳۔ اور اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا ہے۔

[2] التوبہ۔ ۳۷۔ اور اللہ منکرین حق کو ہدایت نہیں کرتا۔

[3] البقرہ ۱۳۸۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اس کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہو گا۔

قومیتیں ہوں۔

زبان کا امتیاز بھی اسلام اور کفر میں وجہ اختلاف نہیں ہے۔ یہاں منہ کی زبان نہیں محض دل کی زبان کا اعتبار ہے جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے اعتبار سے عربی اور افریقی کی ایک زبان ہو سکتی ہے اور دو عربوں کی زبانیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

معاشی اور سیاسی نظاموں کا اختلاف بھی اسلام اور کفر کے اختلاف میں بے اصل ہے۔ یہاں جھگڑا دولت زر کا نہیں دولت ایمان کا ہے' انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی بادشاہت کا ہے۔ جو لوگ حکومت الٰہی کے وفادار ہیں اور جو خدا کے ہاتھ اپنی جانیں فروخت کر چکے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ ہندوستان میں ہوں یا ترکستان میں۔ اور جو خدا کی حکومت سے باغی ہیں اور شیطان سے جان و مال کا سودا کر چکے ہیں وہ ایک دوسری قوم ہیں۔ ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کس سلطنت کی رعایا ہیں اور کس معاشی نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس طرح اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے۔ ایک گھر کے دو آدمی اس دائرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور مشرق و مغرب کا بعد رکھنے والے دو آدمی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

سر عشق از عالم ارحام نیست   اوز سام و روم و شام نیست
کوکب بے شرق و غرب و بے غروب   در مدارش نے شمال و بے جنوب

اس دائرے کا محیط ایک کلمہ ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسی کلمہ پر دوستی بھی ہے اور اسی پر دشمنی بھی۔ اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کر دیتا ہے۔ جن کو اس نے جدا کر دیا ہے ان کو نہ خون کا رشتہ جمع کر سکتا ہے' نہ خاک کا' نہ زبان کا' نہ رنگ کا' نہ روٹی کا' نہ حکومت کا اور جن کو اس نے جمع کر دیا ہے انہیں کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی۔ کسی دریا' کسی پہاڑ' کسی سمندر' کسی زبان' کسی نسل' کسی رنگ اور کسی زر و زمین کے قضیہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسلام کے

دائرے میں امتیازی خطوط کھینچ کر مسلمان اور مسلمان کے درمیان فرق کرے۔ ہر مسلمان خواہ وہ چین کا باشندہ ہو یا مراکش کا' گورا ہو یا کالا' ہندی بولتا ہو یا عربی' سامی ہو یا آرین' ایک حکومت کی رعیت ہو یا دوسری حکومت کی' مسلمان قوم کا فرد ہے' اسلامی سوسائٹی کا رکن ہے' اسلامی اسٹیٹ کا شہری ہے' اسلامی فوج کا سپاہی ہے' اسلامی قانون کی حفاظت کا مستحق ہے۔ شریعت اسلامیہ میں کوئی ایک دفعہ بھی ایسی نہیں ہے جو عبادات' معاملات' معاشرت' معیشت' سیاست' غرض زندگی کے کسی شعبہ میں جنسیت یا زبان یا وطنیت کے لحاظ سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں کمتر یا بیشتر حقوق دیتی ہو۔

اسلام کا طریق جمع و تفریق

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اسلام نے تمام انسانی اور مادی رشتوں کو قطع کر دیا ہے۔ ہرگز نہیں! اس نے مسلمانوں کو صلہ رحمی کا حکم دیا ہے' قطع رحم سے منع کیا ہے' ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تاکید کی ہے' خون کے رشتوں میں وراثت جاری کی ہے' خیر و صدقات اور بذل و انفاق میں ذوی القربیٰ کو غیر ذوی القربیٰ پر ترجیح دی ہے' اپنے اہل و عیال' اپنے گھربار' اور اپنے مال کو دشمنوں سے بچانے کا حکم دیا ہے' ظالم کے مقابلہ میں لڑنے کا حکم دیا ہے اور ایسی لڑائی میں جان دینے والے کو شہید قرار دیا ہے' زندگی کے تمام معاملات میں بلا امتیاز مذہب ہر انسان کے ساتھ ہمدردی' حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے کسی حکم کو یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ وہ ملک و وطن کی خدمت و حفاظت سے روکتا ہے' یا غیر مسلم ہمسایہ کے ساتھ صلح و مسالمت کرنے سے باز رکھتا ہے۔[1]

---

[1] یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ غیر مسلم قوموں کے ساتھ مسلمان قوم کے تعلقات کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت تو یہ ہے کہ انسان ہونے میں ہم اور وہ یکساں ہیں اور دوسری

حیثیت یہ ہے کہ اسلام

یہ سب کچھ ان مادی رشتوں کی جائز اور فطری مراعات ہیں۔ مگر جس چیز نے قومیت کے معاملہ میں اسلام اور غیر اسلام کے اصول میں فرق کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں نے انہی رشتوں پر جداگانہ قومیتیں بنالی ہیں اور اسلام نے ان کو بنائے قومیت قرار نہیں دیا۔ وہ ایمان کے تعلق کو ان سب تعلقات پر ترجیح دیتا ہے اور وقت پڑے تو ان میں سے ہر ایک کو اس پر قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراھیم والذین معه اذ قالوا لقومھم انا براؤا منکم ومما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا و بینکم العداوة والبغضاء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ۔ (الممتحنہ: ۴)

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں یہ قابل تقلید نمونہ تھا کہ انہوں نے اپنی وطنی و نسلی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے معبودوں سے جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو' کوئی تعلق نہیں ہے' ہم نے تم کو چھوڑ دیا۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے

اور کفر کے اختلاف نے ہمیں ان سے جدا کر دیا ہے۔ پہلی حیثیت سے ہم ان کے ساتھ ہمدردی' فیاضی' رواداری اور شرافت کا ہر وہ سلوک کریں گے جو انسانیت کا مقتضی ہے اور اگر وہ دشمن اسلام نہ ہوں تو ان سے دوستی' مصالحت اور مسالمت بھی کر لیں گے اور مشترک مقاصد کے لئے تعاون میں بھی دریغ نہ کریں گے۔ لیکن کسی طرح کا مادی اور دنیوی اشتراک ہم کو اور ان کو اس طور سے جمع نہیں کر سکتا کہ ہم اور وہ مل کر ایک قوم بن جائیں اور اسلامی قومیت کو چھوڑ کر کوئی مشترک ہندی یا چینی یا مصری قومیت قبول کر لیں کیونکہ ہماری دوسری حیثیت اس قسم کے اجتماع میں مانع ہے اور کفر و اسلام کا مل کر ایک قوم بن جانا قطعاً" محال ہے۔

عداوت اور دشمنی ہو گئی تاوقتیکہ تم ایک خدا پر ایمان نہ لاؤ۔
وہ کہتا ہے:

لا تتخذوا آباؤکم و لخوانکم لولیاء ان استحبو الکفر علی الایمان ط ومن یتولھم منکم فاولئک ھم الظلمون۔ (التوبہ: ۲۳)

اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی دوست اور محبوب نہ رکھو اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو محبوب رکھیں۔ تم میں سے جو کوئی ان کو محبوب رکھے گا وہ ظالموں میں شمار ہو گا۔

اور:

ان من ازواجکم واولادکم عدوالکم فاحذروھم (التغابن: ۱۴)

تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہارے (بہ حیثیت مسلمان ہونے کے) دشمن ہیں' ان سے حذر کرو۔

وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے دین اور تمہارے وطن میں دشمنی ہو جائے تو دین کی خاطر وطن کو چھوڑ کر نکل جاؤ۔ جو شخص دین کی محبت پر وطن کی محبت کو قربان کر کے ہجرت نہ کرے وہ منافق ہے' اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ فلا تتخذوا منہم اولیاء حتیٰ یہاجروا فی سبیل اللہ۔ (النساء: ۸۹)

اس طرح اسلام اور کفر کے اختلاف سے خون کے قریب ترین رشتے کٹ جاتے ہیں۔ ماں' باپ' بھائی' بیٹے صرف اسی لئے جدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اسلام کے مخالف ہیں۔ ہم نسل قوم کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خدا سے دشمنی رکھتی ہے۔ وطن کو اس لئے خیرباد کہا جاتا ہے کہ وہاں اسلام اور کفر میں عداوت ہے۔ گویا اسلام دنیا کی ہر چیز پر مقدم ہے' ہر چیز اسلام پر قربان کی جا سکتی ہے اور اسلام کسی چیز پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اب دوسری طرف دیکھئے۔ یہی اسلام کا تعلق ہے جو ایسے لوگوں کو ملا کر بھائی بھائی بنا دیتا ہے جن کے درمیان نہ خون کا رشتہ ہے' نہ وطن کا' نہ زبان کا' نہ رنگ کا۔ تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا جاتا ہے:

واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللّٰہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا و کنتم علی شفا حفرۃ من النار فانقذکم منہا۔ (آل عمران : ۱۰۳)

تم سب مل کر اللہ کی رسی کو تھامے رہو اور آپس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت (اسلام) کی بدولت بھائی بھائی بن گئے۔ تم (آپس کی عصبیت کی بدولت) آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔

تمام غیر مسلموں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:

فان تابوا و اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین۔ (التوبہ : ۱۱)

اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں' نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

اور مسلمانوں کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ:

محمد رسول اللہ ط والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم۔ (الفتح : ۲۹)

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ "مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ لوگ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔ نیز وہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ پھیریں' ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں۔ جونہی کہ انہوں نے ایسا کیا ہم پر ان کے خون اور ان کے مال حرام ہو گئے۔ الا یہ کہ حق اور انصاف کی خاطر ان کو حلال کیا

جائے۔ اس کے بعد ان کے وہی حقوق ہیں جو سب مسلمانوں کے ہیں اور ان پر وہی واجبات ہیں جو سب مسلمانوں پر ہیں۔" (ابوداؤد کتاب الجہاد)

پھر یہی نہیں کہ حقوق اور فرائض میں مسلمان برابر ہیں اور ان میں کسی فرق و امتیاز کی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد نبوی ہے کہ:

المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضه بعضا۔

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ کتاب الاداب باب الشفقه والرحمته علی الخلق)

مسلمان کے ساتھ مسلمان کا تعلق ایسا ہے جیسے ایک دیوار کے اجزاء جن میں سے ہر ایک دوسرے سے قوت پاتا ہے۔

اور:

مثل المومنین فی توادهم و تراحمهم وتعاطفهم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمی۔

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ۔ ایضاً")

آپس کی محبت اور رحمت و مہربانی میں مسلمانوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم اس کے لئے بے خواب و بے آرام ہو جاتا ہے۔

ملت اسلامیہ کے اس جسم نامی کو رسول اللہ نے "جماعت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کے متعلق آپ کا فرمان ہے:

ید الله علی الجماعة ومن شذ شذ فی النار۔

جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے جو اس سے بچھڑا وہ آگ میں گیا۔

اور:

من فارق الجماعة شبرا خلع ربقة الاسلام من عنقه۔

(رواہ احمد و ابوداؤد۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان)

جو ایک بالشت بھر بھی جماعت سے جدا ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی

گردن سے اتار پھینکا۔

اسی پر بس نہیں بلکہ یہاں تک فرمایا کہ:

من اراد ان یفرق جماعتکم فاقتلوہ

جو تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کرے اس کو قتل کر دو۔

اور

من اراد ان یفرق امر ھذہ الامۃ وھی جمیع فاضربوہ بالسیف کائنا من کان۔ (المسلم۔ کتاب الامارۃ)

جو کوئی اس امت کے بندھے ہوئے رشتہ کو پارہ پارہ کرنے کا ارادہ کرے' اس کی تلوار سے خبر لو خواہ وہ کوئی ہو۔

اسلامی قومیت کی تعمیر کس طرح ہوئی؟

اس جماعت میں جس کی شیرازہ بندی اسلام کے تعلق کی بنا پر کی گئی تھی خون اور خاک' رنگ اور زبان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اس میں سلمان ؓ ایرانی تھے جن سے ان کا نسب پوچھا جاتا' تو فرماتے کہ "سلمان بن اسلام" حضرت علی ؓ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "سلمان منا اھل البیت" "سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں۔" اس میں باذان بن ساسان اور ان کے بیٹے شہر بن باذان تھے جن کا نسب بہرام گور سے ملتا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت باذان کو یمن کا اور ان کے صاحبزادے کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا تھا۔ اس جماعت میں بلال حبشی ؓ تھے جن کے متعلق حضرت عمر ؓ فرمایا کرتے تھے کہ بلال سیدنا و مولا سیدنا "بلال ؓ ہمارے آقا کا غلام اور ہمارا آقا ہے۔" اس جماعت میں صہیب ؓ رومی تھے۔ جنہیں حضرت عمر ؓ نے اپنی جگہ نماز میں امامت کے لئے کھڑا کیا۔ اس میں حضرت ابو حذیفہ ؓ کے غلام سالم ؓ تھے جن کے متعلق حضرت عمر ؓ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو میں خلافت کے لئے انہی کو نامزد کرتا۔

اس میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایک غلام تھے جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی پھوپھی کی بیٹی ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بیاہ دیا تھا۔ اس میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے لشکر کا سردار بنایا تھا' جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ' حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ شریک تھے۔ انہی اسامہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ "اسامہ رضی اللہ عنہ کا باپ تیرے باپ سے افضل تھا اور اسامہ رضی اللہ عنہ خود تجھ سے افضل ہے۔"

مہاجرین کا اسوہ

اس جماعت نے اسلام کے تبر سے عصبیت کے ان تمام بتوں کو توڑ ڈالا جو نسل اور وطن' رنگ اور زبان وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں اور جن کی پرستش قدیم جاہلیت سے جدید جاہلیت کے زمانہ تک دنیا میں ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے وطن مکہ کو چھوڑا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس کے یہ معنی نہ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مہاجرین کو اپنے وطن سے وہ فطری محبت نہ تھی جو انسان کو ہوا کرتی ہے۔ مکہ کو چھوڑتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "اے مکہ! تو مجھ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر کیا کروں کہ تیرے باشندے مجھ کو یہاں رہنے نہیں دیتے۔" حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب مدینہ جا کر بیمار ہوئے تو مکہ کی ایک ایک چیز کو یاد کرتے تھے۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے یہ حسرت بھرے اشعار آج تک مشہور ہیں:

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة ۔۔۔ بفخ و حولی اذخر و جلیل
وهل اردن یوما میاہ مجنة ۔۔۔ وهل تبدولی شامة و طفیل

کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیا میں (کبھی کوئی) رات مقام فخ میں گزاروں گا اور میرے گرد اذخر (ایک خوشبو دار گھاس) اور جلیل (بابونہ کے پودے) ہوں

گے۔

اور کیا میں کسی دن مجنہ (جگہ کا نام ہے) کے گھاٹ پر بھی وارد ہوں گا اور مجھے شامۃ و طفیل (پہاڑ اور مقام کے نام) نظر آئیں گے؟

مگر اس کے باوجود حب وطن نے ان بزرگوں کو اسلام کی خاطر ہجرت کرنے سے باز نہ رکھا۔[1]

انصار کا طرز عمل

دوسری طرف اہل مدینہ نے رسول اکرم ﷺ اور مہاجرین کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے جان و مال خدمت اقدس میں پیش کر دیے۔ اسی بنا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "مدینہ قرآن سے فتح ہوا۔" نبی اکرم ﷺ نے انصار اور مہاجرین کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا تو یہ ایسے بھائی بھائی بنے کہ مدتوں ان کو ایک دوسرے کی میراث ملتی رہی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر اس توارث کو بند کیا۔ **واولوالارحام بعضہم اولی ببعض۔**[2] انصار نے اپنے کھیت اور باغ آدھے تقسیم کر کے اپنے مہاجر بھائیوں کو دے دیئے اور جب بنو نضیر کی زمینیں فتح ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ زمین بھی ہمارے مہاجر بھائیوں کو دے دیجئے۔ یہی ایثار تھا جسکی تعریف اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ **ویوثرون علٰی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ**[3] حضرت عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بہتان گھڑا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "**حب الوطن من الایمان**" حالانکہ ایسی کوئی صحیح حدیث آپ سے ماثور نہیں ہے۔

[2] (الانفال: ۷۵) یعنی وراثت میں خونی رشتوں کے لوگ ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

[3] (الحشر: ۹) وہ ایسے لوگ ہیں جو خود حاجت مند ہونے پر بھی دوسروں کے حق میں ایثار کرتے ہیں۔

سعد بن ربیع انصاری ؓ کے درمیان مواخاۃ کرائی گئی تو حضرت سعد ؓ اپنے دینی بھائی کو آدھا مال دینے اور اپنی بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر ان سے بیاہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ عہد رسالت کے بعد جب مہاجرین پیہم منصب خلافت پر سرفراز ہوئے تو کسی مدنی نے یہ نہ کہا کہ تم غیر ملکیوں کو ہمارے ملک پر حکومت کرنے کا کیا حق ہے؟ رسول اکرم ﷺ اور حضرت عمر ؓ نے مدینہ کے نواح میں مہاجرین کو جاگیریں دیں اور کسی انصاری نے اس پر زبان تک نہ ہلائی۔

رشتہ دین پر مادی علائق کی قربانی

پھر جنگ بدر اور جنگ احد میں مہاجرین مکہ دین کی خاطر خود اپنے رشتہ داروں سے لڑے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے اپنے بیٹے عبدالرحمان پر تلوار اٹھائی۔ حضرت حذیفہ ؓ نے اپنے باپ ابو حذیفہ پر حملہ کیا۔ حضرت عمر ؓ نے اپنے ماموں کے خون میں ہاتھ رنگے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس ؓ ' چچا زاد بھائی عقیل ؓ ' داماد ابوالعاص ؓ بدر میں گرفتار ہوئے اور عام قیدیوں کی طرح رکھے گئے۔ حضرت عمر ؓ تو یہاں تک آمادہ ہو گئے تھے کہ سب قیدیوں کو قتل کر دیا جائے اور ہر شخص خود اپنے عزیز کو قتل کرے۔

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ غیر قبیلہ اور غیر علاقہ والوں کو لے کر خود اپنے قبیلہ اور اپنے وطن پر حملہ آور ہوئے اور غیروں کے ہاتھوں اپنوں کی گردنوں پر تلوار چلوائی۔ عرب کے لئے یہ بالکل نئی بات تھی کہ کوئی شخص خود اپنے قبیلہ اور اپنے وطن پر غیر قبیلہ والوں کو چڑھا لائے اور وہ بھی کسی انتقام یا زر و زمین کے قضیہ کی بنا پر نہیں بلکہ محض ایک کلمہ حق کی خاطر۔ جب قریش کے اوباش مارے جانے لگے تو ابوسفیان نے آ کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ! قریش کے نونہال کٹ رہے ہیں۔ آج کے بعد قریش کا نام و نشان نہ رہے گا۔" رحمتہ اللعالمین ﷺ نے یہ سن کر اہل مکہ کو امان دے دی۔ انصار سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ کا دل اپنی قوم کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا۔ "حضور ﷺ آخر آدمی ہی تو ہیں۔

اپنے خاندان والوں کا پاس کر ہی گئے۔" رسول اللہ ﷺ کو ان باتوں کی خبر پہنچی تو انصار کو جمع کیا اور فرمایا۔ "مجھے خاندان والوں کی محبت نے ہرگز نہیں کھینچا۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اللہ کے لئے تمہارے پاس ہجرت کر کے جا چکا ہوں۔ اب میرا جینا تمہارے ساتھ ہے اور مرنا تمہارے ساتھ۔" جو کچھ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا' اسے لفظ بلفظ سچا کر کے دکھا دیا۔ باوجودیکہ مکہ معظمہ کے فتح ہو جانے کے بعد وہ علت باقی نہ رہی تھی جس کی بنا پر حضور اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تھے' مگر آپ ﷺ نے مکہ میں قیام نہ فرمایا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ رسول خدا ﷺ نے مکہ پر کسی وطنی یا انتقامی جذبہ کے تحت حملہ نہ کیا تھا' بلکہ محض اعلائے کلمۃ الحق مقصود تھا۔

اس کے بعد جب ہوازن اور ثقیف کے اموال فتح ہوئے تو پھر وہی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ حضور اکرم ﷺ نے غنیمت میں سے قریش کے نو مسلموں کو زیادہ حصہ دیا۔ انصار کے بعض نوجوان سمجھے یہ قومی پاسداری کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے بگڑ کر کہا کہ "خدا رسول اللہ ﷺ کو معاف کرے۔ وہ قریش کو دیتے ہیں اور ہم کو چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ اب تک ہماری تلواروں سے ان کے خون ٹپک رہے ہیں۔" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پھر جمع کیا اور فرمایا کہ "میں ان لوگوں کو اس لئے زیادہ دیتا ہوں کہ یہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ محض ان کی تالیف قلب مقصود ہے۔ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ یہ دنیا کا مال لے جائیں اور تم خدا کے رسول ﷺ کو لے جاؤ؟"

غزوہ بنی المصطلق میں ایک غفاری اور ایک عوفی میں جھگڑا ہو گیا۔ غفاری نے عوفی کو تھپڑ مارا۔ بنی عوف انصار کے حلیف تھے۔ اس لئے عوفی نے انصار کو مدد کے لئے پکارا۔ بنی غفار مہاجرین کے حلیف تھے' اس لئے غفاری نے مہاجرین کو آواز دی۔ قریب تھا کہ فریقین کی تلواریں کھنچ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے فریقین کو بلا کر فرمایا کہ یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی جو تمہاری

زبانوں سے نکل رہی تھی؟ (مالکم ولدعوۃ الجاھلیۃ) انہوں نے کہا کہ ایک مہاجر نے انصاری کو مارا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس جاہلیت کی پکار کو چھوڑ دو۔ یہ بڑی گھناؤنی چیز ہے۔"

اس غزوہ میں مدینہ کا مشہور قوم پرست لیڈر عبداللہ بن ابی بھی شریک تھا۔ اس نے جو سنا کہ مہاجرین کے حلیف نے انصار کے حلیف کو مارا ہے تو کہا کہ "یہ ہمارے ملک میں آکر پھل پھول گئے ہیں اور اب ہمارے ہی سامنے سر اٹھاتے ہیں۔ ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو تاکہ وہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ بخدا مدینہ واپس پہنچ کر جو ہم میں سے عزت والا ہو گا وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا۔" پھر اس نے انصار سے کہا کہ "یہ تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی اور اپنے اموال ان پر بانٹ دیئے۔ خدا کی قسم آج تم ان سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ ہوا کھاتے نظر آئیں گے۔" یہ باتیں رسول اللہ ﷺ تک پہنچیں تو آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ تمہارا باپ یہ یہ کہتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے غایت درجہ محبت رکھتے تھے۔ اور ان کو فخر تھا کہ خزرج میں کوئی بیٹا اپنے باپ سے اتنی محبت نہیں کرتا۔ مگر یہ قصہ سن کر انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ اگر حکم ہو تو میں اس کا سر کاٹ لاؤں۔" آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر جب جنگ سے واپس ہوئے تو مدینہ پہنچ کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ کے آگے تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ "تو مدینہ میں گھس نہیں سکتا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ اجازت نہ دیں۔ تو کہتا ہے کہ ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو مدینہ سے نکال دے گا۔ تو اب تجھے معلوم ہو کہ عزت صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہے۔" اس پر ابن ابی چیخ اٹھا کہ "لو سنو اے اہل خزرج! اب میرا بیٹا مجھ کو گھر میں گھسنے نہیں دیتا۔" لوگوں نے آکر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو سمجھایا۔ مگر انہوں نے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر یہ مدینہ کے سائے میں بھی پناہ نہیں لے سکتا۔" آخر کار لوگ

رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جا کر عبداللہ سے کہو کہ اپنے باپ کو گھر میں جانے دے۔" جب عبداللہ نے یہ فرمان مبارک سنا تو تلوار رکھ دی اور کہا کہ "ان کا حکم ہے تو اب یہ جا سکتا ہے۔"[1]

بنو قینقاع پر جب حملہ کیا گیا تو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کو ان کے معاملے میں حکم بنایا گیا اور انہوں نے فیصلہ دیا کہ اس پورے قبیلہ کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ لوگ حضرت عبادہ کے قبیلے خزرج کے حلیف تھے مگر انہوں نے اس تعلق کا ذرہ برابر خیال نہ کیا۔ اس طرح بنو قریظہ کے معاملہ میں اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا گیا اور ان کا فیصلہ یہ تھا کہ بنو قریظہ کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے' عورتوں اور بچوں کو سبایا اور ان کے اموال کو غنیمت قرار دیا جائے۔ اس معاملہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان حلیفانہ تعلقات کا ذرا خیال نہ کیا جو اوس اور بنو قریظہ کے درمیان مدت سے قائم تھے۔ حالانکہ عرب میں حلف کی جو اہمیت تھی وہ سب کو معلوم ہے اور مزید برآں یہ لوگ صدیوں سے انصار کے ہم وطن تھے۔

جمعیت اسلامیہ کی اصلی روح

ان شواہد سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی قومیت کی تعمیر میں نسل و وطن اور زبان و رنگ کا قطعاً" کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس عمارت کو جس معمار نے بنایا ہے اس کا تخیل ساری دنیا سے نرالا تھا۔ اس نے تمام عالم انسانی کے مواد خام پر نظر ڈالی۔ جہاں جہاں سے اس کو اچھا اور مضبوط مسالہ ملا اس کو چھانٹ

---

[1] اس واقعہ کی پوری تفصیل ابن جریر کی تفسیر (جلد ۲۸۔ صفحہ ۶۶ تا ۷۰) میں ملاحظہ فرمایئے۔

لیا۔ ایمان اور عمل صالح کے پختہ چونے سے ان متفرق اجزاء کو پیوستہ کر دیا اور ایک عالمگیر قومیت کا قصر تعمیر کیا جو سارے کرہ ارضی پر چھایا ہوا ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کا قیام و دوام منحصر ہے اس پر کہ اس کے تمام مختلف الاصل ' مختلف الشکل ' مختلف المقام اجزاء اپنی جدا جدا اصلیتوں کو بھول کر صرف ایک اصل کو یاد رکھیں ' اپنے جدا جدا رنگ چھوڑ کر ایک رنگ میں رنگ جائیں ' اپنے الگ الگ مقاموں سے قطع نظر کر کے ایک مخرج صدق سے نکلیں اور ایک مدخل صدق میں داخل ہو جائیں۔ یہی وحدت ملی اس بنیان مرصوص کی جان ہے۔ اگر یہ وحدت ٹوٹ جائے ' اگر اجزائے ملت میں اپنی اصلوں اور نسلوں کے جدا جدا ہونے ' اپنے وطن اور مقام کے مختلف ہونے ' اپنے رنگ و شکل کے متنوع ہونے اور اپنی اغراض دنیوی کے متضاد ہونے کا احساس پیدا ہو جائے تو اس عمارت کی دیواریں پھٹ جائیں گی اور اس کی بنیادیں ہل جائیں گی اور اس کے تمام اجزاء پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ جس طرح ایک سلطنت میں کئی سلطنتیں نہیں بن سکتیں اسی طرح ایک قومیت میں کئی قومیتیں نہیں بن سکتیں۔ اسلامی قومیت کے اندر نسلی ' وطنی ' لسانی اور لونی قومیتوں کا جمع ہونا قطعاً" محال ہے۔ ان دونوں قسم کی قومیتوں میں سے ایک ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اس لئے کہ

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پس جو مسلمان ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے اسے تمام قومیتوں کے احساس کو باطل اور سارے خاک و خون کے رشتوں کو قطع کرنا پڑے گا اور جو ان رشتوں کو قائم رکھنا چاہتا ہے اس کے متعلق ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلام اس کے قلب و روح میں نہیں اترا۔ جاہلیت اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ آج نہیں تو کل وہ اسلام سے چھوٹے گا اور اسلام اس سے۔

رسول اللہ ﷺ کی آخری وصیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری زمانہ میں سب سے زیادہ خطرہ

جس چیز کا تھا وہ یہی تھا کہ کہیں مسلمانوں میں جاہلی عصبیتیں پیدا نہ ہو جائیں اور ان کی بدولت اسلام کا قصر ملت پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ:

لا ترجعون بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض

(بخاری کتاب الفتن)

کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد تم پھر کفر کی طرف پلٹ کر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

اپنی زندگی کے آخری حج حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو عرفات کے خطبہ میں عام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا:

"سن رکھو کہ امور جاہلیت میں سے ہر چیز آج میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد سے ہو اور آدمؑ مٹی سے تھے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ جاہلیت کے سب دعوے باطل کر دیئے گئے۔ اب تمہارے خون اور تمہاری عزتیں اور تمہارے اموال ایک دوسرے کے لئے ویسے ہی حرام ہیں جیسے آج حج کا دن تمہارے اس مہینہ تمہارے اس شہر میں حرام ہے۔"

پھر منیٰ میں تشریف لے گئے تو اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ اس تقریر کو دہرایا اور اس پر اضافہ کیا:

"دیکھو! میرے بعد پھر گمراہی کی طرف پلٹ کر ایک دوسرے کی گردنیں نہ مارنے لگنا۔

عنقریب تم اپنے رب سے ملنے والے ہو۔ وہاں تمہارے اعمال کی تم سے باز پرس ہو گی۔

سنو! اگر کوئی نکٹا حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ تم کو کتاب اللہ

کے مطابق چلائے تو اس کی بات ماننا اور اطاعت کرنا۔"

یہ ارشاد فرما کر پوچھا کہ "کیا میں نے تم کو یہ پیغام پہنچا دیا ہے؟" لوگوں نے کہا۔ ہاں یا رسول اللہ ﷺ۔ فرمایا "اے خدا تو گواہ رہیو۔" اور لوگوں سے کہا کہ "جو موجود ہے وہ اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔"[1]

حج سے واپس ہو کر شہدائے احد کے مقام پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

"مجھے اس کا خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے۔ مگر ڈرتا اس سے ہوں کہ کہیں تم دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور آپس میں لڑنے نہ لگو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح پہلی امتیں ہلاک ہو چکی ہیں۔"

اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ

یہ فتنہ جس کے ظاہر ہونے کا سید الکونین ﷺ کو اندیشہ تھا حقیقت میں ویسا ہی مہلک ثابت ہوا۔ جیسا آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔ قرن اول سے آج تک اسلام اور مسلمانوں پر جو تباہی بھی نازل ہوئی ہے اسی کی بدولت ہوئی ہے۔ وصال نبوی کے چند ہی برس بعد ہاشمی اور اموی عصبیت کا فتنہ اٹھا اور اس نے اسلام کے اصلی نظام سیاست کو ہمیشہ کے لئے درہم برہم کر دیا۔ پھر اس نے عربی' عجمی اور ترکی عصبیت کی شکل میں ظہور کیا اور اسلام کی سیاسی وحدت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر مختلف ممالک میں جو مسلمان سلطنتیں قائم ہوئیں ان سب کی تباہی میں سب سے زیادہ اسی فتنہ کا ہاتھ تھا۔ قریب ترین زمانہ میں دو سب سے بڑی مسلمان سلطنتیں ہندستان اور ترکی کی تھیں۔ ان دونوں کو اسی فتنہ نے تباہ کیا۔ ہندوستان میں مغل اور

---

[1] ملاحظہ ہو بخاری' کتاب الفتن' مسلم' مشکوٰۃ کتاب الامارۃ اور سیرت ابن ہشام

ہندوستانی کی تفریق نے سلطنت مغلیہ کو ختم کیا۔ اور ترکی میں ترک' عرب اور کرد کی تفریق تباہی کی موجب ہوئی۔

اسلام کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے۔ جہاں کوئی طاقت ور سلطنت آپ کو نظر آئے گی اس کی بنیاد میں آپ کو بلا امتیاز جنسیت مختلف نسلوں اور مختلف قوموں کا خون ملے گا۔ ان کے مدبر' ان کے سپہ سالار' ان کے اہل قلم' ان کے اہل سیف' سب کے سب مختلف الاجناس پائے جائیں گے۔ آپ عراقی کو افریقہ میں' شامی کو ایران میں' افغانی کو ہندوستان میں' مسلمان حکومتوں کی اسی جاں بازی' دیانت' صداقت اور امانت کے ساتھ خدمت کرتے ہوئے دیکھیں گے جس سے وہ خود اپنے وطن کی خدمت کرتا۔ مسلمان سلطنتیں کبھی اپنے مردان کار کی فراہمی میں کسی ایک ملک یا ایک نسل کے وسائل پر منحصر نہیں رہیں۔ ہر جگہ سے قابل دماغ اور کارپرداز ہاتھ ان کے لئے جمع ہوئے اور انہوں نے ہر دارالاسلام کو اپنا وطن اور گھر سمجھا۔ مگر جب نفسانیت' خودغرضی اور عصبیت کا فتنہ اٹھا' اور مسلمانوں میں مرزبوم اور رنگ و نسل کے امتیازات نے راہ پائی' تو وہ ایک دوسرے سے بغض و حسد کرنے لگے' دھڑے بندیوں اور سازشوں کا دور دورہ ہوا' جو قوتیں دشمنوں کے خلاف صرف ہوتی تھیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں' مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا ہوئی اور بڑی بڑی مسلمان سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔

مغرب کی اندھی تقلید

آج مغربی قوموں سے سبق سیکھ کر ہر جگہ کے مسلمان نسلیت اور وطنیت کے راگ الاپ رہے ہیں۔ عرب عربیت پر ناز کر رہا ہے۔ مصری کو اپنا فراعنہ یاد آ رہے ہیں۔ ترک اپنی ترکیت کے جوش میں چنگیز خاں اور ہلاکو سے رشتہ جوڑ رہا ہے۔ ایرانی اپنی ایرانیت کے جوش میں کہتا ہے کہ یہ محض عرب امپیریلزم کا زور تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ ہمارے ہیرو بن گئے' حالانکہ حقیقت میں ہمارے قومی

ابطال تو رستم و اسفندیار تھے۔ ہندوستان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے آپ کو ہندوستانی قومیت سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی یہاں موجود ہیں جو آب زمزم سے قطع تعلق کر کے آب گنگا سے وابستگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بھیم اور ارجن کو اپنا قومی ہیرو قرار دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایسے بھی جنہیں ارض مکہ تو بھولے سے بھی یاد نہیں آتی لیکن ٹیکسلا' موہن جوڈارو اور ہڑپا سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے لئے وہ شب و روز بے چین رہتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ان نادانوں نے نہ اپنی تہذیب کو سمجھا ہے اور نہ مغربی تہذیب کو۔ اصول اور حقائق ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ وہ محض سطح بین ہیں اور سطح پر جو نقوش ان کو زیادہ نمایاں اور زیادہ خوش رنگ نظر آتے ہیں انہی پر لوٹ پوٹ ہونے لگتے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جو چیز مغربی قومیت کے لئے آب حیات ہے' وہی چیز اسلامی قومیت کے لئے زہر ہے۔ مغربی قومیتوں کی بنیاد نسل و وطن اور زبان و رنگ کی وحدت پر قائم ہوئی ہے' اس لئے ہر قوم مجبور ہے کہ ہر اس شخص سے اجتناب کرے جو اس کا ہم قوم' ہم نسل' ہم زبان نہ ہو' خواہ وہ اس کی سرحد سے ایک ہی میل کے فاصلہ پر کیوں نہ رہتا ہو۔ وہاں ایک قوم کا آدمی دوسری قوم کا سچا وفادار نہیں ہو سکتا۔ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کا سچا خادم نہیں بن سکتا۔ کوئی قوم کسی دوسری قوم کے فرد پر یہ اعتماد نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے مفاد کو اپنی قوم کے مفاد پر ترجیح دے گا۔ مگر اسلامی قومیت کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں قومیت کی بنیاد نسل و وطن کے بجائے اعتقاد و عمل پر رکھی گئی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان ہر جنسی امتیاز کے بغیر ایک دوسرے کے شریک حال اور معاون ہیں۔ ایک ہندی مسلمان مصر کا ویسا ہی وفادار شہری بن سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہندوستان کا ہے۔ ایک افغانی مسلمان شام کی حفاظت کے لئے اسی جاں بازی کے ساتھ لڑ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ خود افغانستان کے لئے لڑتا ہے۔ اس لئے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمان میں جغرافی یا نسلی تفریق کی کوئی

وجہ نہیں۔ اس معاملہ میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ جو وہاں سبب قوت ہے وہ یہاں عین سبب ضعف ہے اور جو یہاں مایہ حیات ہے وہ وہاں بعینہٖ سم قاتل ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

بعض لوگ اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وطنی یا نسلی قومیت کے احساسات پیدا ہونے کے بعد بھی اسلامی قومیت کا رشتہ مسلمانوں کے درمیان باقی رہ سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے نفس کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ یہ دونوں قسم کی قومیتیں ساتھ ساتھ چلیں گی' ایک سے دوسری پر آنچ نہ آئے گی' اور ہم ان دونوں کے فوائد جمع کرلیں گے۔ لیکن یہ محض جہل اور قلت فکر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح خدا نے ایک سینے میں دو قلب نہیں رکھے اسی طرح ایک قلب میں دو قومیتوں کے متضاد اور متصادم جذبات کو جمع کرنے کی گنجائش بھی نہیں رکھی ہے۔ احساس قومیت کا لازمی نتیجہ اپنے اور غیر کا امتیاز ہے۔ اسلامی قومیت کے احساس کا فطری مقتضا یہ ہے کہ آپ مسلم کو اپنا اور غیر مسلم کو غیر سمجھیں۔ اور وطنی یا نسلی قومیت کے احساس کا طبعی اقتضا یہ ہے کہ آپ ہر اس شخص کو اپنا سمجھیں جو آپ کا ہم وطن یا ہم نسل ہو اور اس کو غیر سمجھیں جو دوسرے ملک یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اب کوئی صاحب عقل ہمیں سمجھا دے کہ دونوں احساس ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ کیونکر ممکن ہے کہ آپ اپنے غیر مسلم ہم وطن کو اپنا بھی سمجھیں اور غیر بھی؟ اور غیر وطنی مسلمان سے بعید بھی ہوں اور قریب بھی؟ هل يجتمعان معا؟

الیس منکم رجل رشید؟[1]

پس یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمانوں میں ہندیت' ترکیت' افغانیت' عربیت اور ایرانیت کے احساسات کا پیدا ہونا اسلامی قومیت کا احساس مٹنے اور اسلامی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کو مستلزم ہے اور یہ نتیجہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ بارہا مشاہدہ میں آ چکا ہے۔ مسلمانوں میں جب کبھی وطنی یا نسلی تعصبات پیدا ہوئے تو مسلمان نے مسلمان کا گلا ضرور کاٹا اور **لا ترجعون بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض** کے اندیشہ نبوی کی تصدیق کر کے ہی چھوڑی۔ لہٰذا وطنیت کے داعیوں کو اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں یہ جان کر کریں کہ وطنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی عین ضد ہے۔

---

[1] سورہ ہود۔ ۷۸۔ کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں ہے۔

(۲)

اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم

زمانہ حال میں مسلمانوں کی جماعت کے لئے لفظ "قوم" کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عموماً" یہی اصطلاح ہماری اجتماعی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے رائج ہو چکی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کے لئے لفظ "قوم" (یا نیشن کے معنی میں کسی دوسرے لفظ کو) اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ میں مختصراً" یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان الفاظ میں اصلی قباحت کیا ہے جس کی وجہ سے اسلام میں ان سے پرہیز کیا گیا اور وہ دوسرے الفاظ کون سے ہیں جن کو قرآن و حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک علمی بحث نہیں ہے' بلکہ اس سے ہمارے ان بہت سے تصورات کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جن کی بدولت زندگی میں ہمارا رویہ بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

لفظ "قوم" اور اس کے ہم معنی انگریزی لفظ (Nation)' دونوں دراصل جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ اہل جاہلیت نے "قومیت" (Nationality) کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد (Cultural Basis) پر قائم نہیں کیا' نہ قدیم جاہلیت کے دور میں اور نہ جدید جاہلیت کے دور میں۔ ان کے دل و دماغ کے ریشوں میں نسلی اور روایتی علائق کی محبت کچھ اس طرح پلا دی گئی ہے کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایات کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کر سکے۔ جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً" ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اسی طرح

آج بھی لفظ "نیشن" کے مفہوم میں مشترک جنسیت (Common Descent) کا تصور لازمی طور پر شامل ہے اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصور اجتماع کے خلاف ہے اس وجہ سے قرآن میں لفظ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے عربی الفاظ مثلاً" شعب وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لئے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اس جماعت کے لئے کیونکر استعمال کی جا سکتی تھی جس کے اجتماع کی اساس میں خون اور خاک اور رنگ اور اس نوع کی دوسری چیزوں کا قطعا" کوئی دخل نہ تھا' جس کی تالیف و ترکیب محض اصول اور مسلک کی بنیاد پر کی گئی تھی اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطع نسب اور ترک علائق مادی سے ہوا تھا۔

قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لئے استعمال کیا ہے وہ "حزب" ہے۔ جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ کیونکہ ان کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں اور جن سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں' ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) دوسرے شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان) شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلافات ہوں' قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے' کیونکہ ان کا طریق فکر اور طریق عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

استحوذ علیہم الشیطن فانسٰھم ذکر اللہ ط اولٰئک حزب الشیطن ط الا ان حزب الشیطن ھم الخسرون۔ (المجادلہ : ۱۹)

شیطان ان پر غالب آگیا اور اس نے خدا سے انہیں غافل کر دیا۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامراد ہی رہنے والی ہے۔

برعکس اس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے ان کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریق فکر اور مسلک حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم جڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

پارٹی کا یہ اختلاف باپ اور بیٹے تک کا تعلق توڑ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ بیٹا باپ کی وراثت تک نہیں پا سکتا۔ حدیث کے الفاظ میں لا یتوارث اهل ملتین۔ دو مختلف ملتوں کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

پارٹی کا یہ اختلاف بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف رونما ہوتے ہی دونوں پر ایک دوسرے کی مواصلت حرام ہو جاتی ہے، محض اس لئے کہ دونوں کی زندگی کے راستے جدا ہو چکے۔ قرآن میں ہے: لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن۔ نہ وہ ان کے لیے حلال، نہ یہ ان کے لیے حلال۔ (الممتحنہ۔ ۱۰)

پارٹی کا یہ اختلاف ایک برادری، ایک خاندان کے آدمیوں میں پورا معاشرتی مقاطعہ کرا دیتا ہے، حتیٰ کہ حزب اللہ والے کے لیے خود اپنی نسلی برادری کے ان لوگوں میں شادی بیاہ کرنا حرام ہو جاتا ہے جو حزب الشیطان سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے "مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن لونڈی مشرک بیگم سے بہتر ہے، خواہ وہ تمہیں کتنی ہی پسند ہو اور اپنی عورتوں کے نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن غلام مشرک آزاد شخص سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو"۔

پارٹی کا یہ اختلاف نسلی و وطنی قومیت کا تعلق صرف کاٹ ہی نہیں دیتا بلکہ دونوں میں ایک مستقل نزاع قائم کر دیتا ہے جو دائماً قائم رہتی ہے تاوقتیکہ وہ اللہ کی پارٹی کے اصول تسلیم نہ کرلیں۔ قرآن کہتا ہے:

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ اذ قالوا لقومھم انا برآء منکم ومما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ الا قول ابراھیم لابیہ لا ستغفرن لک۔ (الممتحنہ۔ ۴)

"تمہارے لیے بہترین نمونہ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی (نسلی) قوم والوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو' کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تم سے بے تعلق ہو چکے اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت پڑ گئی تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ مگر تمہارے لیے ابراہیم کے اس قول میں نمونہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے کافر باپ سے کہا کہ میں تیرے لیے بخشش کی دعا کروں گا۔

وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ (توبہ: ۱۱۴)

ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا محض اس وعدے کی بنا پر تھا جو اس سے کر چکا تھا۔ مگر جب اس پر کھل گیا کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو گیا۔

پارٹی کا یہ اختلاف ایک خاندان والوں اور قریب ترین رشتہ داروں کے درمیان بھی محبت کا تعلق حرام کر دیتا ہے' حتیٰ کہ اگر باپ اور بھائی اور بیٹے بھی حزب الشیطان میں شامل ہوں تو حزب اللہ والا اپنی پارٹی سے غداری کرے گا اگر ان سے محبت رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا باءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم ط...... اولئک حزب اللہ ط الا ان حزب اللہ ھم المفلحون (المجادلہ : ۲۲)

تم ایسا ہرگز نہ پاؤ گے کہ کوئی جماعت اللہ اور یوم آخر پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور رسول کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھے، خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں...... یہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ آخرکار اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔

دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ لفظ "امت" ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امر جامع نے مجتمع کیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے "امت" کہا جاتا ہے مثلاً ایک زمانہ کے لوگ بھی "امت" کہے جاتے ہیں۔ ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی "امت" کہے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو جس اصل مشترک کی بنا پر امت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور ان کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ ط۔ (آل عمران : ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

وکذلک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ط۔ (بقرہ : ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا ہے تاکہ تم نوع انسانی پر

نگران ہو اور رسولؐ تم پر نگران ہو۔

ان آیات پر غور کیجیے۔ "بیچ کی امت" سے مراد یہ ہے کہ "مسلمان" ایک بین الاقوامی جماعت (International Party) کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص اصول کو ماننے' ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے ان کا تعلق نہیں رہا ہے۔ اس لیے یہ بیچ کی امت ہیں۔ لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے ان کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دنیا میں خدائی قانون کو قائم کرنے کے فرائض انجام دیں۔ "تم نوع انسانی پر نگران ہو" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مسلمان خدا کی طرف سے دنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے اور "نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزب اللہ" کے لیڈر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی' اخلاقی اور مادی طاقتوں سے کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ہر دوسرے طریقہ کو مغلوب کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مسلمان ایک امت بنائے گئے ہیں۔

تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ "جماعت" ہے اور یہ لفظ بھی "حزب" کی طرح بالکل پارٹی کا ہم معنی ہے۔ علیکم بالجماعۃ اور ید اللہ علی الجماعۃ اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً" احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپؐ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ "ہمیشہ قوم کے ساتھ رہو" یا "قوم پر خدا کا

ہاتھ ہے"۔ بلکہ ایسے تمام مواقع پر آپ' جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے "قوم" کے بجائے جماعت' حزب اور پارٹی کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً" مستعمل ہوتا ہے۔ ان کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی مسلک اور کسی اصول کا پیرو ہو' ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام' طرز زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اس قوم کے ساتھ منسلک ہو۔ لیکن پارٹی' جماعت اور حزب کے الفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں ان کے لحاظ سے اصول اور مسلک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے کا مدار ہوتا ہے۔ آپ ایک پارٹی کے اصول و مسلک سے ہٹ جانے کے بعد ہرگز اس میں شامل نہیں رہ سکتے' نہ اس کا نام استعمال کر سکتے ہیں' نہ اس کے نمائندے بن سکتے ہیں' نہ اس کے مفاد کے محافظ بن کر نمودار ہو سکتے ہیں' اور نہ پارٹی والوں سے آپ کا کسی طور پر تعاون ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں پارٹی کے اصول و مسلک سے تو متفق نہیں ہوں' لیکن میرے والدین اس پارٹی کے ممبر رہ چکے ہیں' اور میرا نام اس کے ممبروں سے ملتا جلتا ہے اس لیے مجھ کو بھی ممبروں کے سے حقوق ملنے چاہئیں تو آپ کا یہ استدلال اتنا مضحکہ انگیز ہو گا کہ شاید سننے والوں کو آپ کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگے گا۔ لیکن پارٹی کے تصور کو قوم کے تصور سے بدل ڈالیے۔ اس کے بعد یہ سب حرکات کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔

اسلام نے اپنی بین الاقوامی پارٹی کے ارکان میں یک جہتی اور ان کی معاشرت میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے اور ان کو ایک سوسائٹی بنا دینے کے لیے حکم دیا تھا کہ آپس ہی میں بیاہ شادی کرو۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اولاد کے لیے تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام تجویز کیا گیا تھا کہ وہ خود بخود پارٹی کے اصول و مسلک کے پیرو بن کر اٹھیں اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ افزائش نسل سے بھی پارٹی کی قوت بڑھتی رہے۔

یہیں سے اس پارٹی کے قوم بننے کی ابتداء ہوتی ہے۔ بعد میں مشترک معاشرت' نسلی تعلقات اور تاریخی روایات نے اس قومیت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔

اس حد تک جو کچھ ہوا' درست ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی ہیں' اور پارٹی ہونے کی حیثیت ہی پر ان کی قومیت کی اساس رکھی گئی ہے۔ یہ بھلاوا بڑھتے بڑھتے اب یہاں تک پہنچ گیا ہے' کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل ہی گم ہو گیا۔ مسلمان اب صرف ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی طرح کی ایک قوم جیسی کہ جرمن ایک قوم ہے یا جاپانی ایک قوم ہے یا انگریز ایک قوم ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ اصل چیز وہ اصول اور مسلک ہیں جس پر اسلام نے ان کو ایک امت بنایا تھا' وہ مشن ہے جس کو پورا کرنے کے لیے اس نے اپنے پیروؤں کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر کے انھوں نے غیر مسلم قوموں سے "قومیت" کا جاہلی تصور لے لیا ہے۔ یہ ایسی بنیادی غلطی ہے اور اس کے قبیح اثرات اتنے پھیل گئے ہیں کہ احیائے اسلام کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا جب تک کہ اس غلطی کو دور نہ کر دیا جائے۔

ایک پارٹی کے ارکان میں باہمی محبت' رفاقت اور معاونت جو کچھ بھی ہوتی ہے شخصی یا خاندانی حیثیت سے نہیں ہوتی' بلکہ صرف اس بنا پر ہوتی ہے کہ وہ سب ایک اصول کے معتقد اور ایک مسلک کے پیرو ہوتے ہیں۔ پارٹی کا ایک رکن اگر جماعتی اصول اور مسلک سے ہٹ کر کوئی کام کرے تو صرف یہی نہیں کہ اس کی مدد کرنا پارٹی والوں کا فرض نہیں ہوتا' بلکہ اس کے برعکس پارٹی والوں کا فرض یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے غدارانہ اور باغیانہ طرز عمل سے روکیں' نہ مانے تو اس کے خلاف جماعتی ضوابط کے تحت سخت کارروائی کریں' پھر بھی نہ مانے تو جماعت سے نکال باہر کریں۔ ایسی مثالیں بھی دنیا میں ناپید نہیں ہیں کہ جو شخص پارٹی کے مسلک سے شدید انحراف کرتا ہے اسے کچھ خاص حالتوں میں قتل تک کر دیا

جاتا ہے۔[1] لیکن ذرا مسلمانوں کا حال دیکھیے کہ اپنے آپ کو پارٹی کے بجائے قوم سمجھنے کی وجہ سے یہ کیسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی شخص اپنے فائدے کے لیے غیر اسلامی اصولوں پر کوئی کام کرتا ہے تو دوسرے مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ اس کی مدد کریں گے۔ اگر مدد نہیں کی جاتی تو شکایت کرتا ہے کہ دیکھو' مسلمان مسلمان کے کام نہیں آتے۔ سفارش کرنے والے ان کی سفارش ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بھائی کا بھلا ہوتا ہے' اس کی مدد کرو۔ مدد کرنے والے بھی اگر اس کی مدد کرتے ہیں تو اپنے اس فعل کو اسلامی ہمدردی سے موسوم کرتے ہیں۔ اس سارے معاملہ میں ہر ایک کی زبان پر اسلامی ہمدردی' اسلامی برادری' اسلام کے رشتہ دینی کا نام بار بار آتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام کے خلاف عمل کرنے میں خود اسلام ہی کا حوالہ دینا اور اس کے نام سے ہمدردی چاہنا یا ہمدردی کرنا صریح لغو بات ہے۔ جس اسلام کا یہ لوگ نام لیتے ہیں اگر حقیقت میں وہ ان کے اندر زندہ ہو تو جونہی ان کے علم میں یہ بات آئے کہ اسلامی جماعت کا کوئی شخص کوئی کام اسلامی نظریہ کے خلاف کر رہا ہے' یہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں اور اس سے توبہ کرا کے چھوڑیں۔ کسی کا مدد چاہنا تو درکنار' ایک زندہ اسلامی سوسائٹی میں تو کوئی شخص اصول اسلام کی خلاف ورزی کا نام تک نہیں لے سکتا لیکن آپ کی سوسائٹی میں رات دن یہی معاملہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ آپ کے اندر جاہلی قومیت آ گئی ہے۔ جس چیز کو آپ اسلامی اخوت کہہ رہے ہیں یہ دراصل جاہلی قومیت کا رشتہ ہے جو آپ نے غیر مسلموں سے لے لیا ہے۔

---

[1] اسلام میں قتل مرتد کی یہی بنا ہے۔ روسی اشتراکی بھی اشتراکیت سے مرتد ہونے کی یہی سزا دیتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مرتد کی سزا ——— اسلام میں" از سید ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لیٹڈ' لاہور۔

اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ آپ کے اندر "قومی مفاد" کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گیا ہے اور آپ اس کو بے تکلف "اسلامی مفاد" بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی مفاد یا قومی مفاد کیا چیز ہے؟ یہ کہ جو لوگ "مسلمان" کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو' ان کے پاس دولت آئے' ان کی عزت بڑھے' ان کو اقتدار نصیب ہو' اور کسی نہ کسی طرح ان کی دنیا بن جائے۔ بلالحاظ اس کے کہ یہ سب فائدے اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی پیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ "مسلمان" کہتے ہیں چاہے اس کے خیالات اور اس کے طرز عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو۔ گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نہیں بلکہ جسم کا نام ہے اور صفت اسلام سے قطع نظر کر کے بھی ایک شخص کو مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط تصور کے ساتھ جن جسموں کا اسم ذات آپ نے مسلمان رکھ چھوڑا ہے ان کی حکومت کو آپ اسلامی حکومت' ان کی ترقی کو آپ اسلامی ترقی' ان کے فائدے کو آپ اسلامی مفاد قرار دیتے ہیں' خواہ یہ حکومت اور یہ ترقی اور یہ مفاد سراسر اصول اسلام کے منافی ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح جرمنیت کسی اصول کا نام نہیں' محض ایک قومیت کا نام ہے' اور جس طرح ایک جرمن قوم پرست صرف جرمنوں کی سربلندی چاہتا ہے' خواہ کسی طریقے سے ہو' اسی طرح آپ نے بھی "مسلمانیت" کو محض ایک قومیت بنا لیا ہے اور آپ کے مسلمان قوم پرست محض اپنی قوم کی سربلندی چاہتے ہیں خواہ یہ سربلندی اصولاً اور عملاً اسلام کے بالکل برعکس طریقوں کی پیروی کا نتیجہ ہو۔ کیا یہ جاہلیت نہیں ہے؟ کیا درحقیقت آپ اس بات کو بھول نہیں گئے ہیں کہ مسلمان صرف اس بین الاقوامی پارٹی کا نام تھا جو دنیا میں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ایک خاص نظریہ اور ایک عملی پروگرام لے کر اٹھی تھی؟ اس نظریہ اور پروگرام کو الگ کرنے کے بعد محض اپنی شخصی یا اجتماعی حیثیت سے جو لوگ کسی دوسرے نظریہ اور پروگرام پر کام کرتے ہیں ان کے کاموں کو آپ

"اسلامی" کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ جو شخص سرمایہ داری کے اصول پر کام کرتا ہو' اسے اشتراکی کے نام سے یاد کیا جائے؟ کیا سرمایہ دارانہ حکومت کو بھی آپ اشتراکی حکومت کہتے ہیں؟ کیا فاشستی طرز ادارہ کو آپ جمہوری طرز ادارہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں؟ اگر کوئی شخص اس طرح اصطلاحوں کو بے جا استعمال کرے تو آپ شاید اسے جاہل اور بے وقوف کہنے میں ذرا تامل نہیں کریں گے۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان کی اصطلاح کو بالکل بے جا استعمال کیا جا رہا ہے اور اس میں کسی کو جاہلیت کی بو تک محسوس نہیں ہوتی۔

مسلمان کا لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ "اسم ذات" نہیں بلکہ "اسم صفت" ہی ہو سکتا ہے اور "پیرو اسلام" کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اس خاص ذہنی' اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام "اسلام" ہے۔ لہذا آپ اس لفظ کو محض مسلمان کے لیے اس طرح استعمال نہیں کر سکتے جس طرح آپ ہندو یا جاپانی یا چینی کے الفاظ محض ہندو' محض جاپانی یا محض چینی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جونہی اصول اسلام سے ہٹا' اس سے مسلمان ہونے کی حیثیت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔ اب وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی شخصی حیثیت میں کرتا ہے۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح "مسلمان کا مفاد"' "مسلمان کی ترقی"' "مسلمان کی حکومت و ریاست"' "مسلمان کی وزارت"' "مسلمان کی تنظیم" اور ایسے ہی دوسرے الفاظ آپ صرف ان مواقع پر بول سکتے ہیں جب کہ یہ چیزیں اسلامی نظریہ اور اصول کے مطابق ہوں اور اس مشن کو پورا کرنے سے متعلق ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی لفظ مسلمان کا استعمال درست

نہیں۔[1] آپ ان کو جس دوسرے نام سے چاہیں' موسوم کریں' بہرحال مسلمان کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے کیونکہ صفت اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان سرے سے کوئی شے ہی نہیں ہے۔ آپ کبھی اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت سے قطع نظر کر کے کسی شخص یا قوم کا نام اشتراکی ہے اور اس معنی میں کسی مفاد کو اشتراکی مفاد یا کسی حکومت یا کسی تنظیم کو اشتراکیوں کی حکومت یا تنظیم یا کسی ترقی کو اشتراکیوں کی ترقی کہا جا سکتا ہے۔ پھر آخر مسلمان کے معاملہ میں آپ نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان کسی شخص یا قوم کا ذاتی نام ہے اور اس کی ہر چیز کو اسلامی کہہ دیا جا سکتا ہے۔

اس غلط فہمی نے بنیادی طور پر اپنی تہذیب' اپنے تمدن اور اپنی تاریخ کے متعلق آپ کے رویہ کو غلط کر دیا ہے۔ جو بادشاہتیں اور حکومتیں غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہوئی تھیں آپ ان کو "اسلامی حکومتیں" کہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ ان کے تخت نشین مسلمان تھے۔ جو تمدن قرطبہ و بغداد اور دہلی و قاہرہ کے عیش پرست درباروں میں پرورش پایا تھا' آپ اسے "اسلامی تمدن" کہتے ہیں حالانکہ اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرے کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں گویا یہ ہے اس تہذیب کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ۔ حالانکہ اسلامی تہذیب سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ ایک میت کو سپرد خاک کرنے کے لیے ایکڑوں زمین مستقل طور پر گھیر لی جائے اور اس پر لاکھوں روپے کی عمارت تعمیر کی جائے۔ آپ جب اسلامی تاریخ کے مفاخر بیان

---

[1] مسلمان کا مفاد بجائے خود کوئی غلط چیز نہیں ہے لیکن جو چیز اسلام کے خلاف ہو اس میں مسلمان کا مفاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اصل چیز یہ ہے کہ تمام امور کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ مرتب

کرنے پر آتے ہیں تو عباسیوں' سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اسلامی تاریخ کے نقطہ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصہ آب زر سے نہیں بلکہ سیاہ روشنائی سے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا نام "اسلامی تاریخ" رکھ چھوڑا ہے' بلکہ آپ اسے "تاریخ اسلام" بھی کہہ دیتے ہیں' گویا ان بادشاہوں کا نام اسلام ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اسلام کے مشن اور اس کے اصول و نظریات کو سامنے رکھ کر اپنی گزشتہ تاریخ کا احتساب کریں' اور پورے انصاف کے ساتھ اسلامی حرکات کو غیر اسلامی حرکات سے ممتاز کر کے دیکھیں اور دکھائیں۔ اسلامی تاریخ کی خدمت آپ اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کی حمایت و مدافعت کریں۔ آپ کے زاویہ نظر میں یہ کجی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ مسلمان کی ہر چیز کو "اسلامی" سمجھتے ہیں اور آپ کا گمان یہ ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے وہ اگر غیر مسلمانہ طریق پر بھی کام کرے تو اس کے کام کو مسلمان کا کام کہا جا سکتا ہے۔

یہی ٹیڑھا زاویہ نظر آپ نے اپنی ملی سیاست میں بھی اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کے اصول و نظریات اور اس کے مشن سے قطع نظر کر کے آپ ایک قوم کو "مسلم قوم" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس قوم کی طرف سے' یا اس کے نام سے' یا اس کے لیے ہر شخص اور ہر گروہ من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ بلکہ ان کا لیڈر بھی بن سکتا ہے جو "مسلمانوں کی قوم" سے تعلق رکھتا ہو' خواہ اس غریب کو اسلام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ آپ ہر اس پارٹی کے ساتھ لگ چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی پیروی میں آپ کو کسی نوعیت کا فائدہ نظر آئے' خواہ اس کا مشن اسلام کے مشن سے کتنا ہی مختلف ہو۔ آپ خوش ہو جاتے ہیں جب مسلمانوں کو چار روٹیاں ملنے کا کوئی انتظام ہو جائے' خواہ اسلام کی نگاہ میں وہ حرام کی روٹیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ پھولے نہیں سماتے جب کسی جگہ مسلمان آپ کو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے' خواہ وہ

اس اقتدار کو بالکل اسی طرح غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہو' جس طرح ایک غیر مسلم کر سکتا ہے۔ آپ اکثر ان چیزوں کا نام اسلامی مفاد رکھتے ہیں جو حقیقتاً غیر اسلامی ہیں' ان اداروں کی حمایت و حفاظت پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو اصول اسلام کے بالکل خلاف قائم ہوئے ہیں' اور ان مقاصد کے پیچھے اپنا روپیہ اور اپنی قومی طاقت ضائع کرتے ہیں جو ہرگز اسلامی نہیں ہیں۔ یہ سب نتائج اسی ایک بنیادی غلطی کے ہیں کہ آپ نے اپنے آپ کو محض ایک "قوم" سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو آپ بھول گئے ہیں کہ دراصل آپ ایک "بین الاقوامی پارٹی" ہیں جس کا کوئی مفاد اور کوئی مقصد اپنی پارٹی کے اصولوں کو دنیا میں حکمران بنانے کے سوا نہیں ہے۔ جب تک آپ اپنے اندر قوم کے بجائے پارٹی کا تصور پیدا نہ کریں گے اور اس کو ایک زندہ تصور نہ بنائیں گے' زندگی کے کسی معاملہ میں بھی آپ کا رویہ درست نہ ہو گا۔

استدراک

اس مضمون کی اشاعت کے بعد متعدد اصحاب نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ "اسلامی جماعت" کو "قوم" کے بجائے پارٹی کہنے سے اس امر کی گنجائش نکلتی ہے کہ وہ کسی وطنی قومیت کی جزء بن کر رہے۔ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ الگ مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اس بڑے مجموعے میں شامل رہتی ہیں جس کو "قوم" کہا جاتا ہے' اسی طرح اگر مسلمان ایک پارٹی ہیں تو وہ بھی اپنے وطن کی قوم کا ایک جزء بن کر رہ سکتے ہیں۔

چونکہ جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی یا پولیٹیکل پارٹی کے معنی میں لیتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ غلط فہمی پیدا ہوئی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں بکثرت استعمال

ہونے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے' نظریے' مسلک اور مقصد پر مجتمع ہوں وہ ایک جماعت ہیں۔ اس معنی میں قرآن نے "حزب" اور "امت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں' اور اسی معنی میں "جماعت" کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے اور یہی مفہوم "پارٹی" کا بھی ہے۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس قوم کا جزء بن کر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریہ اور جہانی تصور (World Idea) لے کر اٹھتی ہے۔ جس کے سامنے تمام بنی نوع انسانی کے لیے بلالحاظ قوم و وطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے۔ جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے۔ جس کا نظریہ و مسلک' عقائد و افکار اور اصول اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تمدن (Civilisation) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے' لیکن یہ اس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جزء بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ ان نسلی و روایتی تعصبات کو توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنتی ہیں۔ پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Rational Nationality) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expending Nationality) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے

زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے۔

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (Civilisation) بنانے کے لیے اٹھتی ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہو گا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریہ حیات اور فلسفہ اجتماعی (Social Philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے "قوم" ہونے کے باوجود یہ حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاق پیدائش (Mere Accident of Birth) کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی۔ جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس کے لیے اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی قومیت اس کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہوتا ہے جماعتی حیثیت جڑ کا حکم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کا تنزل (Degeneration) ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی اور انوکھی واقع ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے بدھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالمگیر برادری بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا اجتماعی فلسفہ نہ تھا جس کی بنیاد پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کلی نظام بنا سکتے۔ اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (Brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی سائنٹیفک تہذیب اٹھی' جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا' مگر اول یوم پیدائش سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا۔ لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدوں کو توڑ کر جہانی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو۔ لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے' جو اس کے پیش نظر ہے' اس لیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالم گیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی ہے۔[1] اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالم گیر قومیت بناتا ہے' لہٰذا جو لوگ اسلام کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی

---

[1] بلکہ اب خود مارکسیت کے اندر بھی نیشنلزم کے جراثیم پہنچ گئے ہیں۔ اسٹالین اور اس کی جماعت کے طرز عمل میں روسی قوم پرستی کا جذبہ روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ روسی اشتراکیت کے لٹریچر میں' حتیٰ کہ ۱۹۳۶ء کے جدید دستور حکومت میں بھی جگہ جگہ "فادر لینڈ" (وطن آبائی) کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اسلام کو دیکھیے یہ ہر جگہ "دارالاسلام" کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ فادر یا مادر لینڈ کا۔

ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے۔ اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو' اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اس سے خارج ہو جاتا ہو۔ ان کے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے' اپنی مستقل قومیت کا ادعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو ان کے لیے یہ معاملہ ایک چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی نافہمی غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گزارنے کی وجہ سے ان کے اندر "تاریخی قومیت" کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصلی حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی' جس کی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا' جس کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفہ اجتماعی کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انہوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں موجود ہیں۔ اب ان کی مجلسوں اور انجمنوں میں' ان کی کانفرنسوں اور جمعیتوں میں' ان کے اخباروں اور رسالوں میں' کہیں بھی ان کی اجتماعی زندگی کے اس مشن کا ذکر نہیں آتا۔ جس کے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں میں سے نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا۔ اس مشن کے بجائے اب جو چیز ان کی تمام توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے' وہ "مسلمانوں" کا مفاد ہے۔ مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ

کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں' اور مفاد سے مراد ان نسلی مسلمانوں کا مادی و سیاسی مفاد ہے یا بدرجہ آخر اس کلچر کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثہ میں ملی ہے۔۔۔ اس مفاد کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو' اس کی طرف یہ دوڑ جاتے ہیں' بالکل اسی طرح جس طرح مسولینی ہر اس طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو اطالویوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ کسی اصول اور نظریہ کا نہ وہ پابند ہے نہ یہ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اطالویوں کے لیے مفید ہو' وہ حق ہے۔ یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں' اور اسی تنزل کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو' اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس (Party sense) پیدا کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے برے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر رو کے پیچھے چلنے اور ہر نظریے اور مسلک کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے' خواہ وہ اسلام کے نظریے اور اس کے مقاصد اور اس کے اصولوں سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو۔ وہ نیشنلسٹ بھی بنتا ہے۔ کمیونسٹ بھی بن جاتا ہے۔ فاشستی اصول تسلیم کرنے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ مغرب کے مختلف اجتماعی فلسفوں اور مابعد الطبیعی افکار اور علمی نظریات میں سے قریب قریب ہر ایک کے پیرو آپ کو مسلمانوں میں مل جائیں گے۔ دنیا کی کوئی سیاسی' اجتماعی یا تمدنی تحریک ایسی نہیں جس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسلمان شریک نہ ہوں اور لطف یہ ہے کہ یہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' سمجھتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ ان مختلف راہوں پر بھٹکنے اور دوڑنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ "مسلمان" کوئی پیدائشی لقب نہیں ہے بلکہ اسلام کی راہ پر چلنے والے کا اسم صفت ہے' جو شخص اسلام کی راہ سے ہٹ کر کسی دوسری راہ پر چلے' اس کو مسلمان کہنا اس لفظ کا بالکل غلط

استعمال ہے۔ مسلم نیشنلسٹ اور مسلم کمیونسٹ اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحیں بالکل اسی طرح کی متناقض اصطلاحیں ہیں جس طرح "کمیونسٹ مہاجن" اور "بدمست قصائی" کی اصطلاحیں متناقض ہیں۔

حصہ دوم

اسلامی نظم مملکت: اصول اور نظام کار

- اسلام کے دستوری قانون کے ماخذ
- اسلامی ریاست کی بنیادیں
- اسلامی دستور کی بنیادیں
- اسلامی ریاست کا مثالی دور
- اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد
- چند دستوری اور سیاسی مسائل

باب ٦

اسلام کے دستوری قانون کے ماخذ

- قرآن مجید
- سنت رسولؐ اللہ
- خلافت راشدہ کا تعامل اور مجتہدین امت کے فیصلے
- مشکلات اور موانع
- ضمیمہ: سنت رسولؐ بحیثیت ماخذ قانون

کتاب کے اس دوسرے حصے میں ہم اسلامی ریاست کے بنیادی اصول اور اس کے نظام کار کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ اس سے اسلامی دستور کا ایک واضح خاکہ بھی ہمارے سامنے آجائے گا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ میں سب سے پہلے ہم اسلام کے دستوری قانون کے ماخذ سے بحث کر لیں تاکہ بعد کے تمام مباحث کی اساس ہمارے سامنے آ جائے۔ اسلامی ریاست کے بارے میں اگر پہلے ہی قدم پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کے اصل ماخذ قرآن و سنت ہیں' دوسرے ممالک کے تجربات نہیں تو بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہی نہ ہوں۔ مسلمان ممالک کے موجودہ حکمرانوں اور متجددین کی اصل فکری غلطی ہی یہ ہے کہ وہ بات تو کرتے ہیں اسلامی ریاست کی لیکن بطور ماخذ رجوع کرتے ہیں مغربی اقوام کی طرف۔ بلاشبہ ہم دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن خود اپنے نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اور اس کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب سے پہلے دستوری ماخذ اور ان سے استفادہ کی راہ کی مشکلات کو پیش کر رہے ہیں۔

اس بحث کی ضرورت ایک اور وجہ سے بھی پیش آئی --- اور وہ ہے فتنہ انکار حدیث۔ ایک گروہ حدیث کے بارے میں ذہنوں کو مشکوک کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کے حجت اور ماخذ قانون ہونے پر اعتراض کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر پر تنقید اور صحیح صورت حال کی تشریح بے حد ضروری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی نظم مملکت کا کوئی واضح خاکہ بن ہی نہیں سکتا۔

اس باب کو مصنف محترم کی مختلف تحریرات سے مرتب کیا گیا ہے اور حاشیوں میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی گئی ہے جہاں سے متعلقہ مواد لیا گیا ہے۔

مرتب
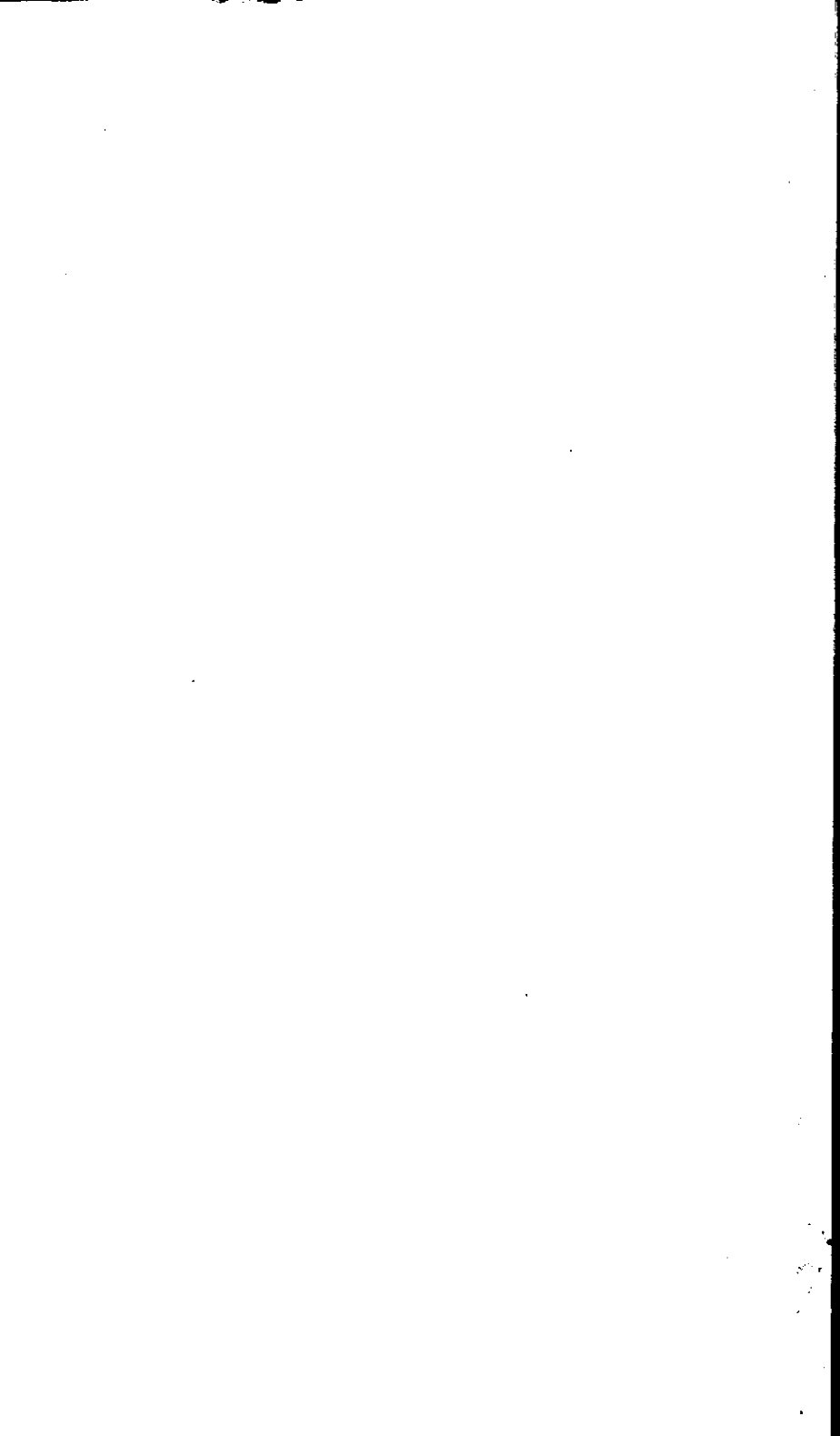
اسلام کے دستوری قانون کے ماخذ

اسلامی ریاست وہ ریاست ہے جو حاکمیت الٰہی اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کو اس کے تمام تضمنات کے ساتھ قائم کرنے کی داعی ہو۔ آج دنیا میں جہاں بھی ایسی ریاست قائم کرنے اور اس کی نوعیت اور نظام کار متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی تو چند خاص ماخذ کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور وہ ہیں قرآن' سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' تعامل خلافت راشدہ اور مجتہدین امت کے فیصلے۔ اسلام کے غیر تحریری دستور مملکت کے یہی چار ماخذ ہیں۔ اور انھی کے مطالعہ سے اسلامی ریاست کی نوعیت اور اس کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے اور انھی سے ہم وہ اصول و کلیات اور احکام و دفعات اخذ کر سکتے ہیں جو اسلامی دستور کا جزو ہوں گی۔

(۱)

قرآن مجید

اس کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے۔ اسلام [۱] کی اصطلاح میں "کتاب" سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لیے اللہ کی طرف سے رسول پر نازل کی جاتی ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے کتاب گویا اسی پیغام کا سرکاری بیان (Official Version) یا اسلامی اصطلاح کے مطابق "الٰہی کلام" ہے جسے لوگوں تک پہنچانے، جس کی توضیح و تشریح کرنے، اور جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پیغمبر دنیا میں بھیجے گئے۔ سنت اللہ یہ ہے کہ خدا کو پیغمبر کے ذریعہ سے جو تعلیم بندوں کو دینی مقصود ہے وہ اس کے اصول و مہمات مسائل پیغمبر کے دل پر القا کرتا ہے۔ اس ہدایت کے الفاظ اور معانی دونوں میں پیغمبر کی اپنی عقل و فکر، ارادے اور خواہش کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ پیغمبر اس کلام کو ایک امانت دار قاصد کی حیثیت سے خدا کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر خدا کے عطا کیے ہوئے علم اور بصیرت سے اس کے معانی و مطالب کی تشریح کرتا ہے، انھی الٰہی اصولوں پر اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدن کا نظام قائم کرتا ہے۔ اپنی تعلیم و تلقین اور اپنی پاکیزہ سیرت سے لوگوں کے خیالات و رجحانات اور افکار میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے۔ تقویٰ اور طہارت اور پاکیزگی نفس اور حسن عمل کی روح ان میں پھونکتا ہے۔ اپنی تربیت اور عملی رہنمائی سے ان کو اس طور پر منظم کرتا ہے کہ ان سے ایک نئی

---

[۱] ماخوذ از "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی"۔

سوسائٹی، نئی ذہنیت، نئے افکار و خیالات، نئے آداب واطوار اور نئے آئین وقوانین کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے، پھر وہ ان میں اللہ کی کتاب اور اس کے ساتھ اپنی سنت، اپنی تعلیم اور اپنی پاکیزہ سیرت کے آثار چھوڑ جاتا ہے جو ہمیشہ اس جماعت اور اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کی نازل کردہ کتب سماوی میں سب سے آخری اور مکمل ترین کتاب ہے۔ مسلمان ایمان تو تمام آسمانی کتب پر رکھتے ہیں لیکن ان کے لیے قانون ہدایت اور آئین زندگی کی حیثیت صرف قرآن مجید کو حاصل ہے۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جہاں سے بالفعل اتباع کی سرحد شروع ہوتی ہے، وہاں دوسری کتابوں سے تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کے ساتھ تعلق استوار کیا گیا ہے اور ہمارے لیے یہی کتاب اصل ماخذ ہدایت اور حجت (Authority) ہے، اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

۱۔ قرآن مجید انھی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پیش کیا تھا۔ اول روز سے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں آدمیوں نے ہر زمانے میں اس کو لفظ بہ لفظ یاد کیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے روزانہ اس کی تلاوت کی ہے، ہمیشہ اس کے نسخے ضبط کتابت میں لائے جاتے رہے ہیں اور کبھی اس کی عبارت میں ذرہ برابر اختلاف نہیں پایا گیا ہے۔ لہٰذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو قرآن نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا گیا تھا وہی آج دنیا میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس میں کبھی ایک لفظ کا تغیر و تبدل نہ ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ وہ عربی زبان میں اترا ہے جو ایک زندہ زبان ہے اور آج تک اس زبان کا فصیح اور معیاری لٹریچر وہی ہے جو نزول قرآن کے وقت تھا۔ اس کے معانی و مطالب معلوم کرنے میں انسان کے لیے وہ دقتیں نہیں ہیں جو مردہ زبانوں کی کتابوں کو سمجھنے میں پیش آتی ہیں۔

۳ - وہ سراسر حق، اور از اول تا آخر الٰہی تعلیمات سے لبریز ہے۔ اس میں کہیں انسانی جذبات، نفسانی خواہشات، قومی یا طائفی خود غرضیوں اور جاہلانہ گمراہیوں کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس کے اندر کلام الٰہی کے ساتھ انسانی کلام کی ذرہ برابر آمیزش نہیں ہو سکی ہے۔

۴ - وہ ایک جامع کتاب ہے جس کے اندر ان تمام حقائق و معارف اور خیرات و صالحات کو جمع کر دیا گیا ہے جو اس سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں بیان کیے گئے تھے۔ ایسی جامع کتاب کی موجودگی میں انسان آپ سے آپ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

۵ - وہ آسمانی ہدایات اور الٰہی تعلیمات کا جدید ترین مجموعہ (Latest Edition) ہے۔ بعض ہدایات جو پچھلی کتابوں میں مخصوص حالات کے تحت دی گئی تھیں، وہ اس میں سے نکال دی گئیں اور بہت سی نئی تعلیمات جو پچھلی کتابوں میں نہ تھیں، اس میں اضافہ کر دی گئیں۔ **ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا ط الم تعلم ان اللہ علٰی کل شئی قدیر** (البقرہ۔ ۱۰۶)

لہٰذا جو شخص آباؤ اجداد کا نہیں بلکہ فی الواقع خدائی ہدایت کا پیرو ہے اس کے لیے لازم ہے کہ اسی آخری اور جدید ایڈیشن کا اتباع کرے نہ کہ پرانے ایڈیشنوں کا۔ حجت اب قرآن ہے، اس سے پہلے کی کتب نہیں۔ یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر اسلام نے تمام کتابوں سے اتباع کا تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کو متبوع قرار دیا ہے اور تمام دنیا کو دعوت دی ہے کہ وہ اسی ایک کتاب کو اپنا دستور العمل بنائے اور مسلمانوں کے لیے اسی کتاب کو اولیں ماخذ ہدایت قرار دیا۔

انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما ارک اللہ۔

(النساء۔ ۱۰۵)

ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے

درمیان اس علم حق کے ساتھ فیصلہ کرے جو خدا نے تجھے دیا ہے۔

فالذین امنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون (الاعراف = ۱۵۷)

پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی مدد اور حمایت کی اور اس نور کا اتباع کیا جو ان کے ساتھ اترا ہے' وہی فلاح پانے والے ہیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ...... فاولئک ھم الظلمون...... فاولئک ھم الفاسقون..... (المائدہ - ۴۴ - ۴۷)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں...... وہی ظالم ہیں...... وہی فاسق ہیں۔

یہاں[1] اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں' دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں' تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً" اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً" اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے' کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا' اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی

---

[1] ماخوذ از تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۷۵ - ۴۷۶۔

نوعیت کے اعتبار سے لازما انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں تبہ کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو' وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں البتہ جس طرح انحراف کے درجات و مراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔

مسلمانوں[1] کے لیے اصل سند اور حجت قرآن پاک ہے جو چیز قرآن کے خلاف ہے وہ ہرگز قابل اتباع نہیں ہے۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیآء۔

(الاعراف ۔ ۳)

جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی پیروی نہ کرو۔

اور قرآن کے احکام اور اس کی تعلیمات میں رد و بدل کا حق کسی کو' حتیٰ کہ پیغمبر کو بھی نہیں ہے۔

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائی نفسی ج ان اتبع الا ما یوحیٰ الی ج انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم۔ (یونس : ۱۵)

اے محمد ﷺ! کہہ دو کہ میں اس کتاب کو اپنی طرف سے بدلنے کا حق نہیں رکھتا۔ میں تو صرف اسی وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف اتاری جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

قرآن مجید[2] اسلامی تصور ریاست کا سب سے پہلا ماخذ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین ہیں۔ یہ احکام و فرامین انسان کی پوری زندگی کے

---

[1] ماخوذ از اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ۔ صفحہ ۲۲۷ ۔ ۲۲۸

[2] اسلامی دستور کی بنیادیں۔ صفحہ ۵۔

معاملات پر حاوی ہیں۔ ان میں صرف انفرادی کردار اور سیرت ہی کے بارے میں ہدایات نہیں دی گئی ہیں بلکہ اجتماعی زندگی (Social Life) کے بھی ہر پہلو کی اصلاح و تنظیم کے لئے کچھ اصول اور کچھ قطعی احکام دیئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان اپنی ریاست کن اصولوں اور کن مقاصد کے لئے قائم کریں۔

(۲)

سنت رسول اللہ ﷺ[1]

دوسرا[2] ماخذ سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کی ہدایات کو اور اس کے دیئے ہوئے اصولوں کو عرب کی سرزمین میں کس طرح نافذ کیا، کس طرح اسلام کے تخیل کو عمل کا جامہ پہنایا، کس طرح اس تخیل پر ایک سوسائٹی کی تشکیل کی، پھر کس طرح اس سوسائٹی کو منظم کر کے ایک اسٹیٹ کی شکل دی اور اس اسٹیٹ کے مختلف شعبوں کو کس طرح چلا کر بتایا۔ یہ چیزیں سنت رسول اللہ ﷺ ہی سے ہمیں معلوم ہو سکتی ہیں اور انہی کی مدد سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ قرآن کا ٹھیک ٹھیک منشا کیا ہے، یہ قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کا عملی حالات پر انطباق ہے جس سے ہم کو اسلامی دستور کے لئے نہایت قیمتی نظائر (Precedents) حاصل ہوتے ہیں اور دستوری روایات (Conventions of the Constitution) کا بڑا اہم مواد بہم پہنچتا ہے۔

سنت ہمارے دستوری قانون کا دوسرا ماخذ ہے اور بڑا ہی اہم ماخذ ہے۔ افسوس ہے کہ ایک عرصہ سے ایک گروہ اس کی اہمیت کو کم کرنے اور اس کے

---

[1] اس موضوع پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو: سنت کی آئینی حیثیت از مولانا مودودی، تفہیمات جلد اول و تفہیمات جلد سوم۔

[2] اسلامی دستور کی بنیادیں صفحہ ۶۔

قانونی حجت (Legal Sanction) ہونے کے پہلو کا انکار کر کے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار برپا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس لئے ہم مختصراً اس کے حجت ہونے پر روشنی ڈالیں گے۔

یہ [1] ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجہ میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی۔ ایک نیا نظام تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوا یہ دوسرے کام جو محمد ﷺ نے کئے' یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنانے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح محض ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و حجت نہیں رکھتا۔ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و حجت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ محمد ﷺ صرف نامہ بر نہیں تھے' بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کئے ہوئے رہبر' حاکم اور معلم بھی تھے جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہل ایمان کے لئے نمونہ قرار دیا گیا تھا اور آپ ان تمام حیثیتوں میں مامور من اللہ

---

[1] بین الاقوامی اسلامی کلوکیم میں پڑھے ہوئے مقالہ پر اعتراضات کے جواب میں یہ باتیں کہی گئی تھیں جو ترجمان القرآن بابت جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ "سنت کی آئینی حیثیت" سے بھی کچھ اقتباسات یہاں لئے گئے ہیں۔

تھے۔ مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں نے باختیار خود آپ ﷺ کو اپنا لیڈر منتخب نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس قیادت کے منصب سے وہ نعوذ باللہ آپ کو ہٹانے کے مجاز تھے اور نہ ہی ایسا ہوا کہ مدینہ پہنچ کر جب اسلامی ریاست کی بنا ڈالی گئی اس وقت انصار و مہاجرین نے کوئی مشاورت منعقد کر کے یہ طے کیا ہو کہ محمد ﷺ ہماری اس ریاست کے صدر اور قاضی اور افواج کے قائد اعلیٰ ہوں گے۔ قرآن حضور اکرم ﷺ کی یہ تمام حیثیتیں خود متعین کرتا ہے اور یہ سب منصب نبوت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نبی ہو اور اس کے بعد وہ محض ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آغاز اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد ﷺ کو نمونہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نہی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امر واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی یہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ دوسرا ماخذ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیلنج کر سکتا ہے جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد ﷺ صرف تلاوت قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ہی ان کی حیثیت نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرت ﷺ کو بطور خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضور ﷺ کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔

اس بارے میں کوئی اشتباہ نہیں چھوڑا گیا کہ۔

قرآن نے حضور اکرم ﷺ کی کیا حیثیت متعین کی ہے اور منصب رسالت کے کون کون سے کام آپ ﷺ نے انجام دیئے۔

(الف) رسول اللہ ﷺ بحیثیت معلم و مربی

قرآن پاک [1] میں چار مقامات پر نبی اکرم ﷺ کے منصب رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ...... ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتک ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم۔

(البقرہ۔ آیت: ۱۲۷۔۱۲۹)

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم اور اسماعیل اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (انہوں نے دعا کی) .... اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم ایتنا و یزکیکم و یعلمکم الکتب والحکمۃ و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون۔ (البقرہ۔ آیت: ۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا' جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ۔ (آل عمران: ۱۶۴)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جب کہ ان کے اندر خود انہی

---

[1] اقتباسات از "سنت کی آئینی حیثیت" صفحہ ۷۴ تا ۸۵

میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة (الجمعہ: ۲)

وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کرسناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو بتاکید دہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو صرف آیات قرآن سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔

ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔

اور تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں، یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشوونما دیں۔

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ ذکر بے معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لئے آپ ﷺ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی قرآن کے الفاظ کو پڑھ کر سنا دینے سے زائد ہی کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی اس الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے اور قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلم اور مربی کے مناصب جو حضور اکرم ﷺ کو حاصل تھے ان پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مامور فرمایا تھا۔ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرر تصریحات کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب رسالت کے

اجزاء نہ تھے اور آنحضرت ﷺ ان مناصب کے فرائض اور خدمات بحیثیت رسول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو بتایئے کہ قرآن کے الفاظ سنانے سے زائد جو باتیں حضور اکرم ﷺ نے تعلیم کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائیں اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو تربیت حضور اکرم ﷺ نے کی اسے من جانب اللہ ماننے اور سند تسلیم کرنے سے انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

(ب) رسول اللہ ﷺ بحیثیت شارح کتاب اللہ

سورہ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم۔ (آیت: ۴۴)

اور (اے نبی ﷺ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لئے واضح کردو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے ان کی آپ توضیح و تشریح فرمائیں۔ ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی بات کی تشریح و توضیح محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ (Practical Demonstration) کر کے بتاتا ہے کہ مصنف کا منشا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی طفل مکتب کے نزدیک بھی تشریح و توضیح قرار پا سکتا۔ اب فرمایئے کہ اس آیت کی رو سے نبی اکرم ﷺ قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسول

اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرے پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارح قرآن کی حیثیت سے آپ ﷺ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے اور آپ کے پہنچائے ہوئے الفاظ قرآن کو لے کر آپ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہو گا۔

(ج) رسول اللہ ﷺ بحیثیت پیشوا و نمونہ تقلید

سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله .... قل اطيعوا الله والرسول فان تولوا فان الله لا يحب الكفرين۔ (آیات: ۳۱-۳۲)

(اے نبی ﷺ) کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا...... کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی' پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورہ احزاب میں فرماتا ہے:

لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الاخر۔ (آیت: ۲۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ تقلید ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو پیشوا مقرر کر رہا ہے' ان کی پیروی کا حکم دے رہا ہے' ان کی زندگی کو نمونہ تقلید قرار دے رہا ہے' اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو' میری محبت اس کے بغیر تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی' بلکہ اس سے منہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمایئے کہ حضور اکرم ﷺ رہنما اور لیڈر خود بن بیٹھے تھے؟ یا مسلمانوں نے آپ ﷺ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپ ﷺ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضور ﷺ کا مامور من اللہ رہنما و پیشوا

قرار دے رہے ہیں' تو پھر آپ ﷺ کی پیروی اور آپ ﷺ کے نمونہ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔ اگر یہ مراد ہوتی تو فاتبعوا القرآن فرمایا جاتا نہ کہ فاتبعونی۔ اور اس صورت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اسوہ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

(د) رسول اللہ ﷺ بحیثیت شارع

سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبئث ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم۔ (آیت: ۱۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو تشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کئے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر ونہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے' بلکہ جو کچھ نبی اکرم ﷺ نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے' وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے' اس لئے وہ بھی قانون خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ یہی بات سورہ حشر میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے:

وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا ج واتقوا اللہ ط ان اللہ شدید العقاب۔ (آیت: ۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اس سے

رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو' اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جا سکتی کہ ان میں قرآن کے امر اور قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے۔ یہ تاویل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہو گی۔ اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسول کا فعل قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص اللہ میاں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہو گئی' آپ بھولے سے قرآن کے بجائے رسول کا نام لے گئے۔

(ھ) رسول اللہ ﷺ بحیثیت قاضی

قرآن میں ایک جگہ نہیں' بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ اس امر کی تصریح فرماتا ہے کہ اس نے نبی اکرم ﷺ کو قاضی مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ۔

(النساء: ۱۰۵)

(اے نبی ﷺ) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔

وقل امنت بما انزل اللہ من کتب وامرت لاعدل بینکم۔

(الشوریٰ: ۱۵)

اور (اے نبی ﷺ) کہو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا۔ (النور: ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

واذا قیل لہم تعالوا الی ما انزل اللہ و الی الرسول رایت المنافقین یصدون عنک صدودا۔ (النساء: ۶۱)

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ وہ تم سے کنی کتراتے ہیں۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء: ۶۵)

پس (اے نبی ﷺ) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسرو چشم قبول کرلیں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی اکرم ﷺ خود ساختہ یا مسلمانوں کے مقرر کئے ہوئے جج نہیں بلکہ اللہ تعالی کے مقرر کئے ہوئے جج تھے۔ تیسری آیت بتا رہی ہے کہ آپ ﷺ کی جج ہونے کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسول ہی کی حیثیت میں آپ ﷺ جج بھی تھے اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپ ﷺ کی اس حیثیت کے آگے بھی سمع و طاعت کا رویہ نہ اختیار کرلے۔ چوتھی آیت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لئے دو مستقل مرجع ہیں' ایک قرآن قانون کی حیثیت سے' دوسرے رسول ﷺ جج کی حیثیت سے' اور ان دونوں سے منہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے لاگ طریقہ سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو شخص جج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے' حتی کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے فیصلے پر کوئی شخص اپنے دل میں بھی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔

(و) رسول اللہ ﷺ بحیثیت حاکم و فرمانروا

قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے اور آپ ﷺ کو یہ منصب بھی رسول اللہ ﷺ کی حیثیت سے عطا ہوا تھا۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللّٰہ۔ (النساء: ۶۴)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن (Sanction) سے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (النساء: ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللّٰہ (الفتح: ۱۰)

(اے نبی ﷺ) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

یا ایہا الذین امنوا اطیعو اللّٰہ و اطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم۔

(محمد: ۳۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرلو۔

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللّٰہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ط ومن یعص اللّٰہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔

(الاحزاب: ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کردے تو پھر ان کے لئے اپنے اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر۔ (النساء:۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہوجائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روز آخر پر۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ رسول کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو' یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو' بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی اس کے منصب رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اس کا حاکم مطاع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں اہل ایمان کو (جن میں ظاہر ہے کہ پوری امت اور ان کے حکمران سب شامل ہیں) قطعاً" یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کرچکا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔

ان تمام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے:

سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت۔

پھر تیسرے درجے میں اولی الامر کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں ہے'

بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نزاعات میں فیصلے کے لئے مرجع دو ہیں' ایک اللہ' دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسول ﷺ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جب کہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہد رسالت میں خود ذات رسول کی طرف اور اس عہد کے بعد سنت رسول کی طرف رجوع کیا جائے۔[1]

سنت کے ماخذ قانون ہونے پر امت کا اجماع

اب اگر آپ واقعی قرآن کو مانتے ہیں اور اس کتاب مقدس کا نام لے کر خود اپنے من گھڑت نظریات کے معتقد بنے ہوئے نہیں ہیں' تو دیکھ لیجئے کہ قرآن مجید صاف و صریح اور قطعاً" غیر مشتبہ الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا معلم' مربی' پیشوا' رہنما' شارح کلام اللہ' شارع

---

[1] بلکہ اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہد رسالت میں بھی بہت بڑی حد تک سنت رسول اللہ ﷺ ہی مرجع تھی۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرہ عرب پر پھیلی ہوئی تھی۔ دس بارہ لاکھ مربع میل کے اس وسیع و عریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ براہ راست نبی اکرم ﷺ سے کرایا جائے۔ لا محالہ اس زمانے میں بھی اسلامی حکومت کے گورنروں' قاضیوں اور دوسرے حکام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قرآن کے بعد جس دوسرے ماخذ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا وہ سنت رسول اللہ ﷺ ہی تھی۔

(Law Giver)، قاضی اور حاکم و فرمانروا قرار دے رہا ہے، اور حضور اکرم ﷺ کے یہ تمام مناصب اس کتاب پاک کی رو سے منصب رسالت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ کلام الٰہی کی یہی تصریحات ہیں جن کی بناء پر صحابہ کرام کے دور سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں نے بالاتفاق یہ مانا ہے کہ مذکورہ بالا تمام حیثیات میں حضور اکرم ﷺ نے جو کام کیا ہے وہ قرآن کے بعد دوسرا ماخذ قانون (Source of Law) ہے۔

سنت کو بجائے خود ماخذ قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس سوال سے سابقہ پیش نہیں آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں ناقابل انکار ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمد ﷺ کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرز فکر، اخلاق اور اقدار، عبادات اور معاملات، نظریہ حیات اور طریق حیات کے اعتبار سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے، جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے، جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے، یہی اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو ایک سنت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لئے ہمیں اندھیرے میں ٹٹولنا پڑ رہا ہو۔

جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے عہد نبوت میں

مسلمانوں کے لئے محض ایک پیر و مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد' رہنما' حاکم' قاضی' شارع' مربی' معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لے کر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ﷺ ہی کے بتائے' سکھائے اور مقرر کئے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لئے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے نماز روزے اور مناسک حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ ﷺ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً" مسجدوں میں رائج ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں' اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ ﷺ نے مقرر کئے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا' لین دین کے جو ضابطے آپ ﷺ نے مقرر کئے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا۔ مقدمات کے جو فیصلے آپ ﷺ نے کئے وہی ملک کا قانون قرار پائے' لڑائیوں میں جو معاملات آپ ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کئے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظام حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا' جو آپ ﷺ نے خود رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ ﷺ نے سنت اسلام کا جز بنا لیا۔

یہ وہ معلوم و متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لے کر خاندان' منڈی' عدالت' ایوان حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں عمل درآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد سے لے کر دور حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔ پچھلی صدی تک تو ان ادارت کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو

صرف حکومت و عدالت اور پبلک لاء کے ادارات عملاً درہم برہم ہو جانے سے ہوا ہے ...... ان (سنتوں) کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل' دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۲۔ دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنت ثابتہ کیا ہے۔ ایک تو وہ معلوم اور متعارف سنتیں تھیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اور دوسرے ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ تھی جنہیں حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں شہرت اور رواج عام حاصل نہ ہوا تھا' جو مختلف اوقات میں حضور اکرم ﷺ کے کسی فیصلے' ارشاد' امر و نہی' تقریر[1] و اجازت' یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے ...... ان سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا' امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد فوراً" ہی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفا' حکام' قاضی' مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آنے والے مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت ﷺ کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا' اور ہر اس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایت حدیث کا نقطہ آغاز ہے اور ۱۱ھ سے تیسری چوتھی صدی تک ان متفرق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری رہا

---

[1] شرعی اصطلاح میں تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے سامنے کوئی کام ہوتے دیکھا ہو یا کوئی طریقہ رائج پایا ہو اور اسے منع نہ کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تقریر کے معنی ہیں کسی چیز کو برقرار رکھنا۔

ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی کوششیں بھی کیں وہ قریب قریب سب ناکام بنا دی گئیں۔ کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا' جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی' جن سے کوئی شخص سزا پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا' غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین کا مدار تھا' ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مسندیں اتنی بے پرواہ نہیں ہو سکتی تھیں کہ یونہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور ایک حاکم یا جج یا مفتی اسے مان کر کوئی حکم صادر کر ڈالتا۔ اسی لئے جو سنتیں احکام سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی' سخت تنقید کی چھلنیوں سے ان کو چھانا گیا' روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی' اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا رد کر دی گئی ہے' تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قبول کے متعلق تحقیقی رائے قائم کر سکے۔ چونکہ ان کے لئے سنت قانون کی حیثیت رکھتی تھی' اسی پر ان کی عدالتوں میں فیصلے ہوتے تھے اور ان کے گھروں سے لے کر حکومتوں تک کے معاملات چلتے تھے' اس لئے وہ اس کی تحقیق میں بے پروا اور لا ابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانے سے لے کر آج تک نسلاً" بعد نسل میراث میں ملے ہیں اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔

ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لاینحل معمہ ہے جس سے وہ دو چار ہو گیا ہے۔

(۳)

خلافت راشدہ کا تعامل
اور
مجتہدین امت کے فیصلے

تیسرا[1] ماخذ خلافت راشدہ کا تعامل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد اسلامی اسٹیٹ کو خلفائے راشدین نے جس طرح چلایا اس کے نظائر اور اس کی روایات سے حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے لئے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام میں یہ اصول شروع سے آج تک مسلم رہا ہے کہ دینی احکام و ہدایات کی جو تعبیریں صحابہ کرام نے بالاتفاق کی ہیں (جسے اصطلاح میں اجماع کہا جاتا ہے) اور دستوری و قانونی مسائل کے جو فیصلے خلفائے راشدین نے صحابہ کے مشورے سے کر دیئے ہیں وہ ہمارے لئے حجت ہیں، یعنی ان کو جوں کا توں تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ صحابہ کے کسی معاملہ میں متفق ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مستند تعبیر قانون اور معتبر طریق عمل ہے۔ جہاں ان کے درمیان اختلافات ہوئے ہیں، وہاں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے میں دو یا دو سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے اور ایسے معاملات میں دلیل سے ایک قول کو

---

[1] اقتباس از "اسلامی دستور کی تدوین" از مولانا مودودی صاحب۔ مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لیمٹڈ لاہور۔

دوسرے قول پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں ان کے درمیان کامل اتفاق ہو گیا ہے۔ وہاں ان کا فیصلہ لازماً" ایک ہی تعبیر اور ایک ہی طرز عمل کو صحیح و مستند ثابت کر دیتا ہے' کیونکہ یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کے براہ راست شاگرد اور تربیت یافتہ تھے اور ان سب کا متفق ہو کر دین کے معاملے میں غلطی کر جانا یا دین کے سمجھنے میں راہ صواب سے ہٹ جانا قابل تسلیم نہیں ہے۔

چوتھا ماخذ مجتہدین امت کے وہ فیصلے ہیں جو انہوں نے مختلف دستوری مسائل پیش آنے پر اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں کئے ہیں۔ یہ چاہے حجت نہ ہوں' مگر بہرحال اسلامی دستور کی روح اور اس کے اصولوں کو سمجھنے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے دستور کے چار ماخذ۔ ہم جب بھی اسلامی حکومت کا دستور تحریری شکل میں لانا چاہیں' ہم کو انہی ماخذ سے اس کے قواعد جمع کر کے مرتب کرنے ہوں گے' بالکل اسی طرح جیسے انگلستان کے لوگ اگر آج اپنا دستور مدون کرنا چاہیں تو انہیں اپنے وضعی قانون (Statute Law) اور عرفی قانون (Common Law) اور اپنے دستوری رواج (Coventions of the Constitution) سے ایک ایک جز اخذ کر کے صفحہ کاغذ پر ثبت کرنا ہو گا اور بہت سے دستوری احکام و قواعد ان کو اپنی عدالتوں کے فیصلوں سے چن چن کر نکالنے ہوں گے۔[1]

---

[1] اسلامی قانون کے سلسلہ کے دوسرے مباحث کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب: "اسلامی قانون" مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لیمیٹڈ لاہور۔ مرتب

(۴)

مشکلات اور موانع

جہاں تک اسلامی دستور مملکت کے ان ماخذ کا تعلق ہے، یہ سب تحریری شکل میں موجود ہیں۔ قرآن لکھا ہوا ہے۔ سنت رسول ﷺ اور تعامل خلفائے راشدین کے متعلق سارا مواد کتابوں میں مل سکتا ہے۔ مجتہدین امت کی آراء بھی معتبر کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ مفقود ہے نہ نایاب۔ لیکن اس کے باوجود ان ماخذ سے اس غیر تحریری دستور کے قواعد اخذ کر کے ان کو تحریری دستور کی شکل دینے میں چند مشکلات اور چند دقتیں حائل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ ان کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

(الف) اصطلاحات کی اجنبیت

سب سے پہلی دقت زبان کی ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ میں دستوری احکام کو بیان کرنے کے لئے جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ اب بالعموم لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہو گئی ہیں، کیونکہ ایک مدت دراز سے ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو چکا ہے اور ان اصطلاحوں کا چلن نہیں رہا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی ہم روزانہ تلاوت کرتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ دستوری اصطلاحات ہیں، مثلاً" سلطان، ملک، حکم، امر، ولایت وغیرہ۔ ان الفاظ کے صحیح دستوری مفہوم کو عربی میں بھی کم لوگ سمجھتے ہیں اور ترجموں میں منتقل ہو کر ان کا سارا مطلب خبط ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی قرآن

کے دستوری احکام کا ذکر سن کر حیرت کے ساتھ پوچھنے لگتے ہیں کہ قرآن میں کون سی آیت دستور سے تعلق رکھتی ہے؟ فی الواقع ان بچاروں کی حیرت بجا ہے۔ قرآن میں کوئی سورت "الدستور" کے نام سے نہیں ہے اور نہ بیسویں صدی کی اصطلاحات میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے۔

(ب) قدیم فقہی لٹریچر کی نامانوس ترتیب

دوسری وقت یہ ہے کہ ہمارے فقہی لٹریچر میں دستوری مسائل کہیں الگ ابواب کے تحت یکجا بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ دستور اور قوانین ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ قانون سے الگ دستور کا جداگانہ تصور بہت بعد کے زمانے کی پیداوار ہے' بلکہ خود لفظ دستور کا استعمال بھی اپنے جدید معنوں میں ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ البتہ ان مسائل پر جنہیں اب ہم دستوری مسائل کہتے ہیں' تمام فقہائے اسلام نے بحث کی ہے' مگر ان کی بحثیں ہم کو فقہی کتابوں کے اندر مختلف قانونی ابواب میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ ایک مسئلے پر کتاب القضاء میں بحث ہے تو دوسرے پر کتاب الامارت میں۔ ایک مسئلہ کتاب السیر (مسائل صلح و جنگ کی کتاب) میں بیان ہوا ہے، تو دوسرا کتاب النکاح والطلاق میں۔ ایک مسئلہ کتاب الحدود (فوجداری قانون کی کتاب) میں آیا ہے تو دوسرا کتاب الفے (پبلک فینانس کی کتاب) میں۔ پھر ان کی زبان اور اصطلاحات آج کل کی رائج اصطلاحوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ جب تک کوئی شخص قانون کے مختلف شعبوں اور ان کے مسائل پر کافی بصیرت نہ رکھتا ہو اور پھر عربی زبان سے بھی بخوبی واقف نہ ہو' اس کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کہاں قانون ملکی کے درمیان قانون بین الاقوام کا کوئی مسئلہ آگیا ہے اور کہاں پرسنل لاء کے درمیان دستوری قانون کے کسی مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پچھلی صدیوں کے دوران میں ہمارے بہترین قانونی دماغوں نے غایت درجہ بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ہے' مگر آج ان کی چھوڑی ہوئی میراث کو چھان پھٹک کر ایک ایک قانونی شعبے کے مواد کو الگ الگ

کرنا اور اسے منقح صورت میں سامنے لانا ایک بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے جس کے لئے موجودہ نسلیں، جنہوں نے مدتوں سے دوسروں کے پس خوردہ پر قناعت کر لی ہے، مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہیں۔ بلکہ ستم یہ ہے کہ آج وہ اپنی اس آبائی میراث کو بے جانے بوجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔

(ج) نظام تعلیم کا نقص

تیسری مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم ایک کافی مدت سے بڑی ناقص ہو رہی ہے۔ جو لوگ ہمارے ہاں علوم دینی پڑھتے ہیں وہ موجودہ زمانے کے علم السیاست اور اس کے مسائل اور دستوری قانون اور اس سے تعلق رکھنے والے معاملات سے بیگانہ ہیں۔ اس لئے وہ قرآن و حدیث اور فقہ کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں تو عمریں گزار دیتے ہیں، مگر ان کے لئے اس وقت کے سیاسی و دستوری مسائل کو آج کل کی زبان اور اصطلاحوں میں سمجھنا اور پھر ان کے بارے میں اسلام کے کیا احکام اور اصول ہیں اور وہ کہاں کہاں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عملاً ہمارے تمدن و سیاست اور قانون و عدالت کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے جدید مسائل سے تو واقف ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کا دین ان مسائل کے بارے میں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ وہ دستور اور سیاست اور قانون کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں مغربی تعلیمات اور مغرب کے عملی نمونوں ہی کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔ قرآن اور سنت اور اسلامی روایات کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں۔ اسلئے ان میں سے جو لوگ واقعی نیک نیتی کے ساتھ اسلامی زندگی کا از سر نو احیاء چاہتے ہیں وہ بھی اس کے محتاج ہیں کہ کوئی ان مسائل کے بارے میں اسلام کی ہدایات ان کے سامنے اس زبان میں پیش کرے جسے وہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی پیچیدگی ہے جو ایک صحیح اسلامی دستور کی تدوین میں حارج ہو رہی ہے۔

(د) اجتہاد بلا علم کا دعویٰ

چوتھی مشکل ایک اور ہے جو اب بڑھتے بڑھتے ایک لطیفے اور مذاق کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ حال میں یہ ایک نرالا انداز فکر پیدا ہوا ہے کہ اسلام میں "پریسٹ ہڈ" نہیں ہے' قرآن اور سنت اور شریعت پر "ملا" کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو' جس طرح وہ تعبیر احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ہم بھی یہی حق رکھتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ دین کے معاملے میں ملا کی بات ہماری بات سے زیادہ وزنی ہو۔ یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں جو نہ قرآن و سنت کی زبان سے واقف ہیں' نہ اسلامی روایات پر جن کی نگاہ ہے' نہ اپنی زندگی کے چند روز بھی جنہوں نے اسلام کے تحقیقی مطالعے میں صرف کئے ہیں۔ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے علم کا نقص محسوس کرنے اور اسے دور کرنے کے بجائے سرے سے علم کی ضرورت ہی کا انکار کرنے پر تل گئے ہیں اور اس بات پر مصر ہیں کہ انہیں علم کے بغیر اپنی تعبیروں سے اسلام کی صورت بگاڑ دینے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اگر جہالت کی اس طغیانی کو یونہی بڑھنے دیا گیا تو بعید نہیں کل کوئی اٹھ کر کہے کہ اسلام میں "وکیل ہڈ" نہیں ہے اس لئے ہر شخص قانون پر بولے گا چاہے اس نے قانون کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو اور پرسوں کوئی دوسرے صاحب اٹھیں اور فرمائیں کہ اسلام میں "انجینئر ہڈ" نہیں ہے اس لئے ہم بھی انجینئرنگ پر کلام کریں گے چاہے ہم اس فن کی الف ب سے بھی واقف نہ ہوں۔ اور پھر کوئی تیسرے صاحب اسلام میں "ڈاکٹر ہڈ" کا انکار کر کے مریضوں کا علاج کرنے کھڑے ہو جائیں بغیر اس کے کہ ان کو علم طب کی ہوا بھی لگی ہو۔ میں سخت حیران ہوں کہ اچھے خاص پڑھے لکھے اور ذی عزت لوگ یہ کیسی اوچھی اور طفلانہ باتیں کرنے پر اتر آئے ہیں اور کیوں انہوں نے اپنی ساری قوم کو ایسا نادان فرض کر لیا ہے کہ وہ ان کی یہ باتیں سن کر آمنا و صدقنا کہہ دے گی بے شک اسلام میں پریسٹ ہڈ نہیں ہے' مگر انہیں معلوم بھی ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب

صرف یہ ہے کہ اسلام میں نہ تو بنی اسرائیل کی طرح دین کا علم اور دینی خدمات کسی نسل اور قبیلے کی میراث ہیں اور نہ عیسائیوں کی طرح دین و دنیا کے درمیان تفریق کی گئی ہے کہ دنیا قیصروں کے حوالے اور دین پادریوں کے حوالے کردیا گیا ہو۔ بلاشبہ یہاں قرآن اور سنت اور شریعت پر کسی کا اجارہ نہیں ہے اور ملا کسی نسل یا خاندان کا نام نہیں ہے جس کو دین کی تعبیر کرنے کا آبائی حق ملا ہوا ہو۔ جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر وکیل اور جج بن سکتا ہے اور ہر شخص انجنیرنگ پڑھ کر انجنیر اور طب پڑھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے اور اسی طرح ہر شخص قرآن اور سنت کے علم پر وقت اور محنت صرف کر کے مسائل شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ اسلام میں پریسٹ ہڈ نہ ہونے کا اگر کوئی معقول مطلب ہے تو وہ یہی ہے۔ نہ یہ کہ اسلام کوئی بازیچہ اطفال بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے اٹھ کر اس کے احکام اور تعلیمات کے بارے میں ماہرانہ فیصلے صادر کرنے شروع کر دے' خواہ اس نے کتاب اور سنت میں بصیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی ہو۔ علم کے بغیر اتھارٹی بننے کا دعویٰ اگر دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں قابل قبول نہیں ہے تو آخر دین ہی کے معاملہ میں کیوں قابل قبول ہو؟

یہ چوتھی پیچیدگی ہے جو اسلامی ریاست کے تصور کو پراگندہ کرنے اور اسلامی دستور کی تدوین کے معاملے میں اب ڈال دی گئی ہے اور اس وقت درحقیقت یہی سب سے بڑی پیچیدگی ہے۔ پہلی تین مشکلات کو تو محنت اور کوشش سے رفع کیا جا سکتا ہے اور خدا کے فضل سے ایک حد تک رفع کر بھی دیا گیا ہے لیکن اس نئی الجھن کا علاج سخت مشکل ہے' خصوصاً" جب کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے ہو جو بالفعل اقتدار کی کنجیوں پر قابض ہیں۔

ضمیمہ باب ششم

سنت رسول اللہ ﷺ بحیثیت ماخذ قانون

(ذیل میں جسٹس ایس اے رحمان صاحب کے ایک خط پر مصنف کا تبصرہ درج کیا جا رہا ہے۔ وہ خط دراصل اس مراسلت کا ایک حصہ تھا جو ترجمان القرآن کے صفحات میں صاحب موصوف اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔ ان صفحات میں اس بحث کو نقل کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سنت کے متعلق جو اہم مسائل زیر بحث آگئے ہیں ان سے عام ناظرین استفادہ کر سکیں۔ فاضل مکتوب نگار کے اصل خط کو یہاں درج کرنے کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ اس کا متعلقہ حصہ خود ہمارے تبصرے میں آگیا ہے۔)

فاضل مکتوب نگار نے اپنے موقف کی وضاحت فرماتے ہوئے نمبروار جو اشارات فرمائے ہیں ان میں سے نمبر ۳ کچھ بحث طلب ہے، کیونکہ اپنی موجودہ مختصر صورت میں وہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے میں اس کے متعلق کچھ باتیں اس توقع کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ ان پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔

صدیقی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ آئمہ سلف کی مرتب کردہ فقہ پر نظر ثانی اگر کی جا سکتی ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ ان کا کوئی اجتہاد و استنباط قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے تفسیر و تعبیر کا حق برقرار رکھتے ہوئے ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سنت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔"

ان الفاظ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک قرآن تو اسلامی احکام معلوم کرنے کے لئے ضرور مرجع و سند ہے مگر وہ سنت کو یہ حیثیت دینے میں اس بنا پر متامل ہیں کہ اس کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اب یہ بات ان کے بیان سے واضح نہیں ہوتی کہ اس مسئلے میں کیا چیز مختلف فیہ ہے؟

کیا سنت کا ماخذ قانون ہونا مسلمانوں میں اختلافی مسئلہ ہے؟

اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ بجائے خود سنت (یعنی رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل اور امر و نہی) کا ماخذ قانون اور مرجع احکام ہونا ہی مختلف فیہ ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ ایک خلاف واقعہ بات ہے۔ جس روز سے امت مسلمہ وجود میں آئی ہے اس وقت سے آج تک یہ بات اہل اسلام میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہی ہے۔ تمام امت نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطاع اور متبوع ہیں' ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے امر و نہی کا اتباع ہر مسلمان پر واجب ہے۔ جس طریقے پر چلنے کی انہوں نے اپنے قول و عمل اور تقریر[1] سے تعلیم دی ہے اس کی پیروی پر ہم مامور ہیں اور زندگی کے جس معاملے کا بھی انہوں نے فیصلہ کر دیا ہے اس میں کوئی دوسرا فیصلہ کر لینے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تاریخ اسلام کے گزشتہ ۱۳۸۱ سال میں کس نے اور کب اس سے اختلاف کیا ہے۔ نرالی اپج نکالنے والے کچھ منفرد اور شاذ قسم کے خبطی تو دنیا میں ہمیشہ ہر گروہ میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کے افراد نے کبھی مسلمات قوم کے خلاف کوئی بات کر دی ہو تو اس کی بنا پر یہ کہہ دینا صحیح نہیں ہے کہ ایک عالم گیر مسلمہ مختلف فیہ ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ مسلمہ

---

[1] تقریر سے مراد کسی رائج الوقت طریقے کو برقرار رکھنا یا کسی شخص کو کوئی عمل کرتے دیکھ کر منع نہ کرنا ہے۔

نہیں رہا۔ اس طرح تو خبطیوں کی تاخت سے قرآن بھی نہیں بچا ہے۔ کہنے والے تحریف قرآن تک کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں۔ اب کیا ان کی وجہ سے ہم کلام الٰہی کے مرجع و سند ہونے کو بھی مختلف فیہ مان لیں گے؟

کیا اختلافات کی گنجائش ہونا سنت کے ماخذ قانون ہونے میں مانع ہے؟

لیکن اگر مختلف فیہ سنت کا بجائے خود مرجع و سند ہونا نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الواقع سنت ثابتہ ہے یا نہیں' تو ایسا ہی اختلاف قرآن کی آیات کے مفہوم و منشا میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحب علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس سے نکلتا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار نے خود قرآن مجید میں اختلاف تفسیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود وہ بجائے خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود فی نفسہ "سنت" کو مرجع و سند تسلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے۔

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون دان سے جیسے کہ محترم مکتوب نگار ہیں' مخفی نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص' ادارے یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو اس کے علم اور دائرہ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلہ میں جو سنت بھی ایک فقیہ' یا لیجسلیچر یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لئے حکم رسولؐ ہے اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسولؐ

کا حکم وہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسول کا حکم کیا ہے اور آپ کے نزدیک کیا لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور اس کے رسول کو آخری سند (Final Authority) مان رہے ہیں' ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بجائے خود ہمارے لئے قانون واجب الاتباع ہے۔ لہٰذا میں جناب ایس اے رحمان صاحب کی یہ بات سمجھنے سے معذور ہوں کہ احکام فقہ کی تحقیق میں وہ قرآن کو تو ان اختلافات کے باوجود مرجع و سند مانتے ہیں جو اس کے منشا کی تعیین میں واقع ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں' مگر سنت کو یہ حیثیت دینے میں اس بنا پر تأمل کرتے ہیں کہ جزئیات مسائل کے متعلق سنتوں کے تشخص کرنے میں اختلافات واقع ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

کیا احادیث موضوعہ کی موجودگی واقعی بے اطمینانی کی موجب ہے؟

آگے چل کر صاحب موصوف سنت کو سند قرار نہ دینے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "متعدد احادیث موضوعہ متداولہ مجموعوں میں شامل ہو گئی ہیں۔" اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس موضوع پر ضخیم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔" بظاہر اس ارشاد سے ان کا مدعا یہ متصور ہوتا ہے کہ سنت ایک مشکوک چیز ہے۔ ممکن ہے کہ یہ شبہ اختصار بیان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو اور فی الواقع ان کا مدعا یہ نہ ہو۔ لیکن اگر ان کا مدعا یہی ہے تو میں عرض کروں گا کہ وہ اس مسئلے پر مزید غور فرمائیں۔ انشاء اللہ انہیں خود محسوس ہو گا کہ جس چیز کو وہ سنت کے مشکوک ہونے کی دلیل سمجھ رہے ہیں وہی دراصل اس کے محفوظ ہونے کا اطمینان دلاتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اس سوال کو چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ کون سے متداول مجموعے ہیں جن میں احادیث موضوعہ شامل ہو گئی ہیں۔ اگرچہ مختلف محدثین نے جو مجموعے بھی مرتب کئے ہیں ان میں اپنی حد تک پوری چھان بین کر کے انہوں نے یہی کوشش کی ہے کہ قابل اعتماد روایات جمع کریں۔ مگر اس معاملے میں صحاح ستہ اور موطا کا پایہ

س قدر بلند ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ ن بھی لیں کہ سب مجموعوں میں موضوعات نے کچھ نہ کچھ راہ پا لی ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ وہ "ضخیم کتابیں" جن کا ذکر فاضل مکتوب نگار کر رہے ہیں آخر ہیں کس موضوع پر۔ ان کا موضوع یہی تو ہے کہ کون کون سی حدیثیں وضعی ہیں' کون کون سے راوی کذاب اور وضاع حدیث ہیں' کہاں کہاں موضوع احادیث نے راہ پائی ہے' کس کتاب کی کون کون سی روایات ساقط الاعتبار ہیں' کن راویوں پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں اور کن پر نہیں کر سکتے' "موضوع" کو "صحیح" سے جدا کرنے کے طریقے کیا ہیں اور روایات کی صحت' ضعف' علت وغیرہ کی تحقیق کن کن طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ ان ضخیم کتابوں کی اطلاع پا کر تو ہمیں امن کا ویسا ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے جیسا کسی کو یہ سن کر ہو کہ بکثرت چور پکڑ لئے گئے ہیں' بڑے بڑے جیل خانے ان سے بھر گئے ہیں' بہت سے اموال مسروقہ برآمد کر لئے گئے ہیں اور سراغ رسانی کا ایک باقاعدہ انتظام موجود ہے جس سے آئندہ بھی چور پکڑے جا سکتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہو گی اگر کسی کے لئے یہی اطلاع الٹی بے اطمینانی کی موجب ثابت ہو اور وہ اسے بدامنی کے ثبوت میں پیش کرنے لگے۔ بے شک بڑی مثالی حالت امن ہوتی اگر چوری کا سرے سے کبھی وقوع ہی نہ ہوتا۔ بلاشبہ اس طرح کی واردات ہو جانے سے کچھ نہ کچھ بے اطمینانی تو پیدا ہو ہی جاتی ہے' لیکن مکمل حالت امن زندگی کے اور کس معاملے میں ہم کو نصیب ہے جو یہاں ہم اسے طلب کریں۔ جس حالت پر ہم دنیا میں بالعموم مطمئن رہتے ہیں اس کے لئے اتنا امن کافی ہے کہ چوروں کی اکثریت پکڑ کر بند کر دی جائے اور جو قلیل تعداد بھی آزاد پھر رہی ہو اس کے پکڑے جانے کا معقول انتظام موجود ہو۔ کیا ہمارے سپریم کورٹ کے فاضل جج سنت کے معاملے میں اتنے امن پر قانع نہیں ہو سکتے؟ کیا وہ اس مکمل امن سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں جس میں سرے سے چوری کے وقوع ہی کا نام و نشان نہ پایا جائے؟

روایات کی صحت جانچنے کے اصول

آخر میں فاضل محترم تحریر فرماتے ہیں:

"میں اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کا قائل نہیں۔ سنن متوارثہ جن کا تعلق طریق عبادات مثلاً" نماز یا مناسک حج وغیرہ سے ہے ان کی حیثیت مصون و مامون ہے۔ لیکن باقی ماندہ مواد احادیث روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں پر پرکھا جانا چاہئے پیشتر اس کے کہ اس کی حجت قبول کی جائے میں تاریخی تنقید کا قائل ہوں۔"

یہ ایک حد تک صحیح نقطہ نظر ہے لیکن اس میں چند امور ایسے ہیں جن پر میں آں محترم کو مزید غور و فکر کی دعوت دوں گا۔ جس تاریخی تنقید کے وہ قائل ہیں، فن حدیث اسی تنقید ہی کا تو دوسرا نام ہے۔ پہلی صدی سے آج تک اس فن میں یہی تنقید ہوتی رہی ہے اور کوئی فقیہ یا محدث اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات، کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ سے نسبت دی جانے والی کسی روایت کو تاریخی تنقید کے بغیر حجت کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ یہ فن حقیقت میں اس تنقید کا بہترین نمونہ ہے اور جدید زمانے کی بہتر سے بہتر تاریخی تنقید کو بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ و ترقی (Improvement) کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محدثین کی تنقید کے اصول اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ دور کے ناقدین تاریخ کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں بلا خوف تردید یہ کہوں گا کہ دنیا میں صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے، ورنہ آج تک دنیا کے کسی انسان اور کسی دور کی تاریخ بھی ایسے ذرائع سے محفوظ نہیں رہی ہے کہ ان سخت معیاروں کے آگے ٹھہر سکے اور اس کو قابل تسلیم تاریخی ریکارڈ مانا جا سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے جدید

زمانے کے اہل علم اس فن کا تحقیقی مطالعہ نہیں کرتے اور قدیم طرز کے اہل علم جو اس میں بصیرت رکھتے ہیں وہ اس کو عصر حاضر کی زبان اور اسالیب بیان میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی وجہ سے باہر والے تو درکنار خود ہمارے اپنے گھر کے لوگ آج اس کی قدر نہیں پہچان رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علوم حدیث میں سے اگر صرف ایک علل حدیث ہی کے فن کی تفصیلات سامنے رکھ دی جائیں تو دنیا کو معلوم ہو کہ تاریخی تنقید کس چیز کا نام ہے۔ تاہم میں یہ کہوں گا کہ مزید اصلاح و ترقی کا دروازہ بند نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روایات کو جانچنے اور پرکھنے کے جو اصول محدثین نے اختیار کئے ہیں وہ حرف آخر ہیں۔ آج اگر کوئی ان کے اصولوں سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرنے کے بعد ان میں کسی کمی یا خامی کی نشان دہی کرے اور زیادہ اطمینان بخش تنقید کے لئے کچھ اصول معقول دلائل کے ساتھ سامنے لائے تو یقیناً اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہم میں سے آخر کون یہ نہ چاہے گا کہ کسی چیز کو رسول اللہ ﷺ کی سنت قرار دینے سے پہلے اس کے سنت ثابتہ ہونے کا تیقن حاصل کر لیا جائے اور کوئی کچی پکی بات حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔

درایت کی حقیقت

احادیث کے پرکھنے میں روایت کے ساتھ درایت کا استعمال بھی' جس کا ذکر محترم مکتوب نگار نے کیا ہے' ایک متفق علیہ چیز ہے۔ اگرچہ درایت کے مفہوم' اصول اور حدود میں فقہاء و محدثین کے مختلف گروہوں کے درمیان اختلاف رہے ہیں' لیکن بجائے خود اس کے استعمال پر تقریباً" اتفاق ہے اور دور صحابہ کرام سے لے کر آج تک اسے استعمال کیا جا رہا ہے البتہ اس سلسلے میں جو بات پیش نظر رہنی چاہئے اور مجھے امید ہے کہ فاضل مکتوب نگار کو بھی اس سے اختلاف نہ ہو گا' وہ یہ ہے کہ درایت صرف انہی لوگوں کی معتبر ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے مطالعہ و تحقیق میں اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کر چکے ہوں' جن میں ایک

مدت کی ممارست نے ایک تجربہ کار جوہری کی سی بصیرت پیدا کر دی ہو اور خاص طور پر یہ کہ جن کی عقل اسلامی نظام فکر و عمل کے حدود اربعہ سے باہر کے نظریات' اصول اور اقدار لے کر اسلامی روایات کو ان کے معیار سے پرکھنے کا رجحان نہ رکھتی ہو۔ بلاشبہ عقل کے استعمال پر ہم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے' نہ کسی کہنے والے کی زبان پکڑ سکتے ہیں لیکن بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ اسلامی علوم سے کورے لوگ اگر اناڑی پن کے ساتھ کسی حدیث کو خوش آئند پا کر قبول اور کسی کو اپنی مرضی کے خلاف پا کر رد کرنے لگیں یا اسلام سے مختلف کسی دوسرے نظام فکر و عمل میں پرورش پائے ہوئے حضرات یکایک اٹھ کر اجنبی معیاروں کے لحاظ سے احادیث کے رد و قبول کا کاروبار پھیلا دیں تو مسلم ملت میں نہ ان کی درایت مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اس ملت کا اجتماعی ضمیر ایسے بے تکے عقلی فیصلوں پر کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلامی حدود میں تو اسلام ہی کی تربیت پائی ہوئی عقل اور اسلام کے مزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی عقل ہی ٹھیک کام کر سکتی ہے۔ اجنبی رنگ و مزاج کی عقل یا غیر تربیت یافتہ عقل بجز اس کے کہ انتشار پھیلائے کوئی تعمیری خدمات اس دائرے میں انجام نہیں دے سکتی۔

سنت کے معتبر ہونے کے دلائل

سنت کی جو تقسیم محترم مکتوب نگار نے "سنن متوارثہ جن کا تعلق طریق عبادات سے ہے" اور "باقی ماندہ مواد احادیث" میں کی ہے' اور ان میں سے مقدم الذکر کو مصون و مامون اور موخر الذکر کو محتاج تنقید قرار دیا ہے' اس سے اتفاق کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ بظاہر اس تقسیم میں جو تصور کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ جو طریقے نبی اکرم ﷺ نے عبادات کے متعلق سکھائے تھے وہ تو امت میں "عملاً" جاری ہو گئے اور نسل کے بعد نسل ان کی پیروی کرتی رہی' اس لئے یہ "متوارث" سنتیں محفوظ رہ گئیں' باقی رہے دوسرے معاملات زندگی تو ان میں حضور اکرم ﷺ کی ہدایات نہ "عملاً" جاری ہوئیں' نہ ان پر کوئی نظام تمدن و معاشرت کام کرتا رہا'

نہ وہ بازاروں اور منڈیوں میں رائج ہوئیں، نہ عدالتوں میں ان پر فیصلے ہوئے، اس لئے وہ بس متفرق لوگوں کی سینہ بسینہ روایات تک محدود رہ گئیں اور یہی مواد ایسا ہے کہ اب اس میں سے بڑی دیدہ ریزی کے بعد قابل اعتبار چیزیں تلاش کرنی ہوں گی۔ فاضل مکتوب نگار کا تصور اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو میں بہت شکر گزار ہوں گا کہ وہ میری غلط فہمی رفع کر دیں۔ لیکن اگر یہی ان کا تصور ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ تاریخ سنت کی واقعی صورت حال سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے عہد نبوت میں مسلمانوں کے لئے محض ایک پیرو مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً" ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارع، مربی، معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لے کر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے سکھائے اور مقرر کئے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لئے یہ کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسک حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو، اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ ﷺ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً" مسجدوں میں رائج ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں۔ ٹھیک اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ ﷺ نے مقرر کئے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، لین دین کے جو ضابطے آپ ﷺ نے مقرر کئے انہیں کا بازاروں میں چلن ہونے لگا، مقدمات کے جو فیصلے آپ ﷺ نے کئے وہی ملک کا قانون قرار پائے، لڑائیوں میں جو معاملات آپ ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کئے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظام حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ ﷺ نے یا تو خود رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ ﷺ نے سنت اسلام کا جز بنا لیا۔ یہ وہ معلوم و

متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لے کر خاندان' منڈی' عدالت' ایوان حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں عمل درآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد سے لے کر دور حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔ پچھلی صدی تک توازن ادارات کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پبلک لا کے ادارات عملاً" درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ "متوارث" سنتوں کی محفوظیت کے قائل ہیں تو عبادات اور معاملات دونوں سے متعلق رکھنے والی یہ سب معلوم و متعارف سنتیں متوارث ہی ہیں۔ ان کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل' دونوں ایک دوسروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی بے راہ روی سے جو الحاقی چیز بھی کبھی داخل ہوئی ہے۔ علماء امت نے اپنے اپنے دور میں بروقت "بدعت" کی حیثیت سے اس کی الگ نشان دہی کر دی ہے اور قریب قریب ہر ایسی بدعت کی تاریخ موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد کس زمانے سے اس کا رواج شروع ہوا مسلمانون کے لئے ان بدعات کو سنن متعارفہ سے ممیز کرنا بھی مشکل نہیں رہا ہے۔

اخبار آحاد کی حیثیت

ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ تھی جنہیں حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں شہرت اور رواج عام حاصل نہ ہوا تھا' جو مختلف اوقات میں حضور اکرم ﷺ کے کسی فیصلے' ارشاد' امر و نہی' تقریر و اجازت یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے۔ یہ سنتیں عبادات اور معاملات دونوں ہی طرح کے امور سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا تعلق صرف معاملات سے تھا۔ ان

سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا۔ امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد فوراً" ہی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفاء' حکام' قاضی' مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آمدہ مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت ﷺ کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا' اور ہر اس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایت حدیث کا نقطہ آغاز ہے اور ۱۱ھ سے تیسری چوتھی صدی تک ان متفرق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں وہ قریب قریب سب ناکام ہو گئیں' کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا' جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی' جن سے کوئی شخص سزا پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا' غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین کا مدار تھا ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مسندیں اتنی بے پروا نہیں ہو سکتی تھیں کہ یونہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی ﷺ کہہ دیتا اور ایک حکم یا جج یا مفتی اسے مان کر کوئی حکم صادر کر ڈالتا۔ اسی لئے جو سنتیں احکام سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی' سخت تنقید کی چھلنیوں سے ان کو چھانا گیا' روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی' اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا رد کر دی گئی ہے تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قبول کے متعلق تحقیقی رائے قائم کر سکے۔ ان سنتوں کا ایک معتدبہ حصہ فقہاء اور محدثین کے درمیان متفق علیہ ہے اور ایک حصے میں اختلافات ہیں۔ بعض لوگوں نے ایک چیز کو سنت مانا ہے اور بعض نے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں اہل علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں

اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطہ نظر کا استدلال' اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے' فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحب علم کے لئے بھی مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق تحقیق سے خود کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ سنت کے نام سے متوحش ہونے کی کسی کے لئے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبہ علم سے واقف نہیں ہیں اور جنہیں بس دور ہی سے حدیثوں میں اختلافات کا ذکر سن کر گھبراہٹ لاحق ہو گئی ہے۔

احکامی احادیث کی امتیازی حیثیت

اس سلسلے میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ احادیث میں جو مواد احکام سے متعلق نہیں ہے بلکہ جس کی نوعیت محض تاریخی ہے' یا جو فتن' ملاحم' رقاق' مناقب' فضائل اور اسی طرح کے دوسرے امور سے تعلق رکھتا ہے' اس کی چھان بین میں وہ عرق ریزی نہیں کی گئی ہے جو احکامی سنتوں کے باب میں ہوئی ہے۔ اس لئے موضوعات نے اگر راہ پائی بھی ہے تو زیادہ تر انہی ابواب کی روایات میں پائی ہے۔ احکامی سنتیں بے اصل اور جھوٹی روایتوں سے تقریباً" بالکل ہی پاک کر دی گئی ہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والی روایتوں میں ضعیف خبریں تو ضرور موجود ہیں مگر موضوعات کی نشان دہی مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے اور اخبار ضعیفہ میں سے بھی جس کسی کو فقہ کے کسی سکول نے قبول کیا ہے اس بنا پر کیا ہے کہ اس کے نزدیک وہ قرآن سے' سنن متعارفہ کے جانے پہچانے نظام سے' اور شریعت کے جامع اصولوں سے مناسبت رکھتی ہے' یعنی روایتہ" ضعیف ہونے کے باوجود درایتہ" اس میں معنی کی قوت موجود ہے۔

محترم مکتوب نگار کی چند سطروں پر یہ تفصیلی تبصرہ میں نے صرف اس لئے کیا ہے کہ یہ سطریں کسی عام آدمی کے قلم سے نہیں نکلی ہیں بلکہ ایک ایسے بزرگ کے قلم سے نکلی ہیں جنہیں ہمارے سپریم کورٹ کے جج کی بلند پوزیشن حاصل ہے۔

سنت کی شرعی و قانونی حیثیت کے متعلق اس پوزیشن کے بزرگوں کی رائے میں ذرہ برابر بھی کوئی کمزور پہلو ہو تو وہ بڑے دور رس نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ قریب کے زمانے میں سنت کے متعلق عدلیہ کی بعض دوسری بلند پایہ شخصیتوں کے ایسے ریمارکس بھی سامنے آئے ہیں جو صحیح نقطہ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے اس تبصرے میں عرض کی ہیں انہیں فاضل مکتوب نگار ہی نہیں' ہمارے دوسرے حکام عدالت بھی اسی بے لاگ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں جس کی ہم اپنی عدلیہ سے توقع رکھتے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۵۸ء)

باب ۷

اسلامی ریاست کی بنیادیں

- حاکمیت کس کی ہے؟
- ریاست کے حدود عمل
- اعضاء ریاست کے حدود عمل اور ان کا باہمی تعلق
- ریاست کا مقصد وجود
- حکومت کی تشکیل کیسے ہو؟
- اولی الامر کے اوصاف
- شہریت اور اس کی بنیادیں
- حقوق شہریت
- شہریوں پر حکومت کے حقوق

۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کے صدر نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اسلامی دستور کے موضوع پر ایک محفل مذاکرہ میں شرکت کے لئے مدعو کیا تھا۔ اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے پڑھے لکھے طبقے' خصوصیت سے وکلاء کے ذہن میں اسلامی دستور کے متعلق جو الجھنیں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ زمانہ ملک کی تاریخ میں بڑا اہم تھا اور سارے ملک میں اسلامی دستور کا مطالبہ بڑے زور شور سے برپا تھا۔ نومبر ۵۲ء میں ناظم الدین رپورٹ پیش کی جانے والی تھی لیکن عوامی مطالبہ کے پیش نظر رپورٹ کے اجرا کو ایک ماہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ فطری طور پر مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھر رہے تھے جن کا جواب ضروری تھا۔ مولانا مودودی نے اس محفل مذاکرہ میں شرکت کر کے کئی گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے ذریعہ اس ضرورت کو پورا کیا۔ مذاکرہ کا آغاز مولانا مودودی کی ایک تقریر سے ہوا جس میں موصوف نے اسلامی ریاست اور اسلامی دستور کے بنیادی خدو خال واضح کیے اور اس کے بعد کئی گھنٹے تک سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہا۔ مندرجہ ذیل صفحات میں مولانا موصوف کی تقریر پیش کی جا رہی ہے جو اسلامی ریاست کی بنیادوں کو واضح کرتی ہے۔

مرتب

اسلامی ریاست کی بنیادیں

میں سب سے پہلے دستور و ریاست کے چند بڑے بڑے اور بنیادی مسائل کو لے کر مختصراً یہ بتاؤں گا کہ اسلام کے اصلی ماخذ میں ان کے متعلق کیا قواعد ہمیں ملتے ہیں۔ اس سے آپ خود یہ اندازہ کر سکیں گے کہ اسلام دستوری مسائل میں کوئی راہنمائی کرتا ہے یا نہیں' اور کرتا ہے تو آیا اس کی نوعیت محض سفارشات کی ہے یا ایسے قطعی احکام کی جنہیں ہم مسلمان ہوتے ہوئے رد نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں طوالت سے بچنے کے لئے میں دستور کے صرف ۹ بنیادی مسائل پر گفتگو کروں گا:

۱۔ پہلا سوال یہ ہے کہ حاکیت کس کی ہے؟ کسی بادشاہ کی؟ یا کسی طبقہ کی؟ یا پوری قوم کی؟ یا خدا کی؟

۲۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کے حدود عمل کیا ہے؟ کس حد تک وہ اطاعت کی مستحق ہے اور کہاں اس کی اطاعت کا حق ساقط ہو جاتا ہے؟

۳۔ تیسرا بنیادی سوال دستور کے بارے میں یہ ہے کہ ریاست کے مختلف اعضاء (Organs of the State) یعنی انتظامیہ (Executive)' عدلیہ (Judiciary) اور مقننہ (Legislature) کے الگ الگ حدود عمل کیا ہیں؟ ان میں سے ہر ایک کیا فریضہ ادا کرے گا اور کن حدود کے اندر کرے گا؟ اور پھر ان کے درمیان تعلق کی کیا نوعیت ہو گی؟

۴۔ چوتھا اہم سوال یہ ہے کہ ریاست کا مقصد وجود کیا ہے؟ کس غرض کے لئے ریاست کام کرے گی اور اس کی پالیسی کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

۵۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے حکومت کی تشکیل کیسے کی جائے گی؟

۶۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ حکومت کے نظام کو چلانے والوں کی صفات (Qualifications) کیا ہوں گی؟ کون لوگ اس کو چلانے کے اہل قرار دیئے جائیں گے؟

۷۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ دستور میں شہریت کی بنیادیں کیا ہوں گی؟ کیسے کوئی شخص اس ریاست کا شہری قرار پائے گا اور کیسے نہیں؟

۸۔ آٹھواں سوال یہ ہے کہ شہریوں کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ اور پھر

۹۔ نواں سوال یہ ہے کہ شہریوں پر ریاست کے حقوق کیا ہیں؟

ہر دستور کے معاملے میں یہ سوالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام ان سوالات کا کیا جواب دیتا ہے؟

---

(۱)

حاکمیت کس کی ہے؟

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ اسلامی ریاست کا دستور "حاکمیت" کا مقام کس کو دیتا ہے؟

اس کا قطعی اور ناطق جواب قرآن سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ حاکمیت ہر معنی میں اللہ تعالیٰ کی ہے اس لئے کہ وہی فی الواقع حاکم حقیقی ہے اور اسی کا یہ حق ہے کہ اس کو حاکم اعلیٰ مانا جائے۔ اس مسئلے کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھنا چاہے تو میں اسے مشورہ دوں گا کہ پہلے وہ "حاکمیت" کے معنی اور تصور کو اچھی طرح ذہن نشین کرلے۔

حاکمیت کا مفہوم

علم سیاست کی اصطلاح میں یہ لفظ اقتدار اعلیٰ اور اقتدار مطلق کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ کسی شخص یا مجموعہ اشخاص یا ادارے کے صاحب حاکمیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حکم قانون ہے۔ اسے افراد ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔ افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں' خواہ بطوع و رغبت یا بکراہت۔ اس کے اختیارات حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں ہے۔ افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں۔ جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں' اسی کے دیئے ہوئے ہیں اور وہ جس حق کو بھی سلب کرے وہ آپ سے آپ معدوم ہو جاتا ہے۔ ایک قانونی حق پیدا ہی اس بنا پر ہوتا ہے کہ شارع (Lawgiver) نے اس حق کو پیدا کیا ہے' اس لئے جب شارع نے اس کو سلب کر

لیا تو سرے سے کوئی حق باقی ہی نہیں رہا کہ اس کا مطالبہ کیا جا سکے۔ قانون صاحب حاکیت کے ارادے سے وجود میں آتا ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند کرتا ہے' مگر خود صاحب حاکیت کو پابند کرنے والا کوئی قانون نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں قادر مطلق ہے۔ اس کے احکام کے بارے میں خیر اور شر' صحیح اور غلط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ کرے وہی خیر ہے' اس کے کسی تابع کو اسے شر قرار دے کر رد کر دینے کا حق نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کرے وہ صحیح ہے' کوئی تابع اس کو غلط قرار نہیں دے سکتا۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ اسے سبوح و قدوس اور منزہ عن الخطا مانا جائے' قطع نظر اس سے کہ وہ ایسا ہو یا نہ ہو۔

یہ ہے قانونی حاکیت (Legal Sovereignty) کا تصور جسے ایک قانون دان' فقیہ یا (Jurist) پیش کرتا ہے اور جس سے کم کسی چیز کا نام "حاکیت" نہیں ہے۔ مگر یہ حاکیت اس وقت تک بالکل ایک مفروضہ رہتی ہے جب تک اس کی پشت پر کوئی واقعی حاکیت یا علم سیاست کی اصطلاح میں سیاسی حاکیت (Political Sovereignty) نہ ہو' یعنی عملاً اس اقتدار کی مالک جو اس قانونی حاکیت کو مسلط کرے۔

حاکیت فی الواقع کس کی ہے؟

اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کوئی حاکیت فی الواقع انسانی دائرے میں موجود بھی ہے؟ اور ہے تو وہ کہاں ہے؟ کس کو اس حاکیت کا حامل کہا جا سکتا ہے؟

کیا کسی شاہی نظام میں واقعی کوئی بادشاہ ایسی حاکیت کا حامل ہے یا کبھی پایا گیا ہے یا پایا جا سکتا ہے؟ آپ کسی بڑے سے بڑے مختار مطلق فرماں روا کو لے لیجئے۔ اس کے اقتدار کا آپ تجزیہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کے اختیارات کو بہت سی خارجی چیزیں محدود کر رہی ہیں جو اس کے ارادے کی تابع نہیں ہیں۔

پھر کیا کسی جمہوری نظام میں کسی خاص جگہ انگلی رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں

واقعی حاکمیت موجود ہے؟ جس کو بھی آپ اس کا حامل قرار دیں گے، تجزیہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس کے ظاہری اختیار مطلق کے پیچھے کچھ اور طاقتیں ہیں جن کے ہاتھ میں اس کی باگیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ علم سیاست کے ماہرین جب حاکمیت کا واضح تصور لے کر انسانی سوسائٹی کے دائرے میں اس کا واقعی مصداق تلاش کرتے ہیں تو انہیں سخت پریشانی پیش آتی ہے۔ کوئی قامت ایسا نہیں ملتا جس پر یہ جامہ راست آتا ہو۔ اس لئے کہ انسانیت کے دائرے میں، بلکہ درحقیقت مخلوقات کے دائرے میں اس قامت کی کوئی ہستی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن بار بار کہتا ہے کہ فی الواقع حاکمیت کا حامل صرف ایک خدا ہے۔ وہی مختار مطلق ہے (فعال لما یرید) [1] وہی غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے۔ (لا یسئل عما یفعل) [2] وہی تمام اقتدار کا مالک ہے۔ (بیدہ ملکوت کل شیء) [3] وہی ایک ہستی ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ (وھو یجیر ولا یجار علیہ) [4] اور اسی کی ذات منزہ عن الخطا ہے (الملک القدوس السلام) [5]

حاکمیت کس کا حق ہے؟

پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت نفس الامری سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر کسی غیر اللہ کو یہ حاکمانہ حیثیت دے دی جائے تو کیا فی الواقع اس کا یہ

---

[1] ہود: ۱۰۷۔ جو کچھ چاہے اسے پورے طور پر کر سکتا ہے۔

[2] الانبیاء: ۲۳۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی کوئی پرسش نہیں۔

[3] المومنون: ۸۸۔ اس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے۔

[4] المومنون: ۸۸۔ وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

[5] الحشر: ۲۳۔ بادشاہ حقیقی، پاک ذات، سلامتی امن دینے والا۔

حق ہے کہ اس کا حکم قانون ہو' اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کے حکم کے بارے میں خیرو شریا صحیح و غلط کا سوال نہ اٹھایا جا سکے؟ یہ حق خواہ کسی شخص کو دیا جائے' یا کسی ادارے کو' یا باشندوں کی اکثریت کو' بہرحال یہ پوچھا جائے گا کہ اس کو آخر یہ حق کس بنیاد پر حاصل ہوا ہے؟ اور اس بات کی دلیل کیا ہے کہ اسے افراد پر اس طرح حاکم ہونے کا حق حاصل ہے؟ اس سوال کا زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جواب دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ لوگوں کی رضامندی اس حاکیت کے برحق ہونے کی دلیل ہے؟ مگر کیا آپ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی رضامندی سے اپنے آپ کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس خریدار کو اس شخص پر جائز حق مالکانہ حاصل ہو جاتا ہے؟ اگر یہ رضامندی اس ملکیت کو برحق نہیں بناتی تو آخر کسی غلط فہمی کی بنا پر محض جمہور کا رضامند ہو جانا کسی حاکیت کو برحق کیسے بنا سکتا ہے؟ قرآن اس گتھی کو بھی یہ کہہ کر سلجھا دیتا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر کسی مخلوق کو بھی حکم چلانے کا حق نہیں ہے' یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور اس بنا پر حاصل ہے کہ وہی اپنی مخلوق کا خالق ہے۔ الا لہ الخلق والامر۔[1] "خبردار خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کے لئے ہے۔" یہ ایک ایسی معقول بات ہے جسے کم از کم وہ لوگ تو رد نہیں کر سکتے جو خدا کو خالق تسلیم کرتے ہیں۔

حاکیت کس کی ہونی چاہیے؟

پھر تیسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بالفرض حق اور باطل کی بحث کو نظر انداز کر کے حاکیت کا یہ منصب کسی انسانی اقتدار کو دے بھی دیا جائے تو کیا اس میں انسانیت کی بھلائی ہے؟ انسان' خواہ وہ کوئی ایک شخص ہو' یا کوئی طبقہ' یا کسی قوم کا

---

[1] الاعراف : ۵۴

مجموعہ' بہرحال حاکمیت کی اتنی بڑی خوراک ہضم نہیں کر سکتا کہ اس کو افراد پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کے فیصلے کو بے خطا مان لیا جائے۔ اس طرح کے اختیارات جب بھی کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہوں گے' ظلم ضرور ہو گا۔ معاشرے کے اندر بھی ظلم ہو گا اور معاشرے کے باہر دوسرے ہمسایہ معاشروں پر بھی ظلم ہو گا۔ فساد اس بندوبست کی فطرت میں مضمر ہے اور جب کبھی انسانوں نے زندگی کا یہ نہجار اختیار کیا ہے فساد رونما ہوئے بغیر نہیں رہا ہے۔ اس لئے کہ جس کی فی الواقع حاکمیت نہیں ہے اور جس کو حاکمیت کا حق بھی حاصل نہیں ہے' اسے اگر مصنوعی طور پر حاکمیت کا مقام حاصل ہو جائے تو وہ اس منصب کے اختیارات کبھی صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر سکتا۔ یہی بات ہے جسے قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظلمون۔** "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں۔"[1]

اللہ کی قانونی حاکمیت

ان وجوہ سے اسلام میں یہ قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ قانونی حاکمیت اسی کی مانی جائے جس کی واقعی حاکمیت ساری کائنات پر قائم ہے اور جسے انسانوں پر بھی حاکمیت کا لاشریک حق حاصل ہے۔ اس بات کو قرآن میں اتنی بار بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے اور اتنے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ پرزور الفاظ کسی بات کو بیان کرنے کے لئے ہو نہیں سکتے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا:

---

[1] المائدہ: ۴۵

ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالک الدین القیم۔

(یوسف : ۴۰)

حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں' اس کا فرمان ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرو' یہی صحیح طریقہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء۔ (اعراف : ۳)

پیروی کرو اس قانون کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

تیسری جگہ خدا کی اس قانونی حاکمیت سے انحراف کرنے کو صریح کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون۔ (المائدہ : ۴۴)

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قانونی حاکمیت تسلیم کرنے ہی کا نام ایمان و اسلام ہے اور اس سے انکار قطعی کفر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیثیت

دنیا میں اللہ کی اس قانونی حاکمیت کے نمائندے انبیاء علیہم السلام ہیں۔ یعنی جس ذریعے سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شارع (Law Giver) کا ہمارے لئے کیا حکم اور کیا قانون ہے' وہ ذریعہ انبیاء ہیں اور اسی بنا پر اسلام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ان کی بے چون و چرا اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آیا ہے اس نے یہی اعلان کیا ہے کہ فاتقوا اللہ واطیعون۔[1] "پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔" اور

---

[1] سورۃ الشعراء : ۱۰۸' ۱۱۰' ۱۲۶' ۱۴۴' ۱۵۰' ۱۶۳' ۱۷۹

قرآن اس بات کو بطور ایک قطعی اصول کے بیان کرتا ہے کہ:

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللّٰہ۔ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ۔ (النساء: ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔

حتیٰ کہ قرآن کسی ایسے شخص کو مسلمان ماننے سے انکار کرتا ہے جو اختلافی امور میں رسول اللہ ﷺ کو آخری فیصلہ دینے والی اتھارٹی تسلیم نہ کرے۔

فلا وربک لا یومنون حتٰی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء: ۶۵)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلاف میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔

پھر وہ کہتا ہے:

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللّٰہ ورسولہ امرا ان یکون لہم الخیرۃ من امرہم ط ومن یعص اللّٰہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔

(الاحزاب: ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جب کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لئے پھر خود اپنے معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں

قانونی حاکمیت خالصتہ" اور کلیتہ" اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔

اللہ کی سیاسی حاکمیت

اس اہم ترین دستوری مسئلے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر سیاسی حاکمیت (Political Sovereignty) کس کی ہے؟ اس کا جواب لا محالہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہے' کیونکہ انسانوں میں جو ایجنسی بھی سیاسی طاقت سے اللہ تعالیٰ کی قانونی حاکمیت کو نافذ (Enforce) کرنے کے لئے قائم ہو گی اس کو کسی بھی طرح قانون اور سیاست کی اصطلاح میں صاحب حاکمیت (Sovereign) نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جو طاقت قانونی حاکمیت نہ رکھتی ہو اور جس کے اختیارات کو پہلے ہی ایک بالاتر قانون نے محدود اور پابند کر دیا ہو جسے بدلنے کا اسے اختیار نہ ہو' وہ حاکمیت کی حامل تو نہیں ہو سکتی۔ اب اس کی صحیح پوزیشن کس لفظ سے ادا کی جائے؟ اس سوال کو قرآن ہی نے حل کر دیا ہے۔ وہ اسے لفظ خلافت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ بجائے خود حاکم اعلیٰ نہیں ہے بلکہ حاکم اعلیٰ کی نائب ہے۔

جمہوری خلافت

اس نیابت کے لفظ سے آپ کا ذہن ظل اللہ' اور پاپائیت اور بادشاہوں کے خدائی حقوق (Divine Rights of the King) کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اللہ کی نیابت کا یہ مقام کسی فرد واحد' یا کسی خاندان' یا کسی مخصوص طبقے کا حق نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کا حق ہے جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کریں اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے پہنچے ہوئے قانون الٰہی کو بالاتر قانون مان لیں۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض۔

(النور: ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جنہوں نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور عمل صالح کیا کہ وہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا۔

یہ چیز اسلامی خلافت کو قیصریت اور پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست (Theocracy) کے برعکس ایک جمہوریت بنا دیتی ہے' اس فرق کے ساتھ کہ اہل مغرب جس چیز کو لفظ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے' اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے ان کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی ہے اور بدلتی ہے اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ان کے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور ہمارے تصور کے مطابق جمہوری خلافت اللہ کے قانون کی پابند۔

---

(۲)

ریاست کے حدود عمل

خلافت کی اس تشریح سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ اسلامی دستور میں ریاست کے حدود عمل کیا ہیں۔ جب یہ ریاست اللہ کی خلافت ہے اور اللہ کی قانونی حاکمیت تسلیم کرتی ہے تو لامحالہ اس کا دائرہ اختیار ان حدود کے اندر ہی محدود رہے گا جو اللہ نے مقرر کی ہیں۔ ریاست جو کچھ کر سکتی ہے ان حدود کے اندر ہی کر سکتی ہے' ان سے تجاوز کرنے کی وہ از روئے دستور مجاز نہیں ہے۔ یہ بات صرف منطقی طور پر ہی خدا کی قانونی حاکمیت کے اصول سے نہیں نکلتی بلکہ قرآن خود اس کو صاف صاف بیان کرتا ہے۔ وہ جگہ جگہ احکام دے کر متنبہ کرتا ہے۔ **تلک حدود اللہ فلا تقربوھا۔** "یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں' ان کے پاس نہ پھٹکو۔" **تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا۔** "یہ اللہ کی حدیں ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو۔" **ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون۔** "اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔" پھر وہ بطور ایک قاعدہ کلیہ کے یہ حکم دیتا ہے کہ:

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعو الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر۔ (النساء: ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ

اور آخرت کے دن پر۔

اس آیت کی رو سے ریاست کی اطاعت لازماً خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد' اور اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ احکام خدا اور رسول کی پابندی سے آزاد ہو کر ریاست کو سرے سے اطاعت کے مطالبے کا حق ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی نکتے کو نبی اکرم ﷺ نے یوں واضح فرمایا کہ لا طاعة لمن عصی اللّٰہ۔ "کوئی اطاعت اس شخص کے لئے نہیں ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے۔" اور لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ "خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کے لئے اطاعت نہیں ہے۔"

اس اصول کے ساتھ دوسرا اصول جو یہ آیت مقرر کرتی ہے' یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی میں جو اختلاف بھی رونما ہو' خواہ وہ افراد اور افراد کے درمیان ہو یا گروہوں اور گروہوں کے درمیان یا رعیت اور ریاست کے درمیان یا ریاست کے مختلف شعبوں اور اجزاء کے درمیان' بہرحال اس کا فیصلہ کرنے کے لئے رجوع اس بنیادی قانون ہی کی طرف کیا جائے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے ہم کو دیا ہے۔ یہ اصول اپنی عین نوعیت ہی کے اعتبار سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ریاست میں لازماً کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہئے جو اختلافی معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق کرے۔

(۳)

اعضاء ریاست کے حدودِ عمل اور ان کا باہمی تعلق

یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ ریاست کے مختلف اعضاء (Organs of the State) کے اختیارات اور حدود عمل کیا ہیں۔

مجالس قانون ساز کے حدود

مقننہ (Lagislature) ہی وہ چیز ہے جسے ہمارے ہاں کی قدیم اصطلاح میں "اہل الحل والعقد" کہا جاتا ہے۔ اس کے معاملہ میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ جو ریاست اللہ اور رسول کی قانونی حاکمیت مان کر بنائی گئی ہو' اس کی مقننہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے خلاف اپنے اجماع سے بھی کوئی قانون سازی کرنے کی مجاز نہیں ہو سکتی۔ ابھی میں آپ کو قرآن کا یہ فیصلہ سنا چکا ہوں کہ "کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جس معاملے کا فیصلہ کر چکے ہوں اس میں ان کو پھر کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔" اور "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔" ان احکام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کے خلاف کوئی قانون سازی کرنا مجلس قانون ساز کے حدود اختیار سے باہر ہو' اور ہر ایسا قانون' اگر وہ لیجسلیچر پاس بھی کر دے' لازماً" حدود دستور سے متجاوز (Ultrovires of the Constitutio) قرار پائے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر اسلامی ریاست میں مقننہ کا کام ہی کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مقننہ کے کئی کام ہیں:

۱۔ جن معاملات میں اللہ اور رسول کے واضح اور قطعی احکام موجود ہیں، ان میں اگرچہ مقننہ کوئی ردوبدل نہیں کر سکتی، مگر یہ کام مقننہ ہی کا ہے کہ ان کے نفاذ کے لئے ضروری قواعد و ضوابط (Rules and Regulations) مقرر کر دے۔

۲۔ جن معاملات میں کتاب وسنت کے احکام ایک سے زیادہ تعبیرات کے متحمل ہوں، ان میں مقننہ ہی یہ طے کرے گی کہ کون سی تعبیر کو قانونی شکل دی جائے۔ اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ مقننہ ایسے اہل علم پر مشتمل ہو جو تعبیر احکام کی اہلیت رکھتے ہوں، ورنہ ان کے غلط فیصلے شریعت کو مسخ کر ڈالیں گے۔ لیکن یہ سوال رائے دہندوں کی صلاحیت انتخاب سے تعلق رکھتا ہے۔ اصولاً یہ ماننا پڑے گا کہ قانون سازی کی اغراض کے لئے مقننہ ہی مختلف تعبیرات میں سے ایک کو ترجیح دینے کی مجاز ہے اور اسی کی تعبیر قانون بنے گی، بشرطیکہ وہ تعبیر کی حد سے گزر کر تحریف کی حد تک نہ پہنچ جائے۔

۳۔ جن معاملات میں احکام موجود نہ ہوں ان میں مقننہ کا کام یہ ہے کہ اسلام کے اصول عامہ کو پیش نظر رکھ کر نئے قوانین وضع کرے یا اگر ان کے بارے میں پہلے سے مدون کئے ہوئے قوانین کتب فقہ میں موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لے۔

۴۔ جن معاملات میں کوئی اصولی رہنمائی بھی نہ ملتی ہو ان میں یہ سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قانون سازی میں آزاد چھوڑ دیا ہے، اس لئے ایسے معاملات میں مقننہ ہر طرح کے مناسب قوانین بنا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم یا اصول سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔

یہ چاروں قاعدے ہم کو سنت رسول اللہ ﷺ اور تعامل خلفائے راشدین اور مجتہدین امت کی آراء سے معلوم ہوتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو ان میں سے ہر

ایک کا ماخذ بتا سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جو شخص اسلامی ریاست کے بنیادی اصول سمجھ لے اسے خود عقل عام (Common Sense) بھی یہ بتا سکتی ہے کہ اس طرز کی ریاست میں مقننہ کے یہی حدود عمل ہونے چاہئیں۔

انتظامیہ کے حدود عمل

اب انتظامیہ کو لیجئے۔ ایک اسلامی ریاست میں انتظامیہ (Executive) کا اصل کام احکام الٰہی کو نافذ کرنا اور ان کے نفاذ کے لئے ملک اور معاشرے میں مناسب حالات پیدا کرنا ہے۔ یہی امتیازی خصوصیت اس کو ایک غیر مسلم ریاست کی انتظامیہ سے ممیز کرتی ہے' ورنہ ایک کافر حکومت اور مسلم حکومت میں کوئی فرق باقی ہی نہیں رہتا۔ انتظامیہ وہی چیز ہے جس کے لئے قرآن میں "اولی الامر" اور حدیث میں "امراء" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن و حدیث' دونوں میں ان کے سمع و طاعت (Obedience) کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ احکام خدا اور رسول کے تابع رہیں' ان سے آزاد ہو کر معصیت اور بدعت اور احداث فی الدین کی راہ پر نہ چل پڑیں۔ قرآن اس باب میں صاف کہتا ہے کہ:

ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هوه وكان امره فرطا۔
(الکہف: ۲۸)

اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہو اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہو اور جس کا امر حدود آشنا نہ ہو۔

ولا تطيعوا امر المسرفين الذين يفسدون في الارض ولا يصلحون۔
(الشعراء: ۱۵۱۔ ۱۵۲)

اور ان حد سے گزر جانے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

اور نبی اکرم ﷺ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس معاملے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ان امر علیکم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا واطیعوا۔

(مسلم)

اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

السمع والطاعة علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ مالم یومر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔ (متفق علیہ)

ایک مرد مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ برضا و رغبت' خواہ بکراہت' تاوقتیکہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاقت۔

لا طاعة فی معصیة انما الطاعة فی المعروف۔ (متفق علیہ)

معصیت میں کوئی طاعت نہیں ہے۔ طاعت صرف معروف میں ہے۔

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد۔ (متفق علیہ)

جس نے ہمارے اس کام (یعنی اسلامی نظام زندگی) میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس کے مزاج سے بیگانہ ہو تو وہ مردود ہے۔

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام۔

(البیہقی فی شعب الایمان)

جس نے کسی صاحب بدعت (یعنی اسلامی زندگی میں غیر اسلامی طریقے رائج کرنے والے) کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

ان توضیحات کے بعد اس معاملے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام میں انتظامی حکومت اور اس کے نظم و نسق کے لئے کیا حدود عمل مقرر کئے گئے

ہیں۔

عدلیہ کے حدود عمل

رہی عدلیہ (Judiciary) جو ہماری قدیم اصطلاح "قضاء" کی ہم معنی ہے' تو اس کا دائرہ عمل بھی خدا کی قانونی حاکیت کا اصول آپ سے آپ معین کر دیتا ہے۔ اسلام جب کبھی اپنے اصولوں پر ریاست قائم کرتا ہے' اس کے اولین جج خود انبیاء ہوتے ہیں' اور ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ قانون الٰہی کے مطابق کریں۔ پھر جو لوگ انبیاء کے بعد اس کرسی پر بیٹھیں ان کے لئے بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد اس قانون پر رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے ان کو ملا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ مائدہ کے دو رکوع خاص اسی موضوع پر ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی' اور بنی اسرائیل کے سارے نبی اور پھر ربانی اور احبار اسی کے مطابق یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ پھر ہم نے ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور ان کو انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اہل انجیل کو چاہئے کہ وہ بھی اس ہدایت پر فیصلے کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ اس تاریخ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ ہم نے یہ کتاب (قرآن) تمہاری طرف ٹھیک حق کے ساتھ نازل کی ہے۔

فاحکم بینہم بما انزل اللہ ولا تتبع اھوائھم عما جاءک من الحق۔

(المائدہ: ۴۸)

پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے' لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ اس تقریر کو اس فقرے پر ختم فرماتا ہے۔

افحکم الجاھلیۃ یبغون ط ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون۔

(المائدہ: ۵۰)

پھر کیا لوگ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟ یقین رکھنے والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

اس تقریر کے دوران میں اللہ تعالٰی تین مرتبہ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں' وہی ظالم ہیں' وہی فاسق ہیں۔ (المائدہ: ۴۲ - ۵۰) اس کے بعد شاید یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتیں قانون الٰہی کو نافذ کرنے کے لئے بنتی ہیں نہ کہ اس کے خلاف فیصلے کرنے کے لئے۔

مختلف اعضائے ریاست کا باہمی تعلق

اس سلسلے میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام میں ریاست کے ان تینوں اعضاء کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس باب میں احکام تو موجود نہیں ہیں' مگر عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کے تعامل (Convention) سے ہم کو پوری روشنی ملتی ہے۔ اس تعامل سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک صدر ریاست کا تعلق ہے' وہ صدر ہونے کی حیثیت سے ریاست کے ان تینوں شعبوں کا صدر ہے۔ یہی حیثیت نبی اکرم ﷺ کو حاصل تھی اور یہی خلفائے راشدین کو حاصل رہی مگر صدر سے نیچے اتر کر ہم تینوں شعبوں کو اس دور میں ایک دوسرے سے الگ پاتے ہیں۔ اس زمانے میں اہل الحل والعقد الگ تھے' جن کے مشورے سے خلافت راشدہ کے دور میں انتظامی معاملات بھی چلائے جاتے تھے اور قانونی مسائل کے فیصلے بھی کئے جاتے تھے۔ نظم و نسق کے ذمہ دار امراء الگ تھے جن کا قضاء (عدالت) میں کوئی دخل نہ تھا اور قاضی (جج اور مجسٹریٹ) الگ تھے جن پر انتظامی ذمہ داریوں کا کوئی بار نہ تھا۔

ملک کے اہم معاملات میں پالیسی بنانے یا انتظامی اور قانونی مسائل کو حل

کرنے کی جب بھی ضرورت پیش آتی' خلفائے راشدین ہمیشہ اہل الحل والعقد کو بلا کر مشورہ کرتے تھے اور مشورے سے جب کوئی فیصلہ ہو جاتا تو اہل الحل والعقد کا کام ختم ہو جاتا۔

انتظامی عہدہ دار خلیفہ کے ماتحت تھے' وہی ان کو مقرر کرتا تھا اور اسی کے احکام کے مطابق وہ نظم و نسق چلاتے تھے۔

قاضیوں کا تقرر بھی اگرچہ خلیفہ کرتا تھا' مگر ایک مرتبہ قاضی مقرر ہو جانے کے بعد پھر خلیفہ کو بھی یہ حق نہ تھا کہ ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہو۔ بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں' یا منتظمہ کے صدر ہونے کی حیثیت میں' اگر کسی شخص کا ان کے خلاف کوئی دعویٰ ہوتا تھا' تو ان کو بھی قاضیوں کے سامنے ٹھیک اسی طرح جوابدہی کرنی ہوتی تھی جس طرح رعیت کے کسی معمولی فرد کو کرنی ہوتی تھی۔

اس زمانے میں ہم کو ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی ایک شخص بیک وقت کسی علاقے کا عامل بھی ہو اور قاضی بھی۔ یا کوئی عامل یا گورنر' یا خود صدر ریاست کسی قاضی کے عدالتی فیصلوں میں دخل دینے کا مجاز ہو۔ یا کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی دیوانی و فوجداری دعووں کی جوابدہی سے یا عدالتوں کی حاضری سے مستثنیٰ ہو۔

اس نقشے کی تفصیلات میں ہم اپنی موجودہ ضرورتوں کے مطابق ردوبدل کر سکتے ہیں' مگر اس کے اصول جوں کے توں قائم رہنے چاہئیں۔ جس قسم کے جزوی ردوبدل اس میں کئے جا سکتے ہیں وہ اس طرح کے ہیں کہ مثلاً" ہم صدر ریاست کے انتظامی و عدالتی اختیارات خلفائے راشدین کی بہ نسبت محدود کر سکتے ہیں' کیونکہ اب اس درجے کے قابل اعتماد صدر ریاست ہمیں نہیں مل سکتے جیسے خلفاء راشدین تھے۔ اس لئے ہم اپنے صدر کے انتظامی اختیارات پر بھی پابندیاں عائد کر سکتے ہیں تاکہ وہ ڈکٹیٹر نہ بن جائے اور اس کو مقدمات کی براہ راست خود سماعت کرنے اور ان کے فیصلے کرنے سے بھی روک سکتے ہیں تاکہ وہ بے انصافی نہ کرنے لگے۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کیا کہ آپ کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے؟ مقرر نے اس کے جواب میں کہا کہ اس قول کے لئے میری دلیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں انتظامیہ اور عدلیہ کے شعبے بالکل الگ الگ تھے۔ رہا صدر ریاست تو اس کی ذات میں ان دونوں اختیارات کو کسی حکم شرعی کی بنا پر جمع نہیں رکھا گیا تھا۔ بلکہ اس اعتماد پر جمع کیا گیا تھا کہ وہ جج کی حیثیت سے انصاف کی مسند پر بیٹھ کر اپنی انتظامی مصلحتوں کو دخیل نہ ہونے دیں گے۔ بلکہ خلفائے راشدین کی ذات پر تو لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ وہ خود یہ چاہتے تھے کہ آخری عدالت انصاف وہی ہوں تاکہ اگر کہیں انصاف نہ ملے تو ان کے پاس ضرور مل جائے۔ اس اعتماد کی مستحق اگر کوئی شخصیت ہم نہ پاسکیں تو اسلامی دستور کے کسی قاعدے نے ہمیں اس بات پر مجبور نہیں کر دیا ہے کہ ہم صدر کی ذات میں چیف جسٹس اور انتظامیہ کے رئیس اعلیٰ کی حیثیتیں لازماً جمع رکھیں۔)

اسی طرح اس نقشے میں جو تبدیلیاں ہم کر سکتے ہیں' وہ یہ ہیں کہ مثلاً ہم اہل الحل والعقد کے انتخاب کے طریقے اور ان کی مجلس کے ضابطے حسب ضرورت بنا سکتے ہیں۔ ہم عدالتوں کے مختلف درجے' مخصوص اختیارات' حدود سماعت اور حدود عمل کے ساتھ مقرر کر سکتے ہیں وغیرذالک۔

یہاں دو سوالات اور پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ آیا اسلام میں اس امر کی گنجائش ہے کہ قضاء (عدلیہ) اہل الحل والعقد کے طے کئے ہوئے کسی قانونی مسئلے کو خلاف کتاب و سنت ہونے کی بنا پر رد کر دے؟ اس باب میں کوئی حکم میرے علم میں نہیں ہے۔ خلافت راشدہ کا تعامل بے شک یہی تھا کہ قضاء کو یہ اختیارات حاصل نہیں تھے۔ کم از کم اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قاضی نے ایسا کیا ہو۔ مگر اس کی وجہ میرے نزدیک یہ تھی کہ اس وقت اہل الحل والعقد خود کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھنے والے لوگ تھے اور سب سے بڑھ کر خود خلفائے راشدین اس معاملے میں پوری طرح قابل اعتماد تھے کہ ان کی

صدارت میں کوئی مسئلہ خلاف کتاب و سنت طے نہ ہو سکتا تھا۔ آج اگر ہم اپنے دستور میں اس امر کا کوئی قابل اطمینان انتظام نہ کر سکیں کہ کسی مجلس قانون ساز سے کوئی قانون خلاف کتاب و سنت پاس نہ ہو سکے تو عدلیہ کو مقننہ کے فیصلوں کا پابند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا کوئی قابل اطمینان انتظام نہ کیا جا سکے تو پھر آخری چارہ کار یہی ہے کہ عدلیہ کو خلاف کتاب و سنت قوانین کے رد کرنے کا اختیار دیا جائے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں مقننہ (اہل الحل والعقد) کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ محض صدر ریاست کی مشیر ہے جس کے مشوروں کو رد یا قبول کرنے کا صدر ریاست کو اختیار ہے؟ یا صدر ریاست اس کی اکثریت یا اس کے اجماع کے فیصلوں کا پابند ہے؟ اس باب میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے انجام پانے چاہئیں (وامرھم شوری بینھم) اور نبی اکرم ﷺ کو بحیثیت صدر ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

> وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ (آل عمران: ۱۵۹)
>
> اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو' پھر (مشورے کے بعد) جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔

یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں اور صدر ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے نافذ کر دے۔ لیکن یہ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیتیں جو ہمارے سامنے پیش ہے۔ حدیث میں بھی اس کے متعلق کوئی قطعی حکم مجھے نہیں ملا ہے۔ البتہ خلافت راشدہ کے تعامل سے علماء اسلام نے بالعموم یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نظم ریاست کا اصل ذمہ دار صدر ریاست ہے اور وہ اہل الحل والعقد سے مشورہ کرنے کا پابند ہے مگر اس بات کا پابند نہیں کہ ان کی اکثریت یا ان کی متفقہ رائے پر ہی

عمل کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو "ویٹو" کے اختیارات حاصل ہیں۔

لیکن یہ رائے اس مجمل صورت میں بڑی غلط فہمیوں کی موجب ہے' کیونکہ اسے لوگ موجودہ ماحول میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ماحول ان کے سامنے نہیں ہوتا جس کے تعامل سے یہ رائے اخذ کی گئی ہے۔ خلافت راشدہ کے ماحول میں جن لوگوں کو اہل الحل والعقد قرار دیا گیا تھا وہ جدا جدا پارٹیوں کی شکل میں منظم نہ تھے۔ وہ ان پارلیمنٹری ضابطوں سے بھی کسے ہوئے نہ تھے جن سے موجودہ زمانے کی مجالس قانون سازی کسی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ مجلس شوریٰ میں پہلے سے الگ الگ اپنی کچھ پالیسیاں وضع کر کے' پروگرام بنا کر اور پارٹی میٹنگز میں فیصلے کر کے بھی نہیں آتے تھے۔ انہیں جب مشورے کے لئے بلایا جاتا تو وہ کھلے دل کے ساتھ آ کر بیٹھتے' خلیفہ خود ان کی مجلس میں موجود ہوتا' مسئلہ پیش کیا جاتا' مخالف اور موافق ہر پہلو پر آزادانہ بحث ہوتی' پھر دونوں کے دلائل کا موازنہ کر کے خلیفہ اپنے دلائل کے ساتھ اپنی رائے بیان کرتا۔ یہ رائے بالعموم ایسی ہوتی تھی کہ پوری مجلس اسے تسلیم کر لیتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ چند لوگ اس سے متفق نہ ہوتے تھے مگر اسے بالکل غلط اور ناقابل تسلیم نہیں بلکہ صرف مرجوح سمجھتے تھے اور فیصلہ ہو جانے کے بعد کم از کم عمل کے لئے اسی کو مان لیتے تھے۔ پوری خلافت راشدہ کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اہل الحل والعقد کی مجلس میں ایسی تفریق رونما ہوئی ہو کہ رائے شماری کی نوبت آئے۔ اور پوری خلافت راشدہ کی تاریخ میں صرف دو مثالیں اس امر کی ملتی ہیں کہ خلیفہ وقت نے اہل الحل والعقد کی قریب قریب متفقہ رائے کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک جیش اسامہ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا معاملہ۔ لیکن ان دونوں معاملات میں صحابہ نے جس بناء پر خلیفہ کے فیصلے کو مانا وہ یہ نہیں تھی کہ دستور اسلامی نے خلیفہ کو ویٹو کے اختیارات دے رکھے ہیں اور دستوری طور پر وہ بادل نخواستہ اس کا فیصلہ ماننے کے لئے مجبور ہیں' بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ صحابہ

کرام کو حضرت ابوبکرؓ کے فہم و فراست اور دینی بصیرت پر پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابوبکرؓ اس رائے کی صحت پر اتنا یقین رکھتے ہیں اور دینی مصالح کے لئے اس کو اتنی زیادہ اہمیت دے رہے ہیں' تو انہوں نے کھلے دل سے ان کی رائے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس لے لی۔ بلکہ بعد میں ان کی اصابت رائے کو کھلم کھلا سراہا اور اعتراف کیا کہ اگر اَن مواقع پر ابوبکرؓ استقامت نہ دکھاتے تو اسلام ہی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ مرتدین کے معاملے میں حضرت عمرؓ نے' جو سب سے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اختلاف کر چکے تھے' علی الاعلان کہا کہ اللہ نے ابوبکرؓ کا سینہ اس کام کے لئے کھول دیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ حق وہی ہے جس کا فیصلہ انہوں نے کیا ہے۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام میں ویٹو کا یہ تصور دراصل کس ماحول کی نظیروں سے پیدا ہوا ہے۔ اگر شوریٰ کا طرز اور اس کی روح اور اہل شوریٰ کی ذہنیت اور سیرت وہی ہو جو خلافت راشدہ کے اس نمونے میں ہم دیکھتے ہیں تو پھر اس سے بہتر کوئی طریق کار نہیں ہے جو وہاں اختیار کیا گیا۔ اس طریق کار کو اگر ہم اس کے آخری منطقی نتائج تک لے جائیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرز کی مجلس شوریٰ میں اگر صدر ریاست اور ارکان مجلس اپنی اپنی رائے پر اڑ جائیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس نہ لے تو استصواب عام (Referandum) کرا لیا جائے' پھر جس کی رائے کو بھی رائے عام رد کر دے وہ مستعفی ہو جائے۔ لیکن جب تک ہمارے لئے اپنے ملک میں اس روح اور اس ذہنیت اور اس طرز کی مجلس شوریٰ بنانا ممکن نہیں ہے' اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم انتظامیہ کو مقننہ کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند کریں۔

---

(۴)

ریاست کا مقصد وجود

اب اس مسئلے کو لے لیجئے کہ اسلام وہ کون سے بنیادی مقاصد (Objectives) پیش کرتا ہے جن کے لئے ایک اسلامی ریاست کو کام کرنا چاہئے۔ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں ان مقاصد کی جو توضیح کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالی فرماتا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (الحدید ۲۵)

ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ (الحج: ۴۱)

(یہ مسلمان جن کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے وہ لوگ ہیں) جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اور حدیث میں ہے:

ان اللہ لیزع بالسلطان ما لا یزع بالقران۔ (تفسیر ابن کثیر)

اللہ حکومت کے ذریعہ سے ان چیزوں کا سدباب کرتا ہے جن کا سدباب

قرآن کے ذریعہ سے نہیں کرتا۔

یعنی جو برائیاں قرآن کی نصیحت اور فہمائش سے نہ دور ہوں' ان کو مٹانے اور دبانے کے لئے حکومت کی طاقت درکار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا اصل مقصد اس اصلاحی پروگرام کو مملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی بہتری کے لئے پیش کیا ہے۔ محض امن کا قیام' محض قومی سرحدوں کی حفاظت' محض عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا اس کا آخری اور انتہائی مقصد نہیں ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت' جو اسے غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے' یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آراستہ کرنا چاہتا ہے اور وہ ان برائیوں کو مٹانے اور دبانے میں اپنی ساری طاقت خرچ کر دے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

(۵)

حکومت کی تشکیل کیسے ہو؟

ان بنیادی امور کی توضیح کے بعد ہمارے سامنے پانچواں سوال آتا ہے' یہ کہ جو ریاست ان بنیادوں پر تعمیر ہو اس کا نظام چلانے کے لئے حکومت کی تشکیل کیسے کی جائے؟ اس معاملے میں سب سے اہم مسئلہ رئیس مملکت (Head of the State) کے تقرر کا ہے جس کو اسلام میں امام' امیر اور خلیفہ کی مختلف اصطلاحوں سے یاد کیا جاتا ہے اور اس باب میں اسلام کے مسلک کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف رجوع کریں۔

صدر ریاست کا انتخاب

جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں' ہمارے موجودہ اسلامی معاشرے کا آغاز مکے میں کفر کے ماحول میں ہوا تھا اور اس ماحول سے لڑ کر اسلامی معاشرے کی ابتدا کرنے والے سیدنا محمد ﷺ تھے۔ یہ اسلامی معاشرہ جب اپنے نظم اور سیاسی خود مختاری میں ترقی کر کے ایک اسٹیٹ بننے کی منزل پر پہنچا تو اس کے اولین رئیس بھی آنحضور ﷺ ہی تھے اور آپ کسی کے منتخب کردہ نہ تھے بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کئے ہوئے تھے۔

دس سال تک آپ ﷺ اس ریاست کی امارت کا فریضہ انجام دینے کے بعد رفیق اعلیٰ سے جا ملے بغیر اس کے کہ اپنی جانشینی کے متعلق کوئی صریح اور قطعی ہدایت دے کر تشریف لے جاتے۔ آپ ﷺ کے اس سکوت سے اور قرآن مجید کے اس ارشاد سے کہ وامرھم شوریٰ بینھم (مسلمانوں کے معاملات آپس کے مشورے

سے انجام پاتے ہیں) صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ نبی کے بعد رئیس مملکت کا تقرر مسلمانوں کے اپنے انتخاب پر چھوڑا گیا ہے' اور یہ انتخاب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہئے۔[1] چنانچہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب مجمع عام میں ہوا۔

پھر جب ان کا آخری وقت آیا تو اگرچہ ان کی رائے میں خلافت کے لئے موزوں ترین شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے' لیکن انہوں نے اپنے جانشین کو نامزد نہ کیا بلکہ اکابر صحابہ کو الگ الگ بلا کر ان کی رائے معلوم کی' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں اپنی وصیت املا کرائی' پھر حالت مرض ہی میں اپنے حجرے کے دروازے سے مسلمانوں کے مجمع عام کو خطاب کر کے فرمایا:

اترضون بمن استخلف علیکم؟ فانی واللہ ماالوت من جهدی الرای ولا ولیت ذا قرابة۔ وانی استخلف عمر بن الخطاب' فاسمعوا له واطیعوا۔

کیا تم راضی ہو اس شخص سے جس کو میں تم پر اپنا جانشین بناؤں؟ خدا کی قسم میں نے غور و فکر کر کے رائے قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی' اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا ہے۔ میں نے عمر بن الخطاب کو جانشین بنایا ہے۔ پس تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

مجمع سے آوازیں آئیں: سمعنا واطعنا۔ ہم نے سنا اور مانا۔

(طبری۔ ج ۲ ص ۶۱۸۔ مطبع ے الاستقامہ مصر)

---

[1] اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں سے حضرات شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کی طرح امامت کا منصب بھی توقیفی ہے' یعنی امام بھی اللہ تعالٰی کی طرف سے مامور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف اب عملاً" یوں ختم ہو گیا ہے کہ شیعہ حضرات کے نزدیک بھی بارھویں امام کی غیبت کے بعد چونکہ منصب امامت ان کے ظہور ثانی تک موقوف ہے' اس لئے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی سربراہ کاری اب بہرحال کسی غیر مامور من اللہ ہی کے سپرد ہونی چاہئے۔

اس طرح مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ کا تقرر بھی نامزدگی سے نہیں ہوا بلکہ خلیفہ وقت نے مشورے سے ایک شخص کو تجویز کیا اور پھر مجمع عام میں اس کو پیش کر کے منظور کرایا۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دنیا سے رخصت ہونے کی باری آئی۔ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد ترین رفیقوں میں سے چھ اصحاب ایسے موجود تھے جن پر خلافت کے لئے مسلمانوں کی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی چھ اصحاب کی ایک مجلس شوریٰ بنا دی اور ان کے سپرد یہ کام کیا کہ باہمی مشورے سے ایک شخص کو خلیفہ تجویز کریں اور اعلان کر دیا کہ:

من تامر منکم علی غیر مشورة من المسلمین فاضربوا عنقه۔

(الفاروق عمرؓ لمحمد حسین ھیکل۔ ج ۲ ص ۳۱۳)

تم میں سے جو کوئی مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بنے اس کی گردن مار دو۔

اس مجلس نے بالآخر انتخاب کا کام حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف کے سپرد کیا اور انہوں نے مدینے میں چل پھر کر عام لوگوں کی رائے معلوم کی۔ گھر گھر جا کر عورتوں تک سے پوچھا۔ مدرسوں میں جا کر طلبہ تک سے دریافت کیا۔ مملکت کے مختلف حصوں کے جو لوگ حج سے اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس جاتے ہوئے مدینے ٹھہرے تھے ان سے استصواب کیا۔ اور اس تحقیقات سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ امت میں سب سے زیادہ معتمد دو شخص ہیں' عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ۔ اور ان دونوں میں سے عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف زیادہ لوگوں کا میلان ہے۔ اسی رائے پر آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ ہوا اور مجمع عام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور امت میں سخت افراتفری برپا ہو گئی۔ اس موقع پر صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان پر جمع ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ آج آپ سے زیادہ امارت کا حق دار کوئی نہیں' آپ اس بار کو

سنبھالیں۔ حضرت علی ؓ نے انکار کیا، مگر وہ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ اگر آپ لوگ یہی چاہتے ہیں تو مسجد میں چلیے۔

فلن بیعتی لا تکون خفیا ولا تکون الاعن رضا من المسلمین

(طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۵)

کیونکہ میری بیعت خفیہ طور پر نہیں ہو سکتی اور مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر اس کا انعقاد ممکن نہیں ہے۔

چنانچہ آپ مسجد نبوی ﷺ میں تشریف لے گئے اور مہاجرین و انصار جمع ہوئے اور سب کی نہیں تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت کی مرضی سے آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

پھر جب حضرت علی ؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد کیا ہم آپ کے صاحبزادے حضرت حسن سے بیعت کر لیں؟ اس پر انہوں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ:

ما آمرکم ولا انھاکم، انتم ابصر۔ (طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۱۲)

میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔

یہ ہے رئیس مملکت کے تقرر کے معاملے میں خلافت راشدہ کا تعامل اور صحابہ کرام کا اجماعی طرز عمل جس کی بنیاد خلافت کے باب میں نبی اکرم ﷺ کے سکوت اور تمام اجتماعی معاملات کے باب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد و امرھم شوریٰ بینھم پر رکھی گئی تھی۔ اس مستند دستوری رواج سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں صدر کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔ کوئی شخص خود زبردستی امیر بن جانے کا حق نہیں رکھتا۔[1] کسی خاندان یا

---

[1] بعض لوگ یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ اگر اسلام کا اصول یہی ہے تو پھر دور بادشاہی کے نامور

طبقے کا اس منصب پر اجارہ نہیں ہے۔[2] اور انتخاب کسی جبر کے بغیر مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی سے ہونا چاہئے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی پسند کیسے معلوم کی جائے' تو اس کے لئے اسلام میں کوئی خاص طریق کار مقرر نہیں کر دیا گیا ہے۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں' بشرطیکہ ان سے معقول طور پر یہ معلوم کیا جا سکتا ہو کہ جمہور قوم کا اعتماد کس شخص کو حاصل ہے۔

بقیہ حاشیہ

علماء نے زبردستی مسلط ہو جانے والے لوگوں کی خلافت و امارت کیسے تسلیم کی؟ لیکن یہ شبہ دراصل دو مختلف مسائل کو خلط ملط کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ اسلام میں خلیفہ یا امیر کے تقرر کا صحیح و معتبر طریقہ کیا ہے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کبھی کسی وجہ سے غلط طریقے پر کوئی شخص مسلط ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ پہلے مسئلے کا جواب تمام علمائے امت نے بالاتفاق یہی دیا ہے کہ صحیح طریق کار انتخاب ہے جو مسلمانوں کی رضامندی سے ہو۔ رہا دوسرا مسئلہ تو اس میں زیادہ سے زیادہ نرم رویہ جن بزرگوں نے اختیار کیا ہے وہ بھی اس سے آگے نہیں جاتے کہ ایسی امارت صرف نظم اور اجتماع کلمہ مسلمین کی خاطر برداشت کر لینی چاہئے۔ بشرطیکہ اس طرح جبراً مسلط ہونے والا امیر نظام دین کو خراب نہ کرتے۔ بالفاظ دیگر یہ لوگ اس شرط کے متحقق ہونے کی صورت میں جابرانہ امارت کے خلاف بغاوت کرنا درست نہیں سمجھتے تاکہ کہیں نظام کی جگہ بدنظمی نہ لے لے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں ان کے نزدیک جبری تسلط انعقاد خلافت کی کوئی صحیح صورت ہے۔

[2] اس معاملے میں بھی بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ پھر ان احادیث کی کیا توجیہ ہے جن میں خلافت کے لئے قبیلہ قریش کو احق ٹھہرایا گیا ہے مگر اس کا جواب ہم اپنی کتاب "رسائل و مسائل" میں دے چکے ہیں۔

مجلس شوریٰ کی تشکیل

انتخاب امیر کے بعد دوسرا اہم مسئلہ اہل الحل والعقد (یعنی مجلس شوریٰ کے ارکان) کا ہے کہ وہ کیسے چنے جائیں گے اور کون ان کو چنے گا۔ سرسری مطالعے کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ خلافت راشدہ میں چونکہ عام انتخابات (General Elections) کے ذریعہ سے ارکان شوریٰ منتخب نہیں ہوتے تھے اس لئے اسلام میں سرے سے مشورے کا کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے' بلکہ یہ بات بالکل خلیفہ وقت کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ جس سے چاہے مشورہ لے۔ لیکن یہ گمان دراصل اس زمانے کی باتوں کو اس زمانے کے ماحول میں رکھ کر دیکھنے سے پیدا ہوا ہے' حالانکہ ان کو اسی وقت کے ماحول میں رکھ کر دیکھنا چاہئے اور عملی تفصیلات کے اندر وہ اصول سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے جو ان میں ملحوظ رکھے گئے تھے۔

اسلام مکہ معظمہ میں ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھا تھا۔ تحریکوں کے مزاج کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے آگے بڑھ کر ان کو لبیک کہتے ہیں وہ لیڈر کے رفیق' دست و بازو اور مشیر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں بھی جو سابقین اولین تھے وہ بالکل ایک فطری طریقے پر نبی اکرم ﷺ کے رفیق اور مشیر قرار پائے جن سے آپ ہر ایسے معاملے میں مشورہ کرتے تھے جس میں خدا کی طرف سے کوئی صریح حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا۔ پھر جب اس تحریک میں نئے نئے آدمیوں کا اضافہ ہونے لگا اور مخالف طاقتوں سے اس کی کشمکش بڑھتی گئی تو ایسے لوگ خود بخود نمایاں ہوتے چلے گئے جو اپنی خدمات' قربانیوں اور بصیرت و فراست کی بنا پر جماعت میں ممتاز تھے۔ ان کا انتخاب ووٹوں سے نہیں بلکہ تجربات اور آزمائشوں سے ہوا تھا جو الیکشن کی بہ نسبت زیادہ صحیح اور فطری طریق انتخاب ہے۔ اس طرح مکہ چھوڑنے سے پہلے دو قسم کے لوگ نبی اکرم ﷺ کی مجلس شوریٰ کے رکن بن چکے تھے۔ ایک سابقین اولین۔ دوسرے وہ آزمودہ کار اصحاب جو بعد میں جماعت کے

اندر نمایاں ہوئے۔ یہ دونوں گروہ ایسے تھے جن کو نبی اکرم ﷺ کی طرح تمام مسلمانوں کا اعتماد بھی حاصل تھا۔

اس کے بعد ہجرت کا اہم واقعہ پیش آیا اور اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ڈیڑھ دو سال پہلے مدینے کے چند بااثر لوگ اسلام قبول کر چکے تھے اور ان کے اثر سے اوس اور خزرج کے قبیلوں میں گھر گھر اسلام پہنچ گیا تھا۔ انہی لوگوں کی دعوت پر نبی اکرم ﷺ اور دوسرے مہاجرین اپنے اپنے گھربار چھوڑ کر مدینے منتقل ہوئے اور وہاں اسلام کی ایک تحریک نے ایک سیاسی نظام اور ایک ریاست کی شکل اختیار کی۔ اب یہ بالکل ایک قدرتی بات تھی کہ مدینے میں جن لوگوں کے اثر سے اسلام پھیلا اور پھیلا گیا وہی جدید معاشرے اور سیاسی نظام میں مقامی لیڈروں کی پوزیشن پر فائز ہوئے اور انہی کا یہ مرتبہ و مقام تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی مجلس شوریٰ میں سابقین اولین اور آزمودہ کار مہاجرین کے ساتھ ایک تیسرے عنصر (انصار) کی حیثیت سے شامل ہوں۔ یہ لوگ بھی فطری طریق انتخاب سے منتخب ہوئے تھے اور مسلمان قبیلوں کے ایسے معتمد علیہ تھے کہ اگر موجودہ زمانے کے طریقے پر انتخابات منعقد ہوتے تب بھی یہی لوگ منتخب ہو کر آتے۔

پھر مدنی معاشرے میں دو قسم کے لوگ اور ابھرنے شروع ہوئے۔ ایک وہ جنہوں نے آٹھ دس برس کی سیاسی' فوجی اور تبلیغی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے حتیٰ کہ ہر اہم معاملے میں انہی کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے علم و فہم اور دین میں فقاہت کے اعتبار سے ناموری حاصل کی حتیٰ کہ عوام الناس نبی اکرم ﷺ کے بعد علم دین میں انہی کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے لگے اور خود آنحضور ﷺ نے بھی یہ فرما کر ان کو سند اعتبار عطا کی کہ قرآن فلاں شخص سے سیکھو' اور فلاں نوعیت کے مسائل میں فلاں شخص کی طرف رجوع کرو۔ یہ دونوں عناصر بھی مجلس شوریٰ میں بالکل ایک فطری انتخاب سے شامل ہوتے گئے چلے گئے اور ان میں بھی کسی کے لئے ووٹ لینے کی حاجت

پیش نہ آئی۔ ووٹ اگر لئے بھی جاتے تو اس معاشرے میں ان کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس پر مسلمانوں کی نگاہ انتخاب پڑتی۔

اس طرح نبی اکرم ﷺ ہی کے زمانے میں وہ مجلس شوریٰ بن چکی تھی جو بعد کو خلفائے راشدین کی مشیر قرار پائی اور وہ دستوری روایات بھی مستحکم ہو چکی تھیں جن کے مطابق آگے چل کر ایسے نئے لوگ اس مجلس میں شامل ہوتے گئے جنہوں نے اپنی خدمات اور اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتوں کے ذریعہ سے قبول عام حاصل کر کے اس مجلس میں اپنی جگہ پیدا کی۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو اہل الحل والعقد (باندھنے اور کھولنے والے) کہا جاتا تھا اور جن کے مشورے کے بغیر خلفائے راشدین کسی اہم معاملے کا فیصلہ نہ کرتے تھے۔ ان کی آئینی حیثیت کا صحیح اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ جب حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد چند اصحاب نے حضرت علی ؓ کے پاس حاضر ہو کر خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:

لیس ذالک الیکم' انما ھو لاھل الشوریٰ و اھل بدر فمن رضی بہ اھل الشوریٰ واھل بدر فھو الخلیفۃ فنجتمع وننظر فی ھذا الامر۔

(الامامہ والسیاسہ لابن قتیبہ' مطبعہ الفتوح' مصر صفحہ ۴۱)

یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں ہے یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے۔ جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر پسند کریں گے۔ وہی خلیفہ ہو گا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل الحل والعقد اس وقت کچھ متعین لوگ تھے' پہلے سے اس پوزیشن پر فائز چلے آ رہے تھے اور وہی ملت کے اہم معاملات کا فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔ لہٰذا یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ خلیفہ وقت من مانے طریقے پر جس وقت جس کو چاہتا تھا مشورے کے لئے بلا لیتا تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ مستقل اہل شوریٰ یا اہل الحل والعقد کون ہیں جو قوم کے مسائل

مہمہ کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔

خلافت راشدہ کے اس تعامل' بلکہ خود اسوہ نبوی سے جو قاعدہ کلیہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امیر کو مشورہ ہر کس و ناکس سے' یا اپنی مرضی کے چنے ہوئے لوگوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے کرنا چاہئے جو عامہ مسلمین کے معتمد ہوں' جن کے اخلاص و خیر خواہی اور اہلیت پر لوگ مطمئن ہوں اور حکومت کے فیصلوں میں جن کی شرکت اس امر کی ضامن ہو کہ ان فیصلوں کے نفاذ میں جمہور قوم کا دلی

ا۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اہل حل و عقد صرف مدینے ہی کے لوگ کیوں ہوتے تھے؟ ملک کے دوسرے حصوں سے معتمد علیہ نمائندے کیوں نہیں بلائے جاتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ اس کے دو نہایت معقول وجوہ تھے۔

اول یہ کہ اسلامی ریاست ایک قومی ریاست نہ تھی بلکہ اس طرح وجود میں آئی تھی کہ پہلے ایک نظریے کی تبلیغ نے لوگوں میں ذہنی و اخلاقی انقلاب برپا کیا' پھر اس انقلاب کے نتیجے میں ایک اصولی معاشرہ پیدا ہوا اور پھر اس معاشرے نے ایک اصولی ریاست کی شکل اختیار کی۔ اس قسم کی ریاست میں فطرتاً" مرکز اعتماد وہ شخص واحد تھا جس نے اس انقلاب کی بنا ڈالی اور اس کے بعد وہ لوگ اس پوری انقلابی سوسائٹی کے اندر مرکز اعتماد بنے جو بانی انقلاب کے دست راست تھے۔ ان کی لیڈر شپ ایک فطری لیڈر شپ تھی اور ان کے سوا کوئی بھی اس سوسائٹی میں لوگوں کا معتمد علیہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کی مکمل آزادی کے باوجود اس دور میں کبھی عرب کے کسی گوشے سے یہ آواز نہ اٹھی کہ صرف مدینے ہی کے لوگ آخر "باندھنے اور کھولنے" کے اجارہ دار کیوں بن بیٹھے ہیں۔

دوم یہ کہ اس زمانے کے تمدنی حالات میں یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ افغانستان سے لے کر شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی مملکت میں عام انتخابات منعقد ہوا کرتے اور پھر مجلس شوریٰ کے معمولی اور غیر معمولی اجلاسوں میں مملکت کے ہر حصے سے ارکان مجلس آ آ کر شریک ہوا

کرتے۔

تعاون شریک ہو گا۔ رہا یہ سوال کہ عوام کے معتمد لوگ کیسے معلوم کئے جائیں' تو ظاہر ہے کہ اس چیز کے معلوم ہونے کی جو صورت آغاز اسلام کے مخصوص حالات میں تھی آج وہ صورت نہیں ہے اور اس زمانے کے تمدنی حالات میں جو موانع موجود تھے وہ بھی آج موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہم آج کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے وہ تمام ممکن اور مباح طریقے اختیار کر سکتے ہیں جن سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ جمہور قوم کا اعتماد کن لوگوں کو حاصل ہے۔ آج کل کے انتخابات بھی اس کے جائز طریقوں میں سے ایک ہیں' بشرطیکہ ان میں وہ ذلیل ہتھکنڈے استعمال نہ ہوں جنہوں نے جمہوریت کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔

حکومت کی شکل اور نوعیت

اس کے بعد تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت کی شکل اور نوعیت کیا ہے۔ اس باب میں جب ہم خلافت راشدہ کے دور پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امیرالمومنین اصل وہ شخص تھا جس سے سمع و طاعت کی بیعت کی جاتی تھی۔ اور جسے بھروسے کا آدمی سمجھ کر لوگ اپنی اجتماعی زندگی کے اہم ترین معاملے' یعنی حکومت کی باگ ڈور سپرد کرتے تھے۔ اس کی حیثیت انگلستان کے بادشاہ' فرانس کے صدر' برطانیہ کے وزیراعظم' امریکہ کے صدر' اور روس کے اسٹالن' سب سے مختلف تھی۔ وہ محض صدر ریاست ہی نہ تھا بلکہ اپنا رئیس الوزراء بھی آپ ہی تھا۔ وہ پارلیمنٹ میں براہ راست خود شریک ہوتا تھا اور آپ ہی پارلیمنٹ کی صدارت بھی کرتا تھا۔ پھر وہ مباحثوں میں بھی پورا حصہ لیتا تھا اور اپنی حکومت کے سارے کاموں کی جواب دہی کرتا اور اپنا حساب آپ دیتا تھا۔ اس کی پارلیمنٹ میں نہ کوئی گورنمنٹ تھی نہ اپوزیشن پارٹی۔ ساری پارلیمنٹ اس کی پارٹی تھی اگر وہ حق کے مطابق چلے اور ساری پارلیمنٹ اپوزیشن تھی اگر وہ باطل کی طرف جاتا نظر آئے۔ ہر ممبر آزاد تھا کہ جس معاملے میں اس سے اتفاق رکھتا ہو اتفاق کرے اور جس میں اس سے اختلاف رکھتا ہو اختلاف کرے۔ خلیفہ کے اپنے

وزراء تک پارلیمنٹ میں اس کے خلاف اظہار رائے کر جاتے تھے اور پھر بھی وزارت اور صدارت میں خوب نبھتی تھی۔ کسی کے مستعفی ہونے کا سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ خلیفہ صرف پارلیمنٹ ہی کے سامنے جواب دہ نہ تھا بلکہ پوری قوم کے سامنے اپنے ہر کام' حتیٰ کہ اپنی شخصی زندگی کے معاملات تک میں جواب دہ تھا۔ وہ پانچوں وقت مسجد میں پبلک کا سامنا کرتا' ہر جمعے کو پبلک سے خطاب کرتا اور پبلک اپنے شہر کے گلی کوچوں میں ہر روز چلتے پھرتے اس کو پا سکتی تھی اور ٹوک سکتی تھی۔ ہر شخص ہر وقت اس کا دامن پکڑ کر اپنا حق مانگ سکتا تھا اور ہر شخص مجمع عام میں اس سے باز پرس بھی کر سکتا تھا۔ اس کے ہاں یہ قاعدہ نہ تھا کہ حکومت سے کوئی سوال کرنا ہو تو پارلیمنٹ کا کوئی ممبر ہی نوٹس دے کر لگے بندھے قواعد کے مطابق پوچھ سکتا ہے۔ اس کا اعلان عام تھا کہ :

لن احسنت فاعینونی وان اسات فقومونی .... اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم

(الصدیق محمد حسین ہیکل صفحہ ٦٧)

اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر برا رویہ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو .... جب تک میں اللہ اور رسول کا مطیع رہوں میری اطاعت کرو اور اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تمہارے ذمے نہیں ہے۔

یہ طرز حکومت' جس پر موجودہ زمانے کی اصطلاحوں میں سے کسی اصطلاح کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا' اسلام کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے اور ہمارا آئیڈیل یہی ہے۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں نبھ سکتا ہے جبکہ سوسائٹی اسلام کے انقلابی نظریات کے مطابق پوری طرح تیار ہو چکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی سوسائٹی میں انحطاط رونما ہوا' اس کا نبھنا مشکل ہو گیا۔ اب اگر ہم اس آئیڈیل کی طرف پھر پلٹنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ابتدائے کار کے لئے اس سے چار

بنیادی اصول لے لیں اور پھر انہیں اپنے حالات و ضروریات کے مطابق عملی جامہ پہنائیں۔

ایک یہ کہ حکومت کی اصل ذمہ داری جس کے بھی سپرد کی جائے وہ نہ صرف پبلک کے نمائندوں کا بلکہ خود پبلک کا بھی سامنا کرے اور اپنا کام نہ صرف مشورے سے انجام دے بلکہ اپنے اعمال کے لئے جواب دہ بھی ہو۔

دوسرے یہ کہ پارٹی سسٹم سے نجات حاصل کی جائے جو نظام حکومت کو بیجا عصبیتوں سے آلودہ کرتا ہے اور جس میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک جاہ پسند ٹولا برسر اقتدار آکر پبلک کے خرچ پر اپنے مستقل حمایتی پیدا کرلے اور پھر لوگ خواہ کتنا ہی شور مچائیں وہ ان حمایتوں کے بل پر اپنی من مانی کرتا رہے۔

تیسرے یہ کہ نظام حکومت ایسے پیچ دار ضابطوں پر قائم نہ کیا جائے جس سے کام کرنے والے کے لئے کام کرنا اور حساب لینے والوں کے لئے حساب دینا اور خرابی کے اصل ذمہ دار کو مشخص کرنا مشکل ہو جائے۔

اور سب سے آخری مگر سب سے اہم اصول یہ ہے کہ صاحب امر اور اہل شوریٰ ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن کے اندر اسلام کی بتائی ہوئی صفات زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہوں۔

(۲)

اولی الامر کے اوصاف

یہ اوصاف (Qualifications) کا سوال اسلامی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے' حتیٰ کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دستور کے چلنے یا نہ چلنے کا سارا انحصار ہی اس پر ہے۔

امارت اور مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے ایک اہلیت تو قانونی نوعیت کی ہوتی ہے جس پر ایک ناظم انتخاب اور ایک جج جانچ اور پرکھ کر انتخاب کے لئے ایک شخص کے اہل (Eligible) ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور دوسری ایک اور قسم کی اہلیت بھی ہوتی ہے جس کا لحاظ کر کے اشخاص کو چھانٹنے اور تجویز کرنے اور ووٹ دینے والے اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی اہلیت ایک ملک کے کروڑوں باشندوں میں سے ہر ایک میں ہوتی ہے' مگر یہ دوسری قسم کی اہلیت ہی ہے جو عملاً" ان میں سے چند ہی آدمیوں کو ابھار کر اوپر لاتی ہے۔ پہلی قسم کی اہلیت کے معیارات صرف دستور کی چند عملی دفعات (Operative Clauses) میں درج کرنے کے لئے ہوتے ہیں' لیکن یہ دوسری قسم کی اہلیت وہ ہے جس کے معیارات پورے دستور کی روح میں موجود ہونے چاہئیں اور ایک دستور کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ جمہور کے ذہن کو تربیت دے کر صحیح انتخاب کے لئے تیار کیا جائے تاکہ وہ ایسے ہی لوگوں کو منتخب کریں جو دستور کی روح کے مطابق اہلیت رکھتے ہوں۔

قرآن اور حدیث ان دونوں قسم کی اہلیتوں سے بحث کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی

اہلیت کے لئے انہوں نے چار معیار بتائے ہیں:

۱۔ مسلم ہونا' چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

(النساء: ۵۹)

اے ایمان لانے والو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔

۲۔ مرد ہونا' چنانچہ قرآن کہتا ہے:

الرجال قوامون علی النساء۔ (النساء: ۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

اور نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ (بخاری)

وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنی زمام کار ایک عورت کے سپرد کی ہو۔

۳۔ عاقل و بالغ ہونا' چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

ولا تؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیما۔ (النساء: ۵)

اور اپنے مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے ہستی کا سہارا بنایا ہے' نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔

۴۔ دارالاسلام کا باشندہ ہونا۔ چنانچہ قرآن تصریح کرتا ہے:

والذین امنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیء حتی یھاجروا۔

(الانفال: ۷۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) نہ آ گئے' تمہارا ان کی ولایت میں کوئی حصہ نہیں جب تک کہ ہجرت نہ کریں۔

یہ ہیں وہ چار قانونی صفات جن کے لحاظ سے ہر شخص امارت اور رکنیت

شوریٰ کا اہل ہو سکتا ہے۔ مگر اس طرح کے بے شمار قانونی اہل اشخاص میں سے کن لوگوں کو ہمیں ان مناصب کے لئے چننا چاہئے اور کن کو نہ چننا چاہئے' اس سوال کا واضح جواب ہمیں قرآن اور حدیث میں یہ ملتا ہے:

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا۔ (النساء: ۵۸)

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہل امانت (یعنی امین لوگوں) کے سپرد کرو۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات: ۱۳)

تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

قال ان اللہ اصطفہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔

(البقرہ: ۲۴۷)

نبی نے کہا کہ اللہ نے حکمرانی کے لئے اس کو (یعنی طالوت کو) تم پر ترجیح دی ہے اور اس کو علم اور جسم میں فراوانی عطا کی ہے۔

ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھوہ وکان امرہ فرطا۔

(الکہف: ۲۸)

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا کام حدود آشنا نہیں ہے۔

من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علیٰ ھدم الاسلام۔ (البیہقی)

جس نے کسی صاحب بدعت کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

انا واللہ لا نولی علی عملنا ھذا احدا سالہ او حرص علیہ

(بخاری و مسلم)

بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے

جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو۔

ان اخوانکم عندنا من طلبہ۔ (ابوداؤد)

ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس کا طالب ہو۔

ان اوصاف میں سے بعض کو تو ہم باسانی اپنے دستور کے عملی دفعات میں رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ طالب منصب کو انتخاب کے لئے نااہل قرار دیا جائے۔ رہے دوسرے اوصاف جن کے لئے کوئی قانونی حد متعین نہیں کی جا سکتی، تو ان کو ہمارے دستور کی اصولی ہدایات میں شامل ہونا چاہئے اور ناظم انتخابات کے فرائض میں یہ بات داخل ہونی چاہئے کہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر عوام کو ان صفات سے باخبر کرنے کی کوشش کرے جو اسلام میں اولی الامر کے لئے مطلوب ہیں۔

---

(۷)

شہریت اور اس کی بنیادیں

اب شہریت کے مسئلے کو لیجیے۔ اسلام چونکہ ایک نظام فکر و عمل ہے اور اسی نظام کی بنیاد پر وہ ایک ریاست قائم کرتا ہے' اس لئے وہ اپنی ریاست میں شہریت کی دو قسمیں قرار دیتا ہے۔ پھر چونکہ راست بازی و حق گوئی اسلام کی اصل روح ہے' اس لئے وہ بغیر کسی مکر و فریب کے صاف صاف شہریت کی 'س تقسیم کو بیان بھی کر دیتا ہے' دنیا کو دھوکا دینے کے لئے یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ زبان سے اپنے سب شہریوں کو یکساں قرار دے اور عمل میں ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرے بلکہ ان کے ایک عنصر کو انسانی حقوق تک دینے میں بے انصافی سے کام لے' جیسا کہ امریکہ میں حبشیوں کا اور روس میں غیر اشتراکیوں کا اور تمام دنیا کی لادینی جمہوریتوں میں قومی اقلیتوں کا حال ہے۔

شہریت کی دو قسمیں جو اسلام نے کی ہیں' یہ ہیں:

ایک' مسلم۔

دوسرے' ذمی۔

۱۔ مسلم شہریوں کے باب میں قرآن کہتا ہے کہ:

ان الذین امنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین اووا ونصروا اولئکبعضھم اولیاء بعض ط والذ ین امنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیء حتی یھاجروا۔ (الانفال: ۷۲)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جان و مال سے راہ

خدا میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی' وہ ایک دوسرے کے ولی ہیں اور جو لوگ ایمان لائے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) نہ آئے' تمہارے لئے ان کی ولایت میں سے کچھ نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔

اس آیت میں شہریت کی دو بنیادیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ایمان' دوسرے دارالاسلام کی رعایا ہونا یا بن جانا۔ اگر کوئی شخص ایمان رکھتا ہو' مگر دارا لکفر کی تابعیت ترک کر کے (جسے لفظ ہجرت سے تعبیر کیا گیا ہے) دارالاسلام میں نہ آ بسے' تو وہ دارالاسلام کا شہری نہیں ہے۔ اس کے برعکس تمام ایسے اہل ایمان جو دارالاسلام کے باشندے ہوں' قطع نظر اس سے کہ وہ دارالاسلام ہی میں پیدا ہوئے ہوں یا کسی دارا لکفر سے ہجرت کر کے آئے ہوں۔[1] دارالاسلام کے یکساں شہری اور ایک دوسرے کے ولی (حامی و مددگار) ہیں۔

ان مسلم شہریوں پر اسلام نے اپنے پورے نظام کے اٹھانے کی ذمہ داری ڈالی ہے' کیونکہ وہی اصولاً" اس نظام کو حق مانتے ہیں۔ ان پر وہ اپنا پورا قانون نافذ کرتا ہے۔ ان کو اپنے تمام مذہبی' اخلاقی' تمدنی اور سیاسی احکام کا پابند کرتا ہے۔ ان سے

---

[1] ہجرت کر کے آنے والوں کے معاملے میں ایک احتیاطی تدبیر قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ان کو "امتحان" (Examine) کر لیا جائے (ملاحظہ ہو سورہ ممتحنہ رکوع ۲) یہ تدبیر اگرچہ مہاجر عورتوں کے معاملے میں بیان کی گئی ہے' لیکن اس سے ایک عام اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے ایک مدعی ہجرت کو دارالاسلام میں قبول کرنے سے پہلے اس کے واقعی مسلم اور مہاجر ہونے کا اطمینان کر لیا جائے تاکہ ہجرت کے بہانے کچھ دوسری نیت رکھنے والے لوگ نہ گھس آئیں۔ اگرچہ کسی شخص کے حقیقی ایمان کا حال سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ظاہری تحقیقات سے جہاں تک جانچ پڑتال کی جا سکتی ہو کر لینی چاہئے۔

ذمے اپنے سارے واجبات و فرائض عائد کرتا ہے۔ ان سے اپنی ریاست کی مدافعت کے لئے ہر قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور پھر انہی کو یہ حق بھی دیتا ہے کہ اس ریاست کے اولی الامر کا انتخاب کریں' اس کو چلانے والی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) میں شریک ہوں' اور اس کے کلیدی مناصب پر مقرر کیے جائیں تاکہ اس اصولی ریاست کی پالیسی ٹھیک اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق چل سکے۔ اس قاعدے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں ایک مثال بھی اس امر کی نہیں مل سکتی کہ کسی ذمی کو مجلس شوریٰ کا رکن' یا کسی علاقے کا گورنر یا کہیں کا قاضی یا کسی شعبہ حکومت کا وزیر یا ناظم یا فوج کا کمانڈر بنایا گیا ہو یا خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا ہو۔ حالانکہ ذمی خود نبی اکرم ﷺ کے عہد میں موجود تھے اور خلافت راشدہ کے دور میں تو ان کی آبادی کروڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ اگر فی الواقع ان امور میں حصہ لینا ان کا حق ہوتا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اللہ کا نبی ان کی حق تلفی کیسے کر سکتا تھا اور نبی کے براہ راست تربیت یافتہ لوگ مسلسل ۳۰ برس اس حق کو ادا کرنے سے کس طرح باز رہ سکتے تھے۔

۲۔ ذمی شہریوں سے مراد وہ تمام غیر مسلم ہیں جو اسلامی ریاست کے حدود میں رہ کر اس کی اطاعت و وفاداری کا اقرار کریں' قطع نظر اس سے کہ وہ دارالاسلام میں پیدا ہوئے ہوں یا باہر سے آ کر ذمی بننے کی درخواست کریں۔ اس طرح کے شہریوں کو اسلام ان کے مذہب اور کلچر اور پرسنل لاء کے تحفظ اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے' ان پر صرف اپنے ملکی قوانین نافذ کرتا ہے' ان کو ملکی قوانین میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے حقوق دیتا ہے' ان کے لئے کلیدی مناصب کے سوا ہر قسم کی ملازمتوں کے دروازے کھلے رکھتا ہے' ان کو شہری آزادیوں میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک کرتا ہے' ان کے ساتھ معاشی معاملات میں مسلمانوں سے الگ کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھتا اور مملکت کے دفاع کی ذمہ داری سے انہیں مستثنیٰ کر کے اس کا پورا بار صرف مسلمانوں پر ڈالتا ہے۔

ان دو قسم کی شہریتوں پر اور ان کی الگ الگ حیثیتوں پر اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ پہلے اس سلوک پر ایک نگاہ ڈال لے جو دنیا کی دوسری اصولی ریاستیں اپنے اصول کے نہ ماننے والوں سے اور قومی ریاستیں اپنے حدود میں رہنے والی قومی اقلیتوں سے کر رہی ہیں درحقیقت یہ بات پورے چیلنج کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک ریاست کے اندر اس کی بنیادوں سے مختلف بنیاد وجود رکھنے والوں کی موجودگی جو پیچیدگی پیدا کرتی ہے اس کو اسلام سے زیادہ انصاف' رواداری اور فیاضی کے ساتھ کسی دوسرے نظام نے حل نہیں کیا ہے۔ دوسروں نے اس پیچیدگی کو زیادہ تر دو ہی طریقوں سے حل کیا ہے یا تو انہیں مٹا دینے کی کوشش کی ہے یا شودر بنا کر رکھا ہے۔ اسلام اس کے بجائے یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ انصاف کے ساتھ اپنے اصول کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک حد قائم کر دیتا ہے۔ جو ماننے والے ہیں ان کو پوری طرح اپنے اصولوں کا پابند کرتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری ان پر ڈال دیتا ہے اور جو ان اصولوں کو قبول نہیں کرتے ان کو صرف اسی حد تک پابند کرتا ہے جو ملک کے نظم کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے اور انہیں ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری سے سبکدوش کرنے کے بعد ان کے تمام تمدنی اور انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔

---

(۸)

حقوق شہریت

اس کے بعد مجھے بتانا ہے کہ اسلام میں شہریوں کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کیا قرار دیئے گئے ہیں۔

شہریوں کا اولین حق اسلام میں یہ ہے کہ ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے اور جائز قانونی وجوہ کے سوا اور کسی وجہ سے ان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔ اس چیز کو نبی اکرم ﷺ نے بکثرت احادیث میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے حجتہ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنا وہ مشہور خطبہ دیا تھا جس میں اسلامی نظام زندگی کے قواعد بیان فرمائے تھے۔ اس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

انا دمائکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا۔

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسی حج کے اس دن کی حرمت ہے۔

اس حرمت میں استثناء صرف ایک ہے اور اسے نبی اکرم ﷺ ایک اور حدیث میں الا بحق الاسلام کے الفاظ سے ادا فرماتے ہیں، یعنی اسلام کے قانون کی رو سے اگر کسی شخص پر جان یا مال یا آبرو کا کوئی حق واجب ہوتا ہو تو وہ اس سے قانون کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق وصول کیا جائے گا۔

دوسرا اہم حق شخصی آزادی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں کسی شخص کی آزادی معروف قانونی طریقے پر اس کا جرم ثابت کیے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب نہیں کی جا سکتی۔ ابوداؤد میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ مدینے میں کچھ لوگ

شبہ کی بناء پر گرفتار کیے گئے تھے۔ ایک صحابی نے عین خطبہ کے دوران میں اٹھ کر نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ میرے ہمسایوں کو کس قصور میں پکڑا گیا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے دو مرتبہ ان کے اس سوال کو سن کر سکوت فرمایا تاکہ کوتوال شہر اگر گرفتاری کے لئے کوئی معقول وجوہ رکھتا ہے تو اٹھ کر بیان کرے۔ لیکن جب تیسری مرتبہ ان صحابی نے اپنے سوال کا اعادہ کیا اور کوتوال نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو آپ ﷺ نے حکم صادر فرمایا کہ خلوا له جیرانه [1] (اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک کسی شخص پر ایک متعین الزام لگا کر اس کو ثابت نہ کر دیا جائے اسے قید نہیں کیا جا سکتا۔ امام خطابی اپنی معالم السنن میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام میں حبس دو ہی قسم کا ہے۔ ایک حبس عقوبت' یعنی یہ کہ عدالت سے سزا پا کر کوئی شخص قید کیا جائے' دوسرے حبس استظہار' یعنی ملزم کو بغرض تفتیش روک رکھنا۔ اس کے سوا حبس کی کوئی صورت اسلام میں نہیں ہے۔ [2] یہی بات امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب الخراج میں لکھی ہے کہ "کسی شخص کو محض تہمت کی بنا پر قید نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو مجرد الزام پر قید نہیں کر دیا کرتے تھے۔ ضروری ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ عدالت میں حاضر ہوں مدعی اپنا ثبوت پیش کرے اور اگر وہ اپنا الزام ثابت نہ کر سکے تو مدعا علیہ کو چھوڑ دیا جائے۔" [3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل۔ [4]

تیسرا اہم حق رائے اور مسلک کی آزادی کا ہے۔ اس باب میں اسلامی قانون

---

[1] ابو داؤد۔ کتاب القضاء۔

[2] معالم السنن' کتاب القضاء۔

[3] کتاب الخراج صفحہ ۱۰۷۔

[4] موطا' باب شرط الشاہد۔

کی سب سے بہتر وضاحت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ ان کے زمانے میں خوارج کا گروہ پیدا ہوا تھا جو آج کل کے انارکسٹ اور نہلسٹ (Nehilist) گروہوں سے ملتا جلتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وہ اعلانیہ اسٹیٹ کے وجود کی نفی کرتے تھے اور بزور شمشیر اس کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو پیغام بھیجا:

کونوا حیث شئتم و بیننا و بینکم ان لا تسفکوا دما ولا تقطعوا سبیلا ولا تظلموا احدا۔ (نیل الاوطار۔ ج ۷۔ ص ۱۳۹)

تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو۔ اور ظلم سے باز رہو۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو پیغام دیا کہ:

لا نبدؤکم بقتال مالم تحدثوا فسادا۔

(نیل الاوطار۔ ج ۷۔ ص ۱۳۳)

جب تک تم فساد نہ کرو گے ہم تمہارے خلاف لڑائی کی ابتداء نہ کریں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی گروہ خیالات جو چاہے رکھے اور پر امن طریقے سے جس طرح چاہے اپنے خیالات کا اظہار کرے' اسلامی مملکت اس کو نہ روکے گی' البتہ اگر وہ اپنے خیالات زبردستی (By violent Means) مسلط کرنے اور نظام ملکی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

ایک اور حق جس پر اسلام میں بہت زور دیا گیا ہے یہ ہے کہ اسٹیٹ اپنے حدود میں کسی شہری کو زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے دے۔ اسی غرض کے لئے اسلام میں زکوۃ فرض کی گئی ہے جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ:

توخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم (بخاری و مسلم)

ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

پھر ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ:

السلطان ولی من لا ولی لہ۔

حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔

اور ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

من ترک کلا فالینا۔ (بخاری و مسلم)

جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔

اس معاملے میں اسلام نے ذمی شہریوں اور مسلم شہریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ وہ مسلمان کی طرح ذمی کو بھی اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ اسٹیٹ اس کو بھوکا' ننگا اور بے ٹھکانا نہ رہنے دے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً اس کا جزیہ معاف کر کے اس کا وظیفہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا:

واللہ ما انصفناہ ان اکلنا شبیبتہ ثم نخذلہ عند الھرم

(کتاب الخراج لابی یوسف۔ ص ۷۲)

خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہ کیا اگر جوانی میں اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حیرہ کے غیر مسلموں کو جو وثیقہ لکھ کر دیا تھا اس میں یہ صراحت تھی کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔ (کتاب الخراج۔ ص ۸۵)

(۹)

شہریوں پر حکومت کے حقوق

ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں پر ریاست کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سے پہلا حق اطاعت کا ہے جس کے لئے اسلام میں سمع و طاعت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق یہ صراحت فرمائی ہے کہ السمع والطاعة فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ۔ (سننا اور ماننا پڑے گا' تنگی اور فراخی اور خوشگواری اور ناخوشگواری میں) یعنی خواہ کوئی حکم آدمی کو گوارا ہو یا ناگوار اور خواہ کوئی شخص اس کو بآسانی بجا لا سکے یا دشواری سے' بہرحال اسے اطاعت کرنی پڑے گی۔

اسلامی حکومت کا دوسرا اہم حق اس کے شہریوں پر یہ ہے کہ وہ اس کے وفادار اور خیر خواہ رہیں۔ قرآن اور حدیث میں اس کے لئے نصح کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جس کا مفہوم عربی زبان میں (Loyalty) اور (Allegiance) سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک آدمی سچے دل سے اپنی حکومت کی بھلائی چاہے۔ اس کو نقصان پہنچانے والی کسی چیز کو گوارا نہ کرے اور اس کی فلاح و بہبود سے قلبی وابستگی رکھے۔

یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اسلام میں شہریوں پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے ساتھ پورا تعاون کریں اور اس کے لئے کسی جانی و مالی قربانی میں دریغ نہ کریں۔ حتیٰ کہ اگر دارالاسلام کو کوئی خطرہ پیش آ جائے تو قرآن مجید صاف الفاظ میں اس شخص کو منافق قرار دیتا ہے جو قدرت رکھنے کے باوجود دارالاسلام کی مدافعت میں جان و مال کی قربانی سے دریغ کرے۔

حضرات ! یہ ہیں اس حکومت کے خدوخال جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے

ہیں۔ اس طرز کی حکومت کو آپ موجودہ زمانے کی اصطلاحوں میں سے جس نام سے چاہیں یاد کریں۔ آپ کا جی چاہے اسے سیکولر کہئے' ڈیموکریٹک کہئے یا تھیوکریٹک' ہمیں کسی اصطلاح پر اصرار نہیں ہے۔ ہمیں جس چیز پر اصرار ہے وہ صرف یہ ہے کہ جس اسلام کے ماننے کا ہم دعویٰ کرتے ہیں ہمارا نظام زندگی اور نظام حکومت اسی کے بتائے ہوئے اور مقرر کئے ہوئے اصولوں پر قائم ہو۔

باب ۸

اسلامی دستور کی بنیادیں

- حاکمیت الٰہی
- مقام رسالت
- تصور خلافت
- اصول مشاورت
- اصول انتخاب
- عورتوں کے مناصب
- حکومت کا مقصد
- اولی الامر اور اصول اطاعت
- بنیادی حقوق اور اجتماعی عدل
- فلاح عامہ

یہ مقالہ ۱۹۵۲ء کے اواخر میں سپرد قلم کیا گیا تھا۔ اس وقت ایک مشہور وکیل اور صاحب قلم نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن سے کسی دستور کا خاکہ نہیں ملتا۔ اس پر خاصی بحث رہی۔ مولانا مودودی صاحب نے اس زمانے میں یہ مضمون لکھا تھا جس میں دستور کے ایک ایک مسئلہ کو لے کر قرآن و حدیث میں اس کی بنیادوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔

مرتب

اسلامی دستور کی بنیادیں

اس وقت جب کہ ملک کے دستور کی ترتیب آخری مراحل میں ہے' اہل علم کا فرض ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو ایک صحیح اسلامی دستور مرتب کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دیں۔ اس سلسلہ میں اپنی حد استطاعت تک جو کچھ خدمت ہم انجام دے سکتے تھے دیتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۱ء کے آغاز میں تمام مسلم فرقوں کے نمائندہ علماء نے بھی اسلامی ریاست کے ۲۲ بنیادی اصول بالاتفاق مرتب کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔[1] مگر کچھ لوگ برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ایک طرف مسلم عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اور دوسری طرف دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو زیادہ سے زیادہ غلط فہمیوں میں مبتلا کریں۔ چنانچہ ان کی طرف سے بار بار یہ خیال مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے کہ قرآن میں دستور کے لئے کوئی رہنمائی نہیں کی گئی ہے اور اسلام کسی خاص طرز کی حکومت کا تقاضا نہیں کرتا اور "اسلامی دستور" سرے سے کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے۔ ان گمراہ کن باتوں کے پیچھے دلائل کچھ بھی نہیں ہیں' مگر زوال علم کے اس دور میں ذہنی پراگندگی پیدا کرنے کے لئے یہ شور و شغب اچھا خاصا موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک مختصر مضمون میں کتاب و سنت کی ان تمام تصریحات کو جمع کر دیا جائے جو دستوری احکام پر مشتمل ہیں' تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آج تک علماء جن اصولوں کو اسلام کے دستوری اصولوں کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں ان کے اصل ماخذ کیا ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱

اور اس کے ساتھ دستور ساز اسمبلی کے ارکان پر بھی خدا کی حجت تمام ہو جائے اور وہ یہ عذر بھی پیش نہ کر سکیں کہ ہمیں خدا اور رسول ﷺ کے احکام بتائے نہیں گئے تھے۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھا جا رہا ہے۔ اس میں ہم نمبروار ایک ایک دستوری مسئلے سے متعلق آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ درج کریں گے اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے جائیں گے کہ ان سے کیا احکام نکلتے ہیں۔

---

(۱)

حاکمیت الٰہی

ان الحکم الا اللہ ط امر الا تعبدوا الا ایاہ ط ذالک الدین القیم۔

(یوسف : ۴۰)

حکم نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لئے' اس کا فرمان ہے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اس کی' یہی صحیح دین ہے۔

یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اور فرمانروائی کا حق' (بالفاظ دیگر "حاکمیت") اللہ تعالٰی کے لئے خاص ہے۔ یہاں کوئی لفظ یا قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس حاکمیت کو محض "کائناتی حاکمیت" (Universal Sovereignty) کے مفہوم میں مقید کر دیا جائے۔ اللہ کی یہ حاکمیت جس طرح کائناتی ہے اسی طرح سیاسی و قانونی بھی ہے اور اخلاقی و اعتقادی بھی۔ اور خود قرآن مجید میں ان تمام اقسام کی حاکمیتوں کے اللہ تعالٰی کے لئے مخصوص ہونے کی واضح دلیلیں موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن تصریح کرتا ہے کہ اللہ تعالٰی صرف رب الناس اور الہ الناس ہی نہیں ہے بلکہ ملک الناس بھی ہے :

قل اعوذ برب الناس ط ملک الناس الہ الناس۔

(الناس : ۱۔۳)

کہو اے محمد ﷺ کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب' انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی۔

وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالٰی ہی ملک کا مالک ہے اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک

نہیں ہے۔

قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء۔

(آل عمران: ۲۶)

کہو' خدایا' ملک کے مالک' تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

لم یکن لہ شریک فی الملک۔ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

پھر وہ صاف صاف کہتا ہے کہ امر کا حق صرف اللہ کو ہے اس لئے کہ پیدا کرنے والا وہی ہے۔

الا لہ الخلق والامر۔ (الاعراف: ۵۴)

خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ محض کائناتی حاکمیت نہیں بلکہ صریحاً" سیاسی حاکمیت ہے اور اسی بنا پر قرآن قانونی حاکمیت کو بھی اللہ کے لئے مخصوص کرتا ہے۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء۔ (اعراف: ۳)

پیروی کرو اس چیز کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور نہ پیروی کرو اسے چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ (المائدہ: ۴۴)

اور جو لوگ فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں۔

اللہ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا یہ تصور اسلام کے اولین بنیادی اصولوں میں سے ہے اور شروع سے آج تک تمام فقہائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ حکم دینے کا حق اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔ چنانچہ علامہ آمدی اصول فقہ کی مشہور کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لا حاكم سوی اللّٰہ ولا حکم الا ما حکم بہ۔

جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور حکم بس وہ ہے جو اللہ نے دیا ہے۔

اور شیخ محمد خضری اپنی اصول الفقہ میں اس کو جمیع اہل اسلام کا متفقہ عقیدہ قرار دیتے ہیں۔

ان الحکم هو خطاب اللّٰہ' فلا حکم الا اللّٰہ' ومنه قضية اتفق عليها المسلمون قاطبة۔

درحقیقت "حکم" اللہ کے فرمان کو کہتے ہیں۔ پس حکم دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔

پس کوئی اسلامی دستور اس کے بغیر نہیں بن سکتا کہ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا اقرار کیا جائے اور بالفاظ صریح یہ لکھا جائے کہ یہ ریاست اللہ کی مطیع ہے' اس کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتی ہے اور اس کے احکام کو واجب العمل مانتی ہے۔

(۲)

مقام رسالت

انبیاء علیہم السلام بالعموم اور محمد ﷺ بالخصوص اللہ تعالیٰ کی اس سیاسی اور قانونی حاکمیت کے مظہر ہیں۔ یعنی اللہ کی اس حاکمیت کا نفاذ انسانوں میں جس واسطے سے ہوتا ہے وہ واسطہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لئے ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے طریقے کی پیروی اور ان کے فیصلوں کو بے چون وچرا ماننا ہر اس فرد اور گروہ اور قوم کے لئے لازم ہے جو اللہ کی اس حاکمیت کو تسلیم کرے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ۔ (النساء: ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللّٰہ۔ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارک اللّٰہ۔

(النساء: ۱۰۵)

اے محمد ﷺ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی میں حکم کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

وما اتیکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا۔ (الحشر: ۷)

اور جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ۔

فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما۔ (النساء: ٦٥)

پس نہیں' تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اختلاف میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تو فیصلہ دے اس پر اپنے نفس میں کوئی تنگی تک نہ محسوس کریں اور سربسر تسلیم کر لیں۔

یہ ایک اسلامی ریاست کے دستور کی دوسری بنیاد ہے۔ اس میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار کے بعد دوسرا اقرار یہ ہونا چاہئے کہ اس ریاست میں کتاب اللہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سنت ثابتہ کو بھی ماخذ قانون کی حیثیت حاصل ہو گی اور اس کی انتظامیہ' مقننہ اور عدلیہ میں کسی کو بھی سنت کے خلاف احکام دینے' قانون بنانے اور فیصلے کرنے کا اختیار نہ ہو گا۔

---

(۳)

تصور خلافت

وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحت لیستخلفنہم کما استخف الذین من قبلہم (النور: ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں (مومنین صالحین) کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت دو اہم دستوری نکات کی تصریح کرتی ہے اول یہ کہ ایک اسلامی ریاست کا صحیح مقام "خلافت" ہے نہ کہ "حاکمیت"۔ دوم یہ کہ ایک اسلامی ریاست میں خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری امت مسلمہ اس کی حامل ہوتی ہے جسے اللہ نے آزاد ریاست عطا کی ہو۔

پہلے نکتے کی تشریح یہ ہے کہ حاکمیت اپنی عین حقیقت ہی کے اعتبار سے اس امر کی متقاضی ہے کہ صاحب حاکمیت کی اپنی ذات سے خارج کوئی ایسی طاقت نہ ہو جو اس کے اختیارات کو محدود کرتی ہو اور اس کو خود اس کے اپنے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کے سوا کچھ اوپر سے مسلط کئے ہوئے قوانین و ضوابط کا پابند بناتی ہو۔[1] اب اگر ایک ریاست پہلے ہی قدم پر یہ مان لے کہ خدا اور رسول ﷺ کا

---

[1] اس کی تشریح حصہ اول کے مضامین میں گزر چکی ہے۔

حکم اس کے لئے بالاتر قانون کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف نہ اس کی منتظمہ کام کر سکتی ہے' نہ اس کی مقننہ کوئی قانون بنا سکتی ہے اور نہ اس کی عدلیہ کوئی فیصلہ کر سکتی ہے' تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا اور رسول ﷺ کے مقابلے میں حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہو گئی ہے اور اس نے حکمرانی میں دراصل خدا اور رسول ﷺ کے ایجنٹ (خلیفہ) کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس صورت میں اس کے لئے صحیح اصطلاح "حاکمیت" نہیں بلکہ "خلافت" ہی ہو سکتی ہے' ورنہ اس حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے لئے حاکمیت کا لفظ استعمال کرنا محض ایک تناقض فی الاصطلاح ہو گا۔ البتہ اگر وہ اپنی خود مختاری کو خدا کے حکم اور رسول ﷺ کی سنت کے اتباع سے مقید نہ کرے تو بلاشبہ اس کی صحیح پوزیشن "حاکمیت" ہی کی ہو گی' مگر اس صورت میں اس کے لئے "اسلامی ریاست" کی اصطلاح استعمال کرنا تناقض فی الاصطلاح ہو گا۔

دوسرے نکتے کی تشریح یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام مسلم باشندوں کا بحیثیت مجموعی حامل خلافت ہونا وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جمہوریت کی بنا رکھی گئی ہے۔ جس طرح غیر اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی حاکمیت (Popular Sovereignty) کے اصول پر قائم ہوتی ہے' ٹھیک اسی طرح اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی خلافت (Popular Vicegerency) کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس نظام میں حاکمیت کے بجائے خلافت کی اصطلاح اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ یہاں اقتدار خدا کا عطیہ ہے اور اس عطیے کو خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود کے اندر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خلافت کا یہ محدود اقتدار' قرآن کی مذکورہ بالا تصریح کی رو سے' کسی ایک شخص یا طبقے کو نہیں بلکہ ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیث الجماعت سونپا گیا ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے' ان کے مشورے سے کام کرے اور اسی وقت تک حکمران رہے جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں۔ اسی بنا پر

حضرت ابوبکرؓ نے "خلیفۃ اللہ" کہلانے سے انکار کیا تھا کیونکہ خلافت دراصل امت مسلمہ کو سونپی گئی تھی نہ کہ براہ راست ان کو۔ ان کی خلافت کی اصل حیثیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اپنے اختیارات خلافت ان کے سپرد کر دیے تھے۔

ان دونوں نکات کو ملحوظ رکھ کر اسلامی ریاست کا دستور ایسا بنایا جانا چاہیے کہ جو حاکمیت کے دعوے سے خالی ہو اور جس میں صریح طور پر ریاست کی حیثیت خلافت نمایاں نظر آتی ہو۔

---

(۴)

اصول مشاورت

اجتماعی خلافت کے مذکورہ بالا تقاضے کو قرآن ان الفاظ میں واضح طور پر بیان کرتا ہے:

وامرھم شوریٰ بینھم۔ (الشوریٰ: ۳۸)

اور ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔

اس آیت میں اسلامی نظام زندگی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں تمام اجتماعی امور مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ صرف بیان خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اپنے فحوائے کلام کے لحاظ سے حکم بھی ہے اور اسی بنا پر کسی اجتماعی کام کو مشورے کے بغیر انجام دینا ممنوع ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

قلت یا رسول اللہ الامر ینزل بنا بعدک لم ینزل فیه قرآن ولم یسمع منک فیه شیء، قال اجمعوا العابد من امتی واجعلوه بینکم شوریٰ ولا تقضوا برای واحد۔ (روح المعانی)

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آ جائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو؟ فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو[1]

---

[1] یعنی ایسے لوگوں کو جو اللہ کی بندگی کرنے والے ہوں، اس کے مقابلے میں خود مختاری و بغاوت کا رویہ اختیار کرنے والے نہ ہوں۔

اور اسے آپس کے مشورے کیلئے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

پھر اس شوریٰ کی اصل روح کو نبی اکرم ﷺ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

من اشار علی اخیه بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانه۔ (ابوداؤد)

جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے متعلق وہ خود جانتا ہو کہ صحیح بات دوسری ہے' تو اس نے دراصل اس کے ساتھ خیانت کی۔

یہ حکم نہایت وسیع الفاظ میں ہے اور اس میں شوریٰ کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ہیں۔ اگر شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوریٰ براہ راست تمام لوگوں سے ہو یا لوگوں کے نمائندوں سے؟ نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے؟ انتخاب مملکت گیر ہو یا صرف صدر مقام میں؟ انتخاب الیکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لے لئے جائیں جن کی نمائندہ حیثیت معلوم و معروف ہو؟ مجلس شوریٰ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لئے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لئے ہو سکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس لئے شریعت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کسی خاص شکل کا تعین کیا ہے اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع ہی قرار دیا ہے۔ البتہ اصولاً" اوپر کی آیت اور اس کی توضیح کرنے والی احادیث میں تین باتیں لازم کر دی گئی ہیں:

۱۔ مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہیے۔ یہ چیز ملوکیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس لئے کہ حکومت کے معاملات میں سب سے اہم معاملہ تو خود رئیس حکومت کا تقرر ہے۔ اگر دوسرے معاملات میں مشورہ لازم ہے

تو رئیس حکومت کا زبردستی مسلط ہو جانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز ڈکٹیٹر شپ کو بھی ممنوع ٹھہراتی ہے' کیونکہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی استبداد کے ہیں اور استبداد شوریٰ کی ضد ہے۔ اسی طرح دستور کو عارضی یا مستقل طور پر معطل کرنے کے اختیارات بھی اس حکم کی موجودگی میں رئیس مملکت کو نہیں دیئے جا سکتے' کیونکہ تعطل کے دور میں لا محالہ وہ استبداد سے کام کرے گا اور استبداد ممنوع ہے۔

۲۔ معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہئے' خواہ وہ براہ راست شریک ہوں یا اپنے معتمد علیہ نمائندوں کے واسطے سے شریک ہوں۔

۳۔ مشورہ آزادانہ اور بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہئے۔ دباؤ اور لالچ کے تحت ووٹ یا مشورہ لینا دراصل مشورہ نہ لینے کا ہم معنی ہے۔

پس دستور کی تفصیلات خواہ کچھ ہوں' اس میں شریعت کے یہ تینوں اصول بہرحال ملحوظ رہنے چاہئیں۔ اس میں ایسی کوئی گنجائش نہ رکھی جانی چاہئے کہ کسی وقت بھی عوام سے یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں سے مشورہ لئے بغیر حکومت کی جانے لگے۔ اس میں انتخابات کا ایسا نظام تجویز کیا جانا چاہئے جس سے پوری قوم شریک مشورہ ہو سکے اور اس میں ان اسباب کا سدباب ہونا چاہئے جن کے زیر اثر عوام سے یا ان کے نمائندوں سے خوف یا لالچ یا فریب کے تحت رائے لینا ممکن ہو۔

---

(۵)

اصول انتخاب

رئیس حکومت، وزراء، اہل شوریٰ اور حکام کے انتخاب میں کیا امور ملحوظ رہنے چاہئیں، اس باب میں قرآن و سنت کی ہدایات یہ ہیں:

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا۔ (النساء: ۵۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی اعتماد کی ذمہ داریاں) اہل امانت (یعنی امین لوگوں) کے سپرد کرو۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (الحجرات: ۱۳)

درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم و یصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم و یلعنونکم۔ (رواہ مسلم)

تمہارے بہترین سردار وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور جن کو تم دعا دو اور وہ تمہیں دعا دیں اور تمہارے بدترین سردار وہ ہیں۔ جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔

انا واللہ لا نولی علی عملنا ھذا احدا سالہ او حرص علیہ (متفق علیہ)

خدا کی قسم ہم اپنی اس حکومت کے کسی کام پر کسی ایسے شخص کو مقرر

نہیں کرتے جو اس کی درخواست کرے یا اس کا حریص ہو۔

ان اخونکم عندنا من طلبہ ۔ (ابوداؤد)

ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس کا خود طالب ہو۔

حدیث سے گزر کر یہ بات تاریخ کے صفحات پر بھی ثبت ہو چکی ہے کہ اسلام میں عہدوں کی طلب سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ چنانچہ قلقشندی اپنی کتاب صبح الاعشیٰ میں بیان کرتا ہے:

وقد اثر عن ابی بکر انه قال سالت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن هذا الامر فقال لی یا ابابکر هو لمن یرغب عنه لا لمن یجاحش علیه ولمن یتضائل عنه لا لمن یتنفج الیه هو لمن یقال هولک لا لمن یقول هولی۔ (صبح الاعشیٰ للقلقشندی۔ ج ۱۔ ص ۲۴۰)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ماثور ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امارت کے بارے میں دریافت کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اے ابوبکر وہ اس کے لئے ہے جو اس سے بے رغبت ہو نہ کہ اس کے لئے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو۔ وہ اس کے لئے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے نہ کہ اس کے لئے جو اس پر جھپٹے۔ وہ اس کے لئے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تیرا حق ہے نہ کہ اس کے لئے جو خود کہے کہ یہ میرا حق ہے۔[1]

---

[1] یہ اثر اگرچہ کسی حدیث کی کتاب میں ہمیں ان الفاظ میں نہیں ملا ہے' بلکہ یہ ایک مورخ کا بیان ہے' لیکن ہم نے اس بنا پر اسے نقل کر دیا ہے کہ حدیث کی دو مستند روایتیں اسی معنی میں اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔ اس طرح کی کمزور روایتیں معنی کے اعتبار سے قوی ہو جاتی ہیں جب کہ ان کی تائید میں صحیح روایات موجود ہوں۔

یہ ہدایات اگرچہ محض اصولی ہدایات ہیں' ان میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ مطلوبہ صفات کے سرداروں اور نمائندوں کو منتخب کرنے اوز ناپسندیدہ لوگوں کو روکنے کے لئے مشینری کیا ہو' لیکن بہرحال یہ وقت کے دستور سازوں کا کام ہے کہ ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مناسب عملی تدابیر تجویز کریں۔ انہیں انتخاب کا ایسا نظام سوچنا چاہئے جس سے امین اور متقی اور عوام کے محبوب اور خیر خواہ لوگ منتخب ہوں اور وہ لوگ نہ ابھر سکیں جو عوام کے ووٹ لے کر بھی عوام کے مبغوض ہوتے ہیں' جن پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوتی ہے' جن کے حق میں لوگ بددعا کرتے ہیں اور جنہیں عہدے پیش نہیں کئے جاتے بلکہ وہ خود عہدوں پر جھپٹتے ہیں۔

---

(۶)

عورتوں کے مناصب

الرجال قوامون علی النساء۔ (النساء: ۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ۔ (بخاری)

وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جو اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کرے۔

یہ دونوں نصوص اس باب میں قاطع ہیں کہ مملکت میں ذمہ داری کے مناصب (خواہ وہ صدارت ہو یا وزارت یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا مختلف محکموں کی ادارت) عورتوں کے سپرد نہیں کیے جا سکتے۔ اس لئے کسی اسلامی ریاست کے دستور میں عورتوں کو یہ پوزیشن دینا' یا اس کے لئے گنجائش رکھنا نصوص صریحہ کے خلاف ہے اور اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی پابندی قبول کرنے والی ریاست اس خلاف ورزی کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔[1]

---

[1] اس مسئلے کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو باب ۱۱

(۷)

حکومت کا مقصد

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ (الحج:۴۱)

(یہ مسلمان وہ لوگ ہیں) جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں' زکوۃ دیں گے' نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اس آیت میں اسلامی حکومت کے مقصد وجود اور اس کے بنیادی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔ کافر حکومتوں کی طرح اس کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے اندرونی امن اور خارجی سرحدوں کی حفاظت کرے اور ملک کی مادی خوشحالی کے لئے ساعی ہو' بلکہ ایک اسلامی حکومت ہونے کی حیثیت سے اس کا اولین فریضہ یہ ہے کہ نماز اور زکوۃ کا نظام قائم کرے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں خدا اور رسول بھلائی قرار دیتے ہیں اور ان برائیوں کو روکے جسے خدا اور رسول برائی کہتے ہیں۔ کوئی ایسی حکومت اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جو اس بات سے بے پرواہ ہو کہ نماز قائم ہو رہی ہے یا نہیں' زکوۃ دی جا رہی ہے یا نہیں' بھلائیاں پھیل رہی ہیں یا مٹ رہی ہیں اور برائیاں دب رہی ہیں یا ابھر رہی ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس کے حدود میں زنا اور شراب اور قمار بازی اور فحش لٹریچر اور فحش تماشوں اور فحش گانوں اور مخلوط تعلیم اور تبرج جاہلیت اور اختلاط مرد و زن کا عام رواج ہو اور ان صریح منکرات پر کوئی

قدغن نہ ہوتے ہی ایک اسلامی دستور میں لازما" ریاست کو ان فرائض کا پابند ہونا چاہیے جنہیں قرآن اس کے بنیادی فرائض میں شمار کرتا ہے۔

(۸)

اولی الامر اور اصول اطاعت

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر' ذالک خیر و احسن تاویلا۔ (النساء: ۵۹)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان نزاع ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پھیرو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ یہ بہتر ہے اور بلحاظ انجام بھی اچھا ہے۔

اس آیت میں تین نہایت اہم بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں جن میں سے ایک کا گہرا تعلق دستوری مسائل سے ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت وہ اصل اطاعت ہے جس کا ہر مسلمان فرد کو بحیثیت فرد اور مسلمان قوم کو بحیثیت قوم پابند ہونا چاہئے۔ یہ اطاعت ہر دوسری اطاعت پر مقدم ہے۔ اولی الامر کی اطاعت اس کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے' اور اس کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اس نکتے کی مزید وضاحت حسب ذیل آیات اور احادیث میں ہم کو ملتی ہے:

ما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم و من یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔

(الاحزاب: ۳۶)

کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب کسی معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر ان کے لئے خود اپنے اس معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الکافرون .... فاولئک ھم الظالمون...... فاولئک ھم الفاسقون۔ (المائدہ: ۴۴۔۴۵۔۴۷)

اور جو فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں........ وہی ظالم ہیں........ وہی فاسق ہیں۔

السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ ما لم یومر بمعصیۃ فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ (بخاری و مسلم)

ایک مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ برضا و رغبت کرے یا بکراہت' تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے' پھر جب اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

ان امر علیکم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللّٰہ فاسمعوا واطیعوا۔

(مسلم)

اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

لا طاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف۔ (بخاری و مسلم)

معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔

لا طاعۃ لمن عصی اللّٰہ (طبرانی)

کوئی اطاعت اس شخص کے لئے نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہو۔

لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ (شرح السنۃ)

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔

کتاب و سنت کے یہ تمام محکمات اس باب میں ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست میں مجلس قانون ساز کوئی ایسا قانون بنانے کا حق نہیں رکھتی جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف ہو اور اگر وہ ایسا کوئی قانون بنا دے تو وہ رد کر دیئے جانے کا لائق ہے نہ کہ نافذ ہونے کے لائق۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتوں میں اللہ اور رسول کا قانون لازماً" نافذ ہونا چاہیئے اور جو بات کتاب و سنت کی دلیل سے حق ثابت کر دی جائے اسے کوئی جج اس بنا پر رد نہیں کر سکتا کہ لیجسلیچر کا بنایا ہوا قانون اس کے خلاف ہے۔ تصادم کی صورت میں اللہ اور رسول ﷺ کا قانون نہیں بلکہ لیجسلیچر کا قانون حدود دستور سے خارج قرار پانا چاہیئے۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ کو ایسا کوئی حکم دینے یا ضابطہ بنانے کا حق نہیں ہے جس سے خدا اور رسولؐ کی معصیت لازم آتی ہو۔ اگر وہ ایسا کوئی حکم دے اور لوگ اس کی اطاعت نہ کریں تو وہ مجرم نہیں ہوں گے' بلکہ اس کے برعکس' خود حکومت زیادتی کی مرتکب ہو گی۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اولی الامر مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کی دو دلیلیں تو خود اس آیت ہی میں موجود ہیں۔ اول یہ کہ یاایھا الذین امنوا کہہ کر اولی الامر منکم فرمانے کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ جن اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے وہ مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ دوم یہ کہ نزاع کی صورت میں متنازعہ فیہ معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف پھیرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ رعایا اور حکومت کی نزاع میں اللہ اور رسولؐ کو حکم صرف مسلمان اولی الامر ہی مان سکتے ہیں نہ کہ کافر اولی الامر۔ مزید برآں مستند احادیث کی تصریحات بھی اسی کی تائید بلکہ تاکید کرتی ہیں۔ چنانچہ ابھی اوپر نبی اکرم ﷺ کے یہ ارشادات نقل ہو چکے ہیں کہ "اگر ایک نکٹا غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت

کرو۔" اور یہ کہ "کوئی اطاعت اس شخص کے لئے نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہو۔" ایک اور حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت روایات کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ۔

لن لا ننازع الامر اھلہ الاان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔
(بخاری و مسلم)

ہم اپنے حکمرانوں سے جھگڑا نہ کریں گے الا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھیں جو ہمارے پاس ان کے خلاف اللہ کی طرف سے ایک دلیل ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ سے برے حاکموں کے خلاف بغاوت کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:

لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ۔ (مسلم)

نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے صاحب امر بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک اشتراکی ریاست میں منکرین اشتراکیت اور ایک جمہوری ریاست میں مخالفین جمہوریت کے لئے اولی الامر بننے کا نہ عقلاً کوئی موقع ہے نہ عملاً۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے مسلمان اپنے اولی الامر سے نزاع کا حق رکھتے ہیں اور نزاع کی صورت میں فیصلہ جس چیز پر چھوڑا جائے گا وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہوگی۔ یہ آخری سند جس کے حق میں بھی فیصلہ دے اسے ماننا پڑے گا خواہ فیصلہ اولی الامر کے حق میں ہو یا رعایا کے حق میں۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ اس حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لئے کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہئے جس کے پاس نزاع لے جائی جائے اور جس کا کام یہ ہو کہ کتاب اللہ و سنت رسول

اللہ کے مطابق اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ یہ ادارہ خواہ کوئی مجلس علماء ہو یا سپریم کورٹ یا کوئی اور، اس کے تعین کی کسی خاص شکل پر شریعت نے ہمیں مجبور نہیں کر دیا ہے۔ مگر بہرحال ایسا کوئی ادارہ مملکت میں ہونا چاہیے اور اس کو یہ حیثیت حاصل ہونی چاہیے کہ انتظامیہ اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام اور فیصلوں کے خلاف اس کے پاس مرافعہ کیا جا سکے اور اس کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ کتاب و سنت کی ہدایات کے مطابق وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔

---

(۹)

بنیادی حقوق اور اجتماعی عدل

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ (النساء: ۵۸)

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم (یا فیصلہ) کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔

(المائدہ: ۸)

اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو' یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

یہ آیات اگرچہ وسیع ترین مفہوم میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر عدل کا پابند بناتی ہیں' مگر ظاہر ہے کہ ان کے اس تقاضے سے اسلامی ریاست آزاد نہیں ہو سکتی۔ لامحالہ اس کو بھی عدل ہی کا پابند ہونا چاہیے۔ بلکہ اسے تو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے' کیونکہ حکم بین الناس کا سب سے زیادہ طاقت ور ادارہ وہی ہے اور اگر اس کے حکم میں عدل نہ ہو تو پھر معاشرے میں اور کہیں عدل نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھئے کہ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے' نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کی سنت سے حکم بین الناس میں عدل برتنے کا کیا طریقہ ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ حجتہ الوداع کے مشہور خطبے میں نبی اکرم ﷺ نے اسلامی ریاست کے جن بنیادی اصولوں کا اعلان فرمایا تھا ان میں ایک اہم اصول یہ بھی تھا۔

فان دمائکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمة یومکم ھذا۔

یقیناً تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی محترم ہیں جیسا آج حج کا یہ دن محترم ہے۔

اس اعلان میں مملکت اسلامیہ کے تمام شہریوں کو جان' مال اور آبرو کی حرمت کا بنیادی حق عطا کیا گیا ہے جس کا بہرحال ہر اس ریاست کو التزام کرنا ہو گا جو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم ہو۔[1]

۲۔ یہ حرمت کس حال میں کس طرح ٹوٹ سکتی ہے؟ اس کا تعین نبی اکرم ﷺ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دمائھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔ (بخاری و مسلم)

پھر جب لوگ یہ کام (یعنی شہادت توحید و رسالت اور اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ) کر دیں تو وہ اپنی جانیں مجھ سے بچالیں گے' الا یہ کہ اسلام کے کسی حق کی بنا پر وہ مجرم ہوں اور ان کی نیتوں کا حساب لینا اللہ کے ذمے ہے۔

فقد حرمت علینا دماؤھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ۔ (بخاری و مسلم)

پس ان کی جان و مال ہم پر حرام ہیں الا یہ کہ جان و مال ہی کا کوئی حق ان پر قائم ہو۔ اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

---

[1] اگرچہ اس حدیث میں صرف مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا ذکر ہے لیکن اسلامی شریعت کا یہ مسلم اصول ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی ریاست کی حفاظت میں رہنا قبول کر لیں ان کو دیوانی اور فوجداری قانون کی نگاہ میں وہی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

فمن قالها فقد عصم منی ماله و نفسه الا بحقه و حسابه علی اللّٰہ

(بخاری)

پھر جو اس کا (یعنی کلمہ توحید کا) قائل ہو جائے اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنا نفس بچا لیا الا یہ کہ اللہ کا کوئی حق اس پر قائم ہو اور اس کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

یہ احادیث اس باب میں ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست میں کسی شہری کی آزادی نفس اور حرمت جان و مال و آبرو پر کوئی دست درازی نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسلامی قانون کی رو سے اس پر (یا اس کے خلاف) کوئی حق ثابت نہ کر دیا جائے۔

۳۔ کسی پر (یا کسی کے خلاف) حق کا اثبات کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کو نبی اکرم ﷺ یوں بیان فرماتے ہیں:

اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض بینھما حتی تسمع من الاخر کما سمعت من الاول۔ (ابو داؤد۔ ترمذی۔ احمد)

جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر بیٹھیں تو ان کا فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے جس طرح پہلے کی سنی ہے۔

اور حضرت عمرؓ ایک مقدمے کے فیصلے میں تصریح کرتے ہیں:

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدل۔ (موطا)

اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔

اس مقدمے کی جو تفصیل موطا میں دی گئی ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے نو مفتوح علاقے میں جھوٹی چغلیاں کھا کھا کر لوگ دوسروں کو پکڑوا رہے تھے۔ اس کی شکایت جب حضرت عمرؓ کے پاس لائی گئی تو آپ نے اس کے فیصلے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عدل سے مراد "معروف عدالتی کاروائی" (Due Process of Law) ہے یعنی ایک آدمی کا جرم کھلی عدالت میں ثابت کیا جائے اور اسے صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔

اس کے بغیر اسلام میں کوئی شخص قید نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ حضرت علی ؓ کے زمانے میں جب خوارج کا ظہور ہوا' جو سرے سے ریاست ہی کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے' تو آپ نے انھیں لکھا کہ :

کونوا حیث شئتم و بیننا و بینکم الا تسفکوا دما ولا تقطعوا سبیلا ولا تظلموا احدا فان فعلتم نبذت الیکم الحرب۔ (نیل الاوطار)

تم جہاں چاہو رہو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون نہ بہاؤ اور بدامنی نہ پھیلاؤ اور کسی پر ظلم نہ کرو۔ اگر ان کاموں میں سے کوئی کام تم نے کیا تو میں تمہارے خلاف جنگ کروں گا۔

یعنی خیالات تم جو چاہو رکھو۔ تمہارے خیال اور نیت پر گرفت نہ کی جائے گی۔ البتہ اگر تم اپنے خیالات کے مطابق حکومت کا تختہ زبردستی الٹ دینے کی کوشش کرو گے تو یقیناً" تمہارے خلاف کاروائی کی جائے گی۔

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اسلامی تصور عدل کسی حال میں بھی انتظامیہ کو یہ اختیارات دینے کا روادار نہیں ہے کہ وہ معروف عدالتی کاروائی کے بغیریوں ہی جس کو چاہیں پکڑیں' جسے چاہیں قید کر دیں' جسے چاہیں خارج البلد کریں' جس کی چاہیں زبان بندی کریں اور جسے چاہیں اظہار رائے کے وسائل سے محروم کر دیں۔ اس طرح کے اختیارات جو ریاست اپنی انتظامیہ کو دیتی ہو وہ اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہو سکتی۔

پھر حکم بین الناس میں عدل برتنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہم کو اسلام کی مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں صدر ریاست اور گورنروں اور اعلیٰ حکام اور عامتہ الناس' سب کے لئے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت ہے۔ کسی کے لئے کوئی قانونی امتیاز نہیں ہے' کسی کے لئے خاص عدالتیں نہیں ہیں اور کوئی قانون کی پکڑ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے آخر وقت میں خود اپنے آپ کو پیش کیا کہ جس کو میرے خلاف کوئی دعویٰ ہو وہ لائے

اور اپنا حق وصول کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک والی ریاست' جبلہ بن ایہم غسانی سے ایک بدوی کو قصاص دلوایا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے گورنروں کے لئے قانونی تحفظ کا مطالبہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا اور عام لوگوں کو یہ حق دیا کہ جس حاکم کے خلاف انہیں شکایت ہو اسے کھلی عدالت میں لائیں۔

(۱۰)

فلاح عامہ

وفی اموالہم حق للسائل والمحروم (الذاریات: ۱۹)

ان کے مالوں میں حق تھا مدد مانگنے والے کے لئے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لئے۔

خذمن اموالہم صدقة تطہرہم وتزکیہم بہا وصل علیہم۔

(التوبہ: ۱۰۳)

ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کر کے ان کو (بری صفات سے) پاک کرو اور ان کو (اچھی صفات میں) بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔

ان اللہ قد فرض علیہم صدقة توخذ من اغنیائہم فترد علی فقرائہم۔

(بخاری و مسلم)

اللہ نے مسلمانوں پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے حاجت مندوں پر لوٹا دیا جائے گا۔

السلطان ولی من لاولی لہ۔

(ابوداؤد۔ ترمذی۔ مسند احمد۔ ابن ماجہ۔ دارمی)

حکومت اس کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔

من مات و علیہ دین ولم یترک وفاء فعلی قضائہ و من ترک مالا فلورثتہ۔

جو شخص مرجائے اور اس کے ذمے قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے ذمے ہے اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔

وفی روایۃ من ترک دینا او ضیاعا فلیاتنی فانا مولاہ۔

ایک دوسری روایت میں ہے جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پس ماندگان چھوڑ جائے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئیں' میں ان کا سرپرست ہوں۔

وفی روایۃ من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلا فالینا۔

(بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے ذمے) ہے۔

انا وارث من لا وارث لہ اعقل عنہ وارثہ۔ (ابوداؤد)

جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا میں وارث ہوں۔ اس کی طرف سے دیت ادا کروں گا اور اس کی میراث لوں گا۔

یہ آیات اور احادیث تصریح کرتی ہیں کہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فرض زکوٰۃ کی تنظیم ہے اور اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر تمام ان لوگوں کی کفیل بنے جو مدد کے محتاج ہوں اور وسائل رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے دستوری احکام جو ہم کو کتاب و سنت میں ملتے ہیں۔ اگرچہ دستوری مسائل کے متعلق قرآن اور حدیث میں اور بھی بہت سی ہدایات موجود ہیں' مگر چونکہ ان کا تعلق دستور سے کم اور دستوری قانون سے زیادہ ہے' اس لئے ہم نے ان کو یہاں بیان نہیں کیا ہے۔

اب ہر شخص جو دستور کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو' ہماری پیش کردہ ان آیات اور احادیث کو دیکھ کر خود رائے قائم کرے کہ آیا ان میں ایک اسلامی ریاست کی اصولی بنیادیں صاف صاف بیان کر دی گئی ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی صاحب کھوکھلے دعووں کے بجائے علمی استدلال سے یہ ثابت کر دیں کہ ان احکام کا دستور سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمیں بتائیں کہ دستور کے وہ کون سے بنیادی مسائل (تفصیلات نہیں بلکہ بنیادی مسائل) ہیں جن میں کتاب و سنت سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی' تو ہم ضرور اس کے شکر گزار ہوں گے لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسائل جن پر ہم نے اوپر بحث کی ہے دستوری مسائل نہیں ہیں اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان مسائل پر قرآن و حدیث کی ان تعلیمات سے کوئی روشنی نہیں پڑتی' تو اس کے بعد غیر منافق شرفاء کے لئے دو ہی راستے کھلے رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ سیدھی طرح ان احکام کو تسلیم کریں اور ملک کے دستور میں ان کو ثبت کر کے باقی تفصیلات جس طرح مناسب سمجھیں مرتب کرتے رہیں۔ یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ ہم نہ قرآن کو مانتے ہیں نہ سنت کو' ہمارا ایمان اس ڈیموکریسی پر ہے جس کا اسوہ حسنہ ہم کو امریکہ اور انگلستان اور ہندوستان کے دستور سلطنت میں ملتا ہے۔ ان دو راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کریں گے' بہرحال وہ راست باز انسانوں کے شایان شان ہو گا۔ رہا یہ طریقہ کہ سامنے آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہو اور آدمی کہے جائے کہ روشنی کہیں موجود نہیں ہے تو اس سے لوگ فریب کھائیں یا نہ کھائیں' کہنے والا اپنی عزت ضرور کھو دیتا ہے۔

باب ۹

اسلامی ریاست کا مثالی دور

دور نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ پر ایک نظر

- ☐ دور نبوی ﷺ
- ☐ خلافت راشدہ

پچھلے ابواب میں اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے بحث ہو چکی ہے۔ اب اس مثالی دور کا ایک نظری اور تاریخی جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس کا آغاز نبی اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے فرمایا تھا اور جس میں پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی از سر نو تشکیل کی گئی ہے۔ یہ دور روشنی کا مینار ہے اور اسلامی تاریخ کے ہر دور میں مسلمان اسی منبع نور سے فیض حاصل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے کہ اس نے ریاست کا ایک نیا تصور ہی پیش نہیں کیا بلکہ گوشت پوست کی اس دنیا میں اپنے تصور کی ریاست قائم بھی کی اور وہ ریاست ایک مدت تک اپنی معیاری شکل میں کام کرتی رہی۔ دنیا کا کوئی دوسرا نظام اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تصور کی معیاری ریاست کبھی ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لئے بھی عمل کی دنیا میں قائم ہوئی ہو۔ یہ صرف اسلام ہی کا اعجاز ہے اور اس باب میں وہ منفرد ہے۔

مرتب

دورِ نبوی ﷺ اور خلافتِ راشدہ پر ایک نظر

(۱)

دورِ نبوی ﷺ

ظہورِ اسلام کے ساتھ جو مسلم معاشرہ وجود میں آیا اور پھر ہجرت کے بعد سیاسی طاقت حاصل کر کے جس ریاست کی شکل اس نے اختیار کی، اس کی بنیاد چند واضح اصولوں پر تھی۔ ان میں سے اہم تر، جن کا تعلق ہماری بحث سے ہے، یہ ہیں۔

۱۔ قانونِ خداوندی کی بالاتری

اس ریاست کا اولین بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اہل ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ اس کو لازماً" اس قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہئے جس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ قرآن مجید میں اس قاعدے کو حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ النساء: ۵۹، ۶۴، ۶۵، ۸۰، ۱۰۵۔ المائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷۔ الاعراف: ۳۔ یوسف: ۴۰۔ النور: ۵۴، ۵۵۔ الاحزاب: ۳۶۔ الحشر: ۷۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں اس اصل الاصول کو پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

علیکم بکتاب اللّٰہ، احلوا حلالہ و حرموا حرامہ۔[1]

---

[1] کنز العمال بحوالہ طبرانی و مسند احمد، جلد اول، حدیث نمبر ۹۰۷، ۹۶۶ (طبع دائرۃ المعارف، ۱۹۵۵ء)

"تم پر لازم ہے کتاب اللہ کی پیروی۔ جس چیز کو اس نے حلال کیا ہے اسے حلال کرو اور جسے اس نے حرام کیا ہے اسے حرام کرو۔

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا و حرم حرمات فلا تنتہکوھا وحد حدود ا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔[1]

"اللہ نے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں' انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ حرمتیں مقرر کی ہیں' انہیں نہ توڑو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا ہے بغیر اس کے کہ اسے نسیان لاحق ہوا ہو' ان کی کھوج میں نہ پڑو۔

من اقتدی بکتاب اللہ لا یضل فی الدنیا ولا یشقی فی الاخرۃ۔[2]

"جس نے کتاب اللہ کی پیروی کی وہ نہ دنیا میں گمراہ ہو گا نہ آخرت میں بدبخت۔

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما' کتاب اللہ و سنۃ رسولہ۔[3]

"میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں جنہیں اگر تم تھامے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

ما امرتکم بہ فخذوہ وما نہیتکم عنہ فانتھوا۔[4]

"جس چیز کا میں نے تم کو حکم دیا ہے اسے اختیار کر لو اور جس چیز سے

---

[1] مشکوۃ بحوالہ دارقطنی' باب الاعتصام بالکتاب والسنہ۔ کنز العمال' ج ۱' ح ۹۸۱' ۹۸۲۔

[2] مشکوۃ بحوالہ رزین' باب مذکور۔

[3] مشکوۃ بحوالہ موطا' باب مذکور۔ کنز العمال' ج ۱' ح ۸۷۷' ۹۴۹' ۹۵۵۔

[4] کنز العمال' ج ۱' ح ۸۸۶۔

روکا ہے اس سے رک جاؤ۔"

۲۔ عدل بین الناس

دوسرا قاعدہ جس پر اس ریاست کی بنا رکھی گئی تھی' یہ تھا کہ قرآن و سنت کا دیا ہوا قانون سب کے لئے یکساں ہے اور اس کو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہیے۔ کسی کے لئے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرماتا ہے کہ۔

وامرت لاعدل بینکم۔[1]

"اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

یعنی میں بے لاگ انصاف پسندی کرنے پر مامور ہوں۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے اور وہ ہے عدل و انصاف کا تعلق۔ حق جس کے ساتھ ہو میں اس کا ساتھی ہوں اور حق جس کے خلاف ہو میں اس کا مخالف ہوں۔ میرے دین میں کسی کے لئے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اپنے اور غیر' بڑے اور چھوٹے' شریف اور کمین کے لئے الگ الگ حقوق نہیں ہیں۔ جو کچھ حق ہے وہ سب کے لئے حق ہے۔ جو گناہ ہے وہ سب کے لئے گناہ ہے۔ جو حرام ہے وہ سب کے لئے حرام ہے۔ جو حلال ہے وہ سب کے لئے حلال ہے۔ اور جو فرض ہے وہ سب کے لئے فرض ہے۔ میری اپنی ذات بھی قانون خداوندی کی اس ہمہ گیری سے مستثنیٰ نہیں۔ نبی اکرم ﷺ خود اس قاعدے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

انما ھلک من کان قبلکم انھم کانوا یقیمون الحد علی الوضیع و یترکون

---

[1] الشوریٰ' ۱۵۔

الشریف' والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمۃ (بنت محمد) فعلت ذالک لقطعت یدھا۔[1]

"تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اسی لئے تو تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کمتر درجے کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے' اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں:

رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقید من نفسہ۔[2]

"میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے۔"

۳۔ مساوات بین المسلمین

اسی قاعدے کی فرع یہ تیسرا قاعدہ ہے جو اس ریاست کے مسلمات میں سے تھا کہ تمام مسلمانوں کے حقوق بلا لحاظ رنگ و نسل و زبان و وطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرد' گروہ' طبقے یا نسل و قوم کو اس ریاست کے حدود میں نہ امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلے میں فروتر قرار پا سکتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انما المومنون اخوۃ   (الحجرات۔ آیت: ۱۰)

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

---

[1] بخاری' کتاب الحدود' ابواب نمبر ۱۱ – ۱۲

[2] کتاب الخراج' امام ابو یوسف۔ ص ۱۱۶' المطبعۃ السلفیہ' مصر' طبع ثانی ۱۳۵۲ء۔ مسند ابوداؤد الطیالسی' حدیث نمبر ۵۵' طبع دائرۃ المعارف' حیدر آباد' ۱۳۲۱ھ۔

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ط ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات : ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے حسب ذیل ارشادات اس قاعدے کی صراحت کرتے ہیں:

ان اللہ لا ینظر الیٰ صورکم و اموالکم ولکن ینظر الیٰ قلوبکم واعمالکم[1]

"اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دل اور تمہارے اعمال دیکھتا ہے۔"

المسلمون اخوۃ لا فضل لاحد علیٰ احد الا بالتقوی۔[2]

"مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

یا ایھا الناس' الا ان ربکم واحد لا فضل لعربی علیٰ عجمی' ولا لعجمی علیٰ عربی' ولا لاسود علیٰ احمر' ولا لاحمر علیٰ اسود الا بالتقویٰ۔[3]

"لوگو' سن لو' تمہارا رب ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں' نہ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے' مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر' بحوالہ مسلم و ابن ماجہ' ج ۴' ص ۲۱۷' مطبعہ مصطفیٰ محمد' مصر' ۱۹۳۷

[2] ابن کثیر' بحوالہ طبرانی' ج ۴' ص ۲۱۷

[3] تفسیر روح المعانی' بحوالہ بیہقی و ابن مردویہ' ج ۲۶' ص ۱۴۸۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر۔

من شهد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واستقبل قبلتنا وصلی صلوتنا واکل ذبیحتنا فھو المسلم لہ ما للمسلم وعلیہ ما علی المسلم۔[1]

"جس نے شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے۔ اس کے حقوق وہی ہیں جو مسلمان کے حقوق ہیں اور اس پر فرائض وہی ہیں جو مسلمان کے فرائض ہیں۔

المومنون تتکافا دماؤھم، وھم ید علی من سواھم، ویسعی بذمتھم ادناھم۔[2]

"مومنوں کے خون ایک دوسرے کے برابر ہیں، وہ دوسروں کے مقابلے میں ایک ہیں، اور ان کا ایک ادنیٰ آدمی بھی ان کی طرف سے ذمہ لے سکتا ہے۔

لیس علی المسلم جزیۃ۔[3]

"مسلمان پر جزیہ عائد نہیں کیا جا سکتا۔"

۴۔ حکومت کی ذمہ داری

چوتھا اہم قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم ہوئی تھی، یہ تھا کہ حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال، خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنہیں خدا ترس، ایمان دار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہئے اور اس امانت میں کسی شخص کو من مانے طریقے پر، یا نفسانی اغراض کے لئے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن مجید

---

[1] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب ۲۸۔

[2] ابوداؤد، کتاب الدیات، باب ۱۱۔ نسائی، کتاب القسامہ۔ باب ۱۰، ۱۴۔

[3] ابوداؤد، کتاب الامارہ باب ۳۴۔

میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان اللّٰہ یامرکم ان تودوا الامانت الیٰ اھلھا واذا حکمتم بین الناس تحکموا بالعدل ط ان اللّٰہ نعما یعظکم بہٗ ان اللّٰہ کان سمیعام بصیرا۔[1]

"اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

الا کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتہ فالامام الاعظم الذی علی الناس راع وھو مسؤل عن رعیتہ۔[2]

"خبردار رہو، تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سردار جو سب پر حکمراں ہو، وہ بھی راعی ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ۔

ما من وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الاحرم اللّٰہ علیہ الجنۃ۔[3]

"کوئی حکمراں، جو مسلمانوں میں سے کسی رعیت کے معاملات کا سربراہ ہو، اگر اس حالت میں مرے کہ وہ ان کے ساتھ دھوکا اور خیانت کرنے والا تھا، تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا۔

---

[1] النساء، ۵۸

[2] بخاری، کتاب الاحکام، باب ۱۔ مسلم، کتاب الامارہ، باب ۵

[3] بخاری، کتاب الاحکام، باب ۸۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۶۱۔ کتاب الامارہ، باب ۵۔

ما من امیریلی امر المسلمین ثم لا یجهد لهم ولا ینصح الا لم یدخل معهم فی الجنة۔[1]

"کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کرے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً" نہ داخل ہو گا۔

یا اباذر انک ضعیف وانها امانة وانها یوم القیمة خزی و ندامة الامن اخذ بحقها وادی الذی علیه فیها۔[2]

(نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوذر ؓ سے فرمایا) اے ابوذر' تم کمزور آدمی ہو اور حکومت کا منصب ایک امانت ہے' اور قیامت کے روز وہ رسوائی اور ندامت کا موجب ہو گا سوائے اس شخص کے جو اس کے حق کا پورا پورا لحاظ کرے اور جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔

من اخون الخیانة تجارة الوالی فی رعیة۔[3]

"کسی حاکم کا اپنی رعیت میں تجارت کرنا بدترین خیانت ہے۔

من ولی لنا عملا ولم تکن له زوجة فلیتخذ زوجة' و من لم یکن له خادم فلیتخذ خادما' اولیس له مسکن فلیتخذ مسکنا' اولیس له دابة فلیتخذ دابة' فمن اصاب سوی ذالک فهو غال او سارق۔

"جو شخص ہماری حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو وہ اگر بیوی نہ رکھتا

---

[1] مسلم' کتاب الامارہ' باب ۵۔

[2] کنز العمال' ج ۶' ح ۶۸ ـ ۱۲۲

[3] کنز العمال' ج ۶' ح ۷۸

[4] کنز العمال' ج ۶' ح ۳۴۶

ہو تو شادی کر لے' اگر خادم نہ رکھتا ہو تو ایک خادم حاصل کر لے' اگر گھر نہ رکھتا ہو تو ایک گھر لے لے' اگر سواری نہ رکھتا ہو تو ایک سواری لے لے۔ اس سے آگے جو شخص قدم بڑھاتا ہے وہ خائن ہے یا چور۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

من یکن امیرا فانه من اطول الناس حسابا واغلظه عذاب' ومن لا یکون امیرا فانه من ایسر الناس حسابا و اھونه عذابا لان الامراء اقرب الناس من ظلم المومنین و من یظلم المومنین فانما یخفر اللہ[1]

"جو شخص حکمراں ہو اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہو گا اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں مبتلا ہو گا' اور جو حکمران نہ ہو اس کو ہلکا حساب دینا ہو گا اور اس کے لئے ہلکے عذاب کا خطرہ ہے' کیونکہ حکام کے لئے سب سے بڑھ کر اس بات کے مواقع ہیں کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم ہو اور جو مسلمانوں پر ظلم کرے وہ خدا سے غداری کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

لو ھلک حمل من ولد الضان ضیاعا بشاطی الفرات خشیت ان یسالنی اللہ[2]

"دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی اگر ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے بازپرس کرے گا۔

1۔ کنز العمال' ج ۵' ح ۲۵۰۵

2۔ کنز العمال' ج ۵' ح ۲۵۱۲

۵- شوریٰ

اس ریاست کا پانچواں اہم قاعدہ یہ تھا کہ سربراہ ریاست مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رضامندی سے مقرر ہونا چاہئے اور اسے حکومت کا نظام بھی مشورے سے چلانا چاہئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وامرھم شوریٰ بینھم۔[1]

"اور مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں۔

وشاورھم فی الامر (آل عمران: ۱۵۹)

"اور اے نبی ﷺ ان سے معاملات میں مشاورت کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم ہو اور نہ آپ سے ہم نے کچھ سنا ہو تو ہم کیا کریں؟ فرمایا:

اجمعوا العابدین من امتی واجعلوہ بینکم شوریٰ ولا تقضوا برای واحد۔[2]

"میری امت کے عابد لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو آپس کے مشورے کے لئے پیش کر دو۔ کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کر ڈالو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

من دعا الی امارۃ نفسہ او غیرہ من غیر مشورۃ من المسلمین فلا یحل لکم ان لا تقتلوہ۔[3]

۱- الشوریٰ' ۳۸

۲- تفسیر روح المعانی' ج ۲۵' ص ۴۲

۳- کنز العمال' ج ۵' ص ۲۵۷۷

"جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر اپنی یا کسی اور شخص کی امارت کے لئے دعوت دے تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ اسے قتل نہ کرو۔
ایک اور روایت میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے:

لا خلافۃ الا عن مشورۃ[1]

"مشورے کے بغیر کوئی خلافت نہیں۔"

۶۔ اطاعت فی المعروف

چھٹا قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم کی گئی تھی' یہ تھا کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے' معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لئے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو۔ قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انہیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔ قرآن مجید میں خود رسول اللہ ﷺ کی بیعت کو بھی اطاعت فی المعروف کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے' حالانکہ آپ کی طرف سے کسی معصیت کا حکم صدور ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ولا یعصینک فی معروف۔[2]

"اور یہ کہ وہ کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احب اوکرہ ما لم یومر

---

[1]۔ کنز العمال' ج ۵' حدیث ۲۳۵۴

[2]۔ الممتحنہ' ۱۲

بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة[1]

ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع و طاعت فرض ہے خواہ اس کا حکم اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع و طاعت نہیں۔

لا طاعة فی معصیة اللہ، انما الطاعة فی المعروف۔[2]

اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے۔

یہ مضمون نبی اکرم ﷺ کے بکثرت ارشادات میں مختلف طریقوں سے نقل ہوا ہے۔ کہیں آپ نے فرمایا لا طاعة لمن عصی اللہ (جو اللہ کی نافرمانی کرے، اس کے لئے کوئی اطاعت نہیں) کہیں فرمایا لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں) کہیں فرمایا لا طاعة لمن لم یطع اللہ (جو اللہ کی اطاعت نہ کرے اس کے لئے کوئی اطاعت نہیں) کہیں فرمایا من امرکم من الولاة بمعصیة فلا تطیعوہ۔ (حکام میں سے جو کوئی تمہیں کسی معصیت کا حکم دے اس کی اطاعت نہ کرو۔)[3]

حضرت ابوبکرؓ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

من ولی امر امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم شیئا فلم یقم فیہم بکتاب

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام، باب ۴۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب ۸۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب ۹۵۔ نسائی، کتاب البیعہ، باب ۳۳۔ ابن ماجہ، ابواب الجہاد، باب ۴۰۔

[2] مسلم، کتاب الامارہ، باب ۸۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب ۹۵۔ نسائی، کتاب البیعہ، باب ۳۳۔

[3] کنز العمال، ج ۶، احادیث نمبر ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۹، ۳۰۱۔

اللہ فعلیہ بہلۃ اللہ[1]

جو شخص محمد ﷺ کی امت کے معاملات میں سے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا گیا اور پھر اس نے لوگوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق کام نہ کیا اس پر اللہ کی لعنت۔

اسی بناء پر خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنی پہلی ہی تقریر میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ:

اطیعونی ما اطعت اللہ و رسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔[2]

میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں:

حق علی الامام ان یحکم بما انزل اللہ وان یودی الامانۃ فاذا فعل ذالک فحق علی الناس ان یسمعوا لہ وان یطیعوا وان یجیبو اذا دعوا۔[3]

مسلمانوں کے فرمانروا پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرے اور امانت ادا کرے۔ پھر جب وہ اس طرح کام کر رہا ہو تو لوگوں پر یہ فرض ہے کہ اس کی سنیں اور مانیں اور جب انہیں

---

[1] کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۰۵

[2] کنز العمال، ج ۵، حدیث ۲۲۸۲۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے الفاظ یہ ہیں **وان عصیت اللہ فاعصونی** (اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم میری نافرمانی کرو۔) کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۳۰۔

[3] کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۳۱۔

پکارا جائے تو لبیک کہیں۔

اپنی خلافت کے زمانے میں انہوں نے اپنے ایک خطبے میں یہ اعلان فرمایا:

ما امرتکم بہ من طاعۃ اللّٰہ فحق علیکم طاعتی فیما احببتم وما کرھتم' وما امرتکم بہ من معصیۃ اللّٰہ فلا طاعۃ لاحد فی المعصیۃ الطاعۃ فی المعروف الطاعۃ فی المعروف الطاعۃ فی المعروف۔[1]

میں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے تم کو جو حکم دوں اس کی اطاعت تم پر فرض ہے' خواہ وہ حکم تمہیں پسند ہو یا ناپسند۔ اور جو حکم میں تمہیں اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دوں تو معصیت میں کسی کے لئے اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف معروف میں ہے' اطاعت صرف معروف میں ہے' اطاعت صرف معروف میں ہے۔

۷۔ اقتدار کی طلب و حرص کا ممنوع ہونا

یہ قاعدہ بھی اس ریاست کے قواعد میں سے تھا کہ حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب کے لئے عموماً" اور خلافت کے لئے خصوصاً" وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عہدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں' اور اس کے لئے کوشش کریں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تلک الدار الاخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا۔ (القصص: ۸۳)

وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[1] کنز العمال' ج ۵' ح ۲۵۸۷

انا واللّٰہ لا نولی علی عملنا ھذا احدا سالہ او حرص علیہ[1]

بخدا ہم اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب ہو یا اس کا حریص ہو۔

ان اخونکم عندنا من طلبہ[2]

تم میں سے سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود طلب کرے۔

ان لا نستعمل علی عملنا من ارادہ۔[3]

ہم اپنی حکومت میں کسی ایسے شخص کو عامل نہیں بناتے جو اس کی خواہش کرے۔

یا عبد الرحمن بن سمرۃ لا تسائل الامارۃ فانک اذا او تیتہا عن مسئلۃ وکلت الیہا وان اوتیتہا عن غیر مسئلۃ اعنت علیہا۔[4]

---

[1] بخاری کتاب الاحکام' باب ۷۔ مسلم' کتاب الامارہ' باب ۳

[2] ابوداؤد' کتاب الامارہ' باب ۲

[3] کنز العمال' ج ۶' ح ۲۰۶

[4] کنز العمال' ج ۶' ح ۶۹۔ اس مقام پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اگر یہ اسلام کا اصول ہے تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ سے حکومت کا منصب کیوں مانگا تھا۔ دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کسی مسلمان ملک اور اسلامی حکومت میں نہیں بلکہ ایک کافر ملک اور کافر حکومت میں تھے۔ وہاں ایک خاص نفسیاتی موقع پر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت اگر میں بادشاہ سے حکومت کا بلند ترین منصب طلب کروں تو وہ مجھے مل سکتا ہے اور اس کے ذریعے سے میں اس ملک میں خدا کا دین پھیلانے کے لئے راستہ نکال سکتا ہوں' لیکن اگر میں طلب اقتدار سے باز رہوں تو اس کافر قوم کی ہدایت کے لئے جو نادر موقع مجھے مل رہا ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ ایک خاص صورت حال تھی جس پر اسلام کا عام قاعدہ چسپاں نہیں ہوتا۔

(عبدالرحمان بن سمرہ ؓ سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا) اے عبدالرحمان بن سمرہ امارت کی درخواست نہ کرو' کیونکہ اگر وہ تمہیں مانگنے پر دی گئی تو خدا کی طرف سے تم کو اسی کے حوالہ کردیا جائے گا اور اگر وہ تمہیں بے مانگے ملی تو خدا کی طرف سے تم کو اس کا حق ادا کرنے میں مدد دی جائے گی۔

۸۔ ریاست کا مقصد وجود

اس ریاست میں حکمراں اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو کسی ردوبدل کے بغیر جوں کا توں قائم کرے اور اسلام کے معیار اخلاق کے مطابق بھلائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کو مٹائے۔ قرآن مجید میں اس ریاست کا مقصد وجود یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ [۱]

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اور یہی قرآن کی رو سے امت مسلمہ کا مقصد وجود بھی ہے۔

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ (البقرہ: ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت (یا راہ اعتدال پر قائم رہنے والی امت) بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ۔

---

[۱] الحج: ۴۱۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر و تومنون باللہ۔ (آل عمران: آیت ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

علاوہ بریں جس کام پر محمد ﷺ اور آپ ﷺ سے پہلے کے تمام انبیاء مامور تھے وہ قرآن مجید کی رو سے یہ تھا کہ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ۔[1] (دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ) غیر مسلم دنیا کے مقابلے میں آپ کی ساری جدوجہد صرف اس غرض کے لئے تھی کہ یکون الدین کلہ للہ[2] (دین پورا کا پورا صرف اللہ کے لئے ہو جائے) اور تمام انبیاء کی امتوں کی طرح آپ کی امت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ لیعبداللّٰہ مخلصین لہ الدین حنفاء۔[3] (یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے) اس لئے آپ کی قائم کردہ ریاست کا اصل کام ہی یہ تھا کہ دین کے پورے نظام کو قائم کرے اور اس کے اندر کوئی ایسی آمیزش نہ ہونے دے جو مسلم معاشرے میں دو رنگی پیدا کرنے والی ہو۔ اس آخری نکتے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب اور جانشینوں کو سختی کے ساتھ متنبہ فرما دیا کہ:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد۔[4]

جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالے جو اس کی جنس سے نہ ہو اس کی بات مردود ہے۔

---

[1] الشوریٰ: ۱۳ [2] الانفال: ۳۹ [3] البینہ: ۵

[4] مشکوٰۃ' باب الاعتصام بالکتاب والسنہ

ایاکم و محدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة۔[1]

خبردار! نرالی باتوں سے بچنا' کیونکہ ہر نرالی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی۔

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام[2]

جس نے کسی بدعت نکالنے والے کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

اسی سلسلے میں آپ کا یہ ارشاد بھی ہمیں ملتا ہے کہ تین آدمی خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہیں اور ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو:

مبتغ فی الاسلام سنة الجاھلیة۔[3]

اسلام میں جاہلیت کا کوئی طریقہ چلانا چاہے۔

۹۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حق اور فرض

اس ریاست کے قواعد میں سے آخری قاعدہ' جو اس کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کا ضامن تھا' یہ تھا کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق' ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے کہ کلمہ حق کہے' نیکی اور بھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے یا مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی امکانی حد تک پوری کوشش صرف کر دے۔ قرآن مجید کی ہدایات اس باب میں یہ ہیں:

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔[4]

---

[1] مشکوٰۃ' باب الاعتصام بالکتاب والسنہ

[2] مشکوٰۃ' باب الاعتصام بالکتاب والسنہ

[3] مشکوٰۃ' باب الاعتصام بالکتاب والسنہ

[4] (المائدہ: ۲)

نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔

یاایھا الذین امنوا اتقو اللّٰہ و قولوا قولا سدیدا۔ (الاحزاب: ۷۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔

یاایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین۔ (النساء: ۱۳۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو' خواہ تمہاری گواہی خود تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف پڑے۔

المنفقون والمنفقت بعضہم من م بعض یامرون بالمنکر وینھون عن المعروف ...... والمومنون والمومنت بعضہم اولیاء بعض م یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (التوبہ: ۶۷۔ ۷۱)

منافق مرد اور عورتیں ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں' وہ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں .... اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں' وہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ

الامرون بالمعروف والنھون عن المنکر والحفظون لحدود اللّٰہ۔[1]

نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے منع کرنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اس معاملہ میں حسب ذیل ہیں:

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ' فان لم

---

[1] التوبہ: ۱۱۲

یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان۔[1]

تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے چاہئے کہ اس کو ہاتھ سے بدل دے' اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے' اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے (برا سمجھے اور روکنے کی خواہش رکھے) اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

ثم انھا تخلف من بعد ھم خلوف یقولون ما لا یفعلون ویفعلون ما لا یومرون' فمن جاھد ھم بیدہ فھو مومن و من جاھد ھم بلسانہ فھو مومن و من جاھد ھم بقلبہ فھو مومن ولیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان۔[2]

پھر ان کے بعد نالائق لوگ ان کی جگہ آئیں گے۔ کہیں گے وہ باتیں جو کریں گے نہیں اور کریں گے وہ کام جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پس جو ان کے خلاف ہاتھ سے جدوجہد کرے وہ مومن ہے' اور جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اس سے کم تر ایمان کا ذرہ برابر بھی کوئی درجہ نہیں ہے۔

افضل الجہاد کلمۃ عدل (او حق) عند سلطان جائر۔[3]

"سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی (یا حق کی)

---

[1] مسلم' کتاب الایمان' باب ۲۰۔ ترمذی۔ ابواب الفتن' باب ۱۲۔ ابوداؤد' کتاب الملاحم' باب ۱۷' ابن ماجہ' ابواب الفتن' باب ۲۰۔

[2] مسلم' کتاب الایمان' باب ۲۰

[3] ابوداؤد' کتاب الملاحم' باب ۱۷۔ ترمذی' کتاب الفتن' باب ۱۲۔ نسائی' کتاب البیعہ' باب ۳۶۔ ابن ماجہ' ابواب الفتن' باب ۲۰۔

بات کہتا ہے۔

ان الناس اذا راوا الظالم فلم یاخذ وا علی ید یہ او شک ان یعمھم اللہ بعقاب منہ۔[1]

لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذاب عام بھیج دے۔

انہ ستکون بعدی امراء من صد قہم بکذ بھم واعانہم علی ظلمہم فلیس منی ولست منہ۔[2]

میرے بعد کچھ لوگ حکمران ہونے والے ہیں۔ جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔

سیکون علیکم ائمۃ یملکون ارزاقکم یحد ثونکم فیکذ بونکم ویعملون فیسیؤن العمل لا یرضون منکم حتی تحسنوا قبیحہم و تصدقوا کذ بہم فاعطوھم الحق ما رضوابہ فاذا تجاوز د افمن قتل علی ذالک فھو شہید۔[3]

عنقریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہو گی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو برے کام کریں گے۔ وہ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی برائیوں کی تعریف اور ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پس تم ان کے سامنے حق پیش کرو جب تک وہ اسے گوارا کریں۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب ۱۷۔ ترمذی، کتاب الفتن، باب ۱۲

[2] نسائی، کتاب البیعہ، باب ۳۴۔۳۵

[3] کنز العمال، ج ۶، ح ۲۹۷

پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔

من ارضی سلطانا بما یسخط ربه خرج من دین اللہ [1]

جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لئے وہ بات کی جو اس کے رب کو ناراض کر دے وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

---

[1] کنز العمال، ج ۶، ح ۳۰۹

(۲)

خلافت راشدہ

یہ ہیں وہ اصول حکمرانی جن پر دور رسالت مآب ﷺ میں حکومت کا نظام قائم ہوا اور چلا' نبی اکرم ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کی حکومت انہی اصولوں پر قائم ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی براہ راست تعلیم و تربیت اور عملی رہنمائی سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے مطابق کس قسم کا نظام حکومت بننا چاہیے۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا' لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوروی خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی' نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسر اقتدار آیا' نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لئے خود کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی کوئی کوشش کی' بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امت نے خلافت راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔

انتخابی خلافت

نبی اکرم ﷺ کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً" نمائندہ حیثیت رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں

پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت لکھوائی اور پھر مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے کہا:

"کیا تم اس شخص پر راضی ہو جسے میں اپنا جانشین بنا رہا ہوں؟ خدا کی قسم میں نے رائے قائم کرنے کے لئے اپنے ذہن پر زور ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمر بن الخطاب کو جانشین مقرر کیا ہے' لہٰذا تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔"

اس پر لوگوں نے کہا "ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔"[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری سال حج کے موقع پر ایک شخص نے کہا کہ "اگر عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا' کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی تو اچانک ہی ہوئی تھی اور آخر وہ کامیاب ہو گئی۔"[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں اس معاملہ پر ایک تقریر کروں گا اور "عوام کو ان لوگوں سے خبردار کر دوں گا جو ان کے معاملات پر غاصبانہ تسلط قائم کرنے کے ارادے کر رہے ہیں۔" چنانچہ مدینے پہنچ کر انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں اس قصے کا ذکر کیا اور بڑی تفصیل کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ کی سرگزشت بیان کر کے یہ بتایا کہ اس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اچانک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کر کے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرمایا: اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اٹھ جاتے تو

1۔ الطبری' تاریخ الامم والملوک' ج ۲' ص ۶۱۸' المطبع ۃ الاستقامہ' قاہرہ' ۱۹۳۹ء

2۔ اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ کی مجلس میں اچانک اٹھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً" ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔

اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جا سکتا۔ تم میں ابوبکرؓ جیسی بلند و بالا اور مقبول شخصیت کا آدمی اور کون ہے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی، دونوں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں گے۔"[1]

اپنے تشریح کردہ اسی قاعدے کے مطابق حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت خلافت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک انتخابی مجلس مقرر کی اور فرمایا "جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بننے کی کوشش کرے اسے قتل کر دو۔" اس کے ساتھ انہوں نے اپنے بیٹے کو خلافت کے استحقاق سے صاف الفاظ میں مستثنیٰ کر دیا تاکہ خلافت ایک موروثی منصب نہ بن جائے۔[2] یہ انتخابی مجلس ان چھ اشخاص پر مشتمل تھی جو حضرت عمرؓ کے نزدیک قوم میں سب سے زیادہ باأثر اور مقبول عام تھے۔

---

[1] بخاری، کتاب المحاربین، باب ۱۶۔ مسند احمد، ج ۱، حدیث نمبر ۳۹۱، طبع ثالث، دارالمعارف، مصر، ۱۹۴۹ء۔ مسند احمد کی اس روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں: "جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی۔" ایک اور روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ بھی آئے ہیں کہ "جس شخص کو مشورے کے بغیر امارت دی جائے اس کے لئے اس کا قبول کرنا حلال نہیں ہے۔" (ابن حجر، فتح الباری، ج ۱۲، ص ۱۲۵، المطبعۃ الخیریہ، قاہرہ، ۱۳۲۵ھ)

[2] الطبری، ج ۳، ص ۲۹۲۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۳۴، ۳۵، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۵۶ھ۔

اس مجلس نے آخر کار اپنے ایک رکن، عبدالرحمان بن عوف ﷛ کو خلیفہ تجویز کرنے کا اختیار دے دیا۔ انہوں نے عام لوگوں میں چل پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ عوام کا رجحان زیادہ تر کس شخص کی طرف ہے۔ حج سے واپس گزرتے ہوئے قافلوں سے بھی دریافت کیا۔ اور اس استصواب عام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثر لوگ حضرت عثمان ﷛ کے حق میں ہیں۔[1] اسی بنیاد پر حضرت عثمان ﷛ خلافت کے لئے منتخب کئے گئے اور مجمع عام میں ان کی بیعت ہوئی۔

حضرت عثمان ﷛ کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علی ﷛ کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے کہا "تمہیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کے کرنے کا کام ہے۔ جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر خلیفہ بنانا چاہیں گے وہی خلیفہ ہو گا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔"[2] طبری کی روایت میں حضرت علی ﷛ کے الفاظ یہ ہیں: "میری بیعت خفیہ طریقے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہی ہونی چاہیے۔"[3]

حضرت علی ﷛ کی وفات کے وقت لوگوں نے پوچھا کہ ہم آپ کے صاحبزادے حضرت حسن کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ آپ نے جواب میں کہا "میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔"[4] ایک شخص نے عین اس وقت جب کہ آپ اپنے صاحبزادوں کو آخری وصیت کر رہے تھے، عرض کیا کہ امیر المومنین آپ اپنا ولی عہد کیوں نہیں مقرر کر دیتے۔

---

[1] حوالہ مذکور، نیز ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۲۳، مطبعۃ الفتوح، مصر، ۱۳۳۱ھ

[2] ابن قتیبہ، ج ۱، ص ۴۱

[3] الطبری، ج ۳، ص ۴۵۰

[4] الطبری، ج ۴، ص ۱۱۲۔ المسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۲، المطبعۃ البہیہ، مصر، ۱۳۴۶ھ۔

جواب میں فرمایا "میں مسلمانوں کو اسی حالت میں چھوڑوں گا جس میں رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا تھا۔"[1]

ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحاب رسول اللہ ﷺ کا متفق علیہ تصور یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے۔ موروثی یا طاقت سے برسراقتدار آنے والی امارت ان کی رائے میں صحیح نہ تھی۔

شوروی حکومت

یہ چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کیے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ سنن الدارمی میں حضرت میمون بن مہران کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا تو پہلے یہ دیکھتے تھے کہ اس معاملہ میں کتاب اللہ کیا کہتی ہے۔ اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے معاملہ میں کیا فیصلہ فرمایا ہے اور اگر سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تھا تو قوم کے سرکردہ اور نیک لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرتے تھے' پھر جو رائے بھی سب کے مشورے سے قرار پاتی تھی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔[2] یہی طرز عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔[3]

مشورے کے معاملے میں خلفائے راشدین کا تصور یہ تھا کہ اہل شوریٰ کو پوری آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرنے کا حق ہے۔ اس معاملے میں

---

[1] المسعودی' ج ۲' ص ۴۲۔

[2] سنن الدارمی' باب الفیا وما فیہ من الشدۃ۔

[3] کنز العمال' ج ۵' ح ۲۲۸۱

خلافت کی پالیسی کو حضرت عمر ﷜ نے ایک مجلس مشاورت کی افتتاحی تقریر میں یوں بیان فرمایا ہے:

"میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لئے تکلیف دی ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔"[1]

بیت المال کے امانت ہونے کا تصور

بیت المال کو وہ خدا اور خلق (Public) کی امانت سمجھتے تھے۔ اس میں قانون کے خلاف کچھ آنے کو اور اس میں سے کچھ خرچ ہونے کو وہ جائز نہ رکھتے تھے۔ فرمانرواؤں کی ذاتی اغراض کے لئے اس کا استعمال ان کے نزدیک حرام تھا۔ حضرت ابوبکر ﷜ جس روز خلیفہ ہوئے اس کے دوسرے دن کندھے پر کپڑے کے تھان رکھ کر بیچنے کے لئے نکلے (خلافت سے پہلے یہی ان کا ذریعہ معاش تھا) راستے میں حضرت عمر ﷜ ملے اور انہوں نے کہا یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ جواب دیا' اپنے بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں انہوں نے کہا' اب آپ کے اوپر مسلمانوں کی سربراہ کاری کا بار آ پڑا ہے۔ یہ کام اس کے ساتھ نہیں نبھ سکتا۔ چلیے' ابوعبیدہ (ناظم بیت المال) سے مل کر بات کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ سے گفتگو کی گئی۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لئے مہاجرین میں سے ایک عام آدمی کی آمدنی کا معیار سامنے رکھ کر ایک وظیفہ مقرر کئے دیتے ہیں جو نہ ان کے سب سے زیادہ دولت مند

---

[1] امام ابو یوسف' کتاب الخراج' ص ۲۵۔

کے برابر ہوگا نہ سب سے غریب کے برابر۔ اس طرح ان کے لئے ایک وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو "تقریباً" چار ہزار درہم سالانہ تھا مگر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے ترکے میں سے ۸ ہزار درہم بیت المال کو واپس کر دیئے جائیں۔ یہ مال جب حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو انہوں نے کہا' خدا ابوبکرؓ پر رحمت فرمائے' اپنے بعد آنے والوں کو انہوں نے مشکل میں ڈال دیا۔[1]

حضرت عمرؓ اپنی ایک تقریر میں بیان کرتے ہیں کہ بیت المال میں خلیفہ کا کیا حق ہے:

"میرے لئے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ حلال نہیں ہے کہ ایک جوڑا کپڑا گرمی کے لئے اور ایک جاڑے کے لئے اور قریش کے ایک اوسط آدمی کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لئے لے لوں۔ پھر میں بس ایک آدمی ہوں مسلمانوں میں سے۔"[2]

ایک اور تقریر میں وہ فرماتے ہیں:

"میں اس مال کے معاملہ میں تین باتوں کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا۔ حق کے ساتھ لیا جائے۔ حق کے مطابق دیا جائے اور باطل سے اس کو روکا جائے۔ میرا تعلق تمہارے اس مال کے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں محتاج نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں تو معروف طریقے پر کھاؤں گا۔"[3]

---

[1] کنز العمال' ج ۵' ح ۲۲۸۰ - ۲۲۸۵۔

[2] ابن کثیر' البدایہ والنہایہ' ج ۷' ص ۱۳۴' مطبعۃ السعادہ' مصر۔

[3] ابویوسف' کتاب الخراج' ص ۱۱۷۔

حضرت علی ؓ کا جس زمانے میں حضرت معاویہ ؓ سے مقابلہ درپیش تھا' لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ جس طرح حضرت معاویہ ؓ لوگوں کو بے تحاشا انعامات اور عطیے دے دے کر اپنا ساتھی بنا رہے ہیں آپ بھی بیت المال کا منہ کھولیں اور روپیہ بہا کر اپنے حامی پیدا کریں۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ "کیا تم چاہتے ہو میں ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں؟"[1] ان سے خود ان کے بھائی حضرت عقیل ؓ نے چاہا کہ وہ بیت المال سے ان کو روپیہ دیں' مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جہنم میں جائے؟[2]

حکومت کا تصور

ان لوگوں کا تصور حکومت کیا تھا' فرمانروا ہونے کی حیثیت سے یہ اپنے مقام اور اپنے فرائض کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے اور اپنی حکومت میں کس پالیسی پر عامل تھے' ان چیزوں کو انہوں نے خود خلافت کے منبر سے تقریریں کرتے ہوئے برسرعام بیان کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکر ؓ کی پہلی تقریر جو انہوں نے مسجد نبوی میں عام بیعت کے بعد کی' اس میں وہ کہتے ہیں:

> "میں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے۔ نہ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کے بجائے یہ مجھے ملے۔ نہ میں نے کبھی خدا سے اس کے لئے دعا کی۔ نہ میرے دل میں کبھی اس کی حرص پیدا

---

[1] ابن ابی الحدید' شرح نہج البلاغہ' ج ۱' ص ۱۸۲' دار الکتب العربیہ' مصر' ۱۳۲۹ھ

[2] ابن قتیبہ' الامامہ والسیاسہ' ج ۱' ص ۷۱۔

ہوئی۔ میں نے تو اسے باول نخواستہ اس لئے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنہ اختلاف اور عرب میں فتنہ ارتداد برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے لئے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے' بلکہ یہ ایک بار عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے' جس کے اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے' الا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اٹھا لے۔ اب بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو اصحاب رسول اللہ میں سے کسی اور کو اس کام کے لئے چن لیں' میری بیعت آپ کے راستے میں حائل نہ ہو گی۔ آپ لوگ اگر مجھے رسول اللہ ﷺ کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضور اکرم ﷺ سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا' کیونکہ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجئے' اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجئے۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں اگر خدا چاہے اور تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جدوجہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر دے اور کسی قوم میں فواحش پھیلیں اور اللہ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کا مطیع رہوں اور اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر

نہیں ہے۔ میں پیروی کرنے والا ہوں' نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔"[1]

حضرت عمرؓ اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

"لوگو' کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے ...... لوگو میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں تم سے بیان کئے دیتا ہوں' ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو۔ میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج یا اللہ کے عطا کردہ میں سے کوئی چیز نہ وصول کروں مگر قانون کے مطابق اور میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ جو کچھ مال اس طرح میرے پاس آئے ان میں سے کچھ نہ نکلے مگر حق کے مطابق۔"[2]

حضرت ابوبکرؓ جب شام و فلسطین کی مہم پر حضرت عمرو بن العاص کو روانہ کر رہے تھے' اس وقت انہوں نے جو ہدایات ان کو دیں ان میں وہ فرماتے ہیں:

"اے عمرو' اپنے کھلے اور چھپے ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو اور اس سے حیا کرو' کیونکہ وہ تمہیں اور تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے ...... آخرت کے لئے کام کرو اور اپنے ہر عمل میں خدا کی رضا کو پیش نظر رکھو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسے وہ تمہاری اولاد ہیں۔ لوگوں کے راز نہ ٹٹولو اور ان کے ظاہر پر ہی ان سے معاملہ کرو ...... اپنے آپ کو درست رکھو۔ تمہاری رعیت بھی درست رہے گی۔"[3]

۱۔ الطبری' ج ۲' ص ۴۵۰۔ ابن ہشام' السیرۃ النبویہ' ج ۴' ص ۳۱۱۔ مطبعۃ مصطفیٰ البابی' مصر' ۱۹۳۶ء۔ کنز العمال' ج ۵' احادیث نمبر ۲۲۶۱' ۲۲۶۴' ۲۲۶۸' ۲۲۷۸' ۲۲۹۱' ۲۲۹۹۔

۲۔ ابو یوسف' کتاب الخراج' ص ۱۱۷۔

۳۔ کنز العمال' ج ۵' ح ۲۳۱۳

حضرت عمرؓ جن لوگوں کو عامل بنا کر کہیں بھیجتے تھے ان کو خطاب کر کے کہتے:

"میں تم لوگوں کو امت محمد ﷺ پر اس لئے عامل مقرر نہیں کر رہا ہوں کہ تم ان کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک بن جاؤ بلکہ میں اس لئے تمہیں مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو' لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور عدل کے ساتھ ان کے حقوق تقسیم کرو۔"[1]

ایک مرتبہ انہوں نے بر سر عام اعلان کیا کہ "میں نے اپنے عاملوں کو اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تم لوگوں کو پیٹیں اور تمہارے مال چھینیں' بلکہ اس لئے بھیجا ہے کہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کا طریقہ سکھائیں۔ جس شخص کے ساتھ اس کے خلاف عمل کیا گیا ہو وہ میرے پاس شکایت لائے' خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا۔" اس پر حضرت عمرو بن العاص (مصر کے گورنر) نے اٹھ کر کہا "اگر کوئی شخص مسلمانوں کا والی ہو اور تادیب کی غرض سے کسی کو مارے تو کیا آپ اس سے بدلہ لیں گے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہاں' خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا۔ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے۔"[2]

ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو حج میں طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہو کر کہا کہ ان لوگوں کے خلاف جس شخص کو کسی ظلم کی شکایت ہو وہ پیش کرے۔ پورے مجمع میں سے صرف ایک شخص اٹھا اور اس نے عمروؓ بن العاص کی شکایت کی کہ انہوں نے ناروا طور پر مجھے سو کوڑے لگوائے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اٹھو اور ان سے اپنا بدلہ لے لو۔ عمروؓ بن العاص نے احتجاج کیا کہ آپ گورنروں پر یہ دروازہ نہ کھولیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ

---

[1] الطبری' ج ۳' ص ۲۷۳

[2] ابو یوسف' کتاب الخراج' ص ۱۱۵۔ مسند ابوداؤد الطیالسی' حدیث نمبر ۵۵' ابن الاثیر ج ۳' ص ۳۰۔ الطبری ج ۳' ص ۲۷۳۔

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو خود اپنے آپ سے بدلہ دیتے دیکھا ہے' اے شخص اٹھ اور اپنا بدلہ لے لے۔" آخر کار عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر اپنی پیٹھ بچانی پڑی۔[1]

قانون کی بالاتری

یہ خلفاء اپنی ذات کو بھی قانون سے بالاتر نہیں رکھتے تھے بلکہ قانون کی نگاہ میں اپنے آپ کو اور مملکت کے ایک عام شہری (مسلمان ہو یا ذمی) کو مساوی قرار دیتے تھے۔ قاضیوں کو اگرچہ رئیس مملکت ہونے کی حیثیت سے وہی مقرر کرتے تھے' مگر ایک شخص قاضی ہو جانے کے بعد خود ان کے خلاف فیصلہ دینے میں بھی ویسا ہی آزاد تھا جیسا کسی عام شہری کے معاملہ میں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ بن کعب کا ایک معاملے میں اختلاف ہو گیا اور دونوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کو حاکم بنایا۔ فریقین زید کے پاس حاضر ہوئے۔ زید نے اٹھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا' مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھے۔ پھر حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعوے سے انکار کیا۔ قاعدے کے مطابق حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قسم لینی چاہیے تھی' مگر انہوں نے ان سے قسم لینے میں تامل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود قسم کھائی' اور اس مجلس کے خاتمہ پر کہا "زید قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک کہ عمر رضی اللہ عنہ اور ایک عام مسلمان ان کے نزدیک برابر نہ ہو۔"[2]

ایسا ہی معاملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک عیسائی کے ساتھ پیش آیا جس کو انہوں نے کوفہ کے بازار میں اپنی گم شدہ زرہ بیچتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے امیرالمومنین

---

[1] ابو یوسف' کتاب الخراج' ص ۱۱۶

[2] بیہقی' السنن الکبریٰ' ج ۱۰' ص ۱۳۶' دائرۃ المعارف' حیدر آباد' طبع اول ۱۳۵۵ھ

ہونے کی حیثیت سے اپنی زرہ اس سے چھین نہیں لی۔ بلکہ قاضی کے پاس استغاثہ کیا اور چونکہ وہ کوئی شہادت پیش نہ کر سکے۔ اس لئے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا۔[1]

ابن خلکان کی روایت ہے کہ ایک مقدمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک ذمی فریقین کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی نے اٹھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا "یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے۔"[2]

عصبیتوں سے پاک حکومت

اسلام کے ابتدائی دور کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانے میں ٹھیک ٹھیک اسلام کے اصول اور اس کی روح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کے درمیان یکساں سلوک کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں ایک طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ مدعیان نبوت کے ظہور اور ارتداد کی تحریک میں یہی عامل سب سے زیادہ موثر تھا۔ مسیلمہ کے ایک پیرو کا قول تھا کہ "میں جانتا ہوں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے، مگر ربیعہ کا جھوٹا مضر کے سچے سے اچھا ہے۔"[3] ایک دوسرے مدعی نبوت طلیحہ کی حمایت میں بنی غطفان کے ایک سردار نے کہا تھا کہ "خدا کی قسم، اپنے حلیف قبیلوں کے ایک نبی کی پیروی کرنا قریش کے نبی کی پیروی سے مجھ کو زیادہ

---

[1] حوالہ مذکور

[2] وفیات الاعیان، ج ۲، ص ۱۶۸، مکتبہ النہضۃ المصریہ، قاہرہ، ۱۹۴۸ء

[3] الطبری، ج ۲، ص ۵۰۸

محبوب ہے۔"[1] مگر اس ماحول میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (۱۱-۱۳ھ ۶۳۲-۶۳۴ء) اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ (۱۳-۲۴ھ ۶۳۴-۶۴۵ء) نے بے لاگ اور غیر متعصبانہ طریقے سے نہ صرف تمام عرب قبائل' بلکہ غیر عرب نو مسلمانوں کے ساتھ بھی منصفانہ برتاؤ کیا اور خود اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے سے قطعی مجتنب رہے۔ تو ساری عصبیتیں دب گئیں اور مسلمانوں میں وہ بین الاقوامی روح ابھر آئی جس کا اسلام تقاضا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے ان دونوں خلفاء کا طرز عمل درحقیقت مثالی تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد عرب کی یہ قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور ان کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا "اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی ابی معیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمان رضی اللہ عنہ یہی کریں گے' اور اگر عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیں گے۔"[2] اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا۔ چنانچہ آخری وقت میں انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کو بلا کر ہر ایک سے کہا کہ "اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے

---

[1] ایضاً' ج ۲' ص ۲۸۷

[2] ابن عبدالبر' الاستیعاب' ج ۲' ص ۴۶۷' دائرۃ المعارف حیدر آباد' طبع دوم

کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔"[1] مزید برآں چھ آدمیوں کی انتخابی شوریٰ کے لئے انہوں نے جو ہدایات چھوڑیں ان میں دوسری شرطوں کے ساتھ ایک شرط یہ بھی شامل کی کہ منتخب خلیفہ سے عہد لیا جائے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا۔[2] مگر بدقسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (۲۴-۳۵ھ' ۶۴۵-۶۵۵ء) اس معاملے میں معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان کے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے وظیفے دیئے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔ ان کے نزدیک یہ صلہ رحمی کا تقاضا تھا' چنانچہ وہ کہتے تھے کہ "عمر خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں۔"[3] "ابوبکر و عمر بیت المال کے معاملہ میں اس بات کو پسند کرتے تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقرباء کو بھی اسی حالت میں رکھیں۔ مگر میں اس میں صلہ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں۔"[4] اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ تھا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے' بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں جن کا شعلہ خلافت راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ (۳۵-۴۰ھ' ۶۵۵-۶۶۰ء) نے پھر اسی معیار پر کام کرنے کی کوشش کی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا۔ وہ قبائلی تعصب سے بالکل پاک تھے۔ حضرت معاویہ کے والد حضرت ابوسفیان نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت ان کے اندر اس تعصب کی روح کو ابھارنے

---

[1] الطبری' ج ۳' ص ۲۶۴

[2] ابن قتیبہ' الامامۃ والسیاسۃ' ج ۱' ص ۲۵۔

[3] الطبری ج ۳' ص ۲۹۱

[4] کنز العمال' ج ۵' ح ۲۳۲۴

کی کوشش کی تھی' مگر انہوں نے یہ راہ اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ابوسفیان نے ان سے کہا تھا کہ "قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی (ابوبکر ؓ) کیسے خلیفہ بن گیا' تم اٹھنے کے لئے تیار ہو تو میں وادی کو سواروں اور پیدلوں سے بھر دوں۔" مگر انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ "تمہاری یہ بات اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کوئی سوار اور پیادے لاؤ۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں' خواہ ان کے دیار اور ان کے اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دور ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابوبکر ؓ کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انہیں اس پر مامور نہ ہونے دیتے۔"[1] یہی حضرت علی ؓ کا نقطہ نظر خلیفہ ہونے کے بعد بھی رہا۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ٹھیک اسلامی اصول کے مطابق عربی اور عجمی' شریف اور وضیع' ہاشمی اور غیر ہاشمی' سب کے ساتھ یکساں انصاف کا معاملہ کرنا شروع کیا اور کسی گروہ کو کسی دوسرے گروہ کے مقابلے میں ایسے ترجیحی سلوک سے نوازنا پسند نہ کیا جو دوسرے گروہوں میں رشک و رقابت کے جذبات ابھار دینے والا ہو۔

روح جمہوریت

اس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں تنقید اور اظہار رائے کی پوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دسترس میں تھے وہ خود اپنے اہل شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کی

---

[1] کنز العمال' ج ۵' ح ۲۳۷۴۔ الطبری' ج ۲' ص ۴۴۹ ابن عبدالبر' الاستیعاب' ج ۲' ۶۸۹۔

کوئی سرکاری پارٹی نہ تھی' نہ ان کے خلاف کسی پارٹی کا کوئی وجود تھا۔ آزادانہ فضا میں ہر شریک مجلس اپنے ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔ تمام معاملات اہل حل و عقد کے سامنے بے کم و کاست رکھ دیئے جاتے اور کچھ چھپا کر نہ رکھا جاتا۔ فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے تھے نہ کہ کسی کے رعب و اثر' یا کسی کے مفاد کی پاسداری' یا کسی جتھہ بندی کی بنیاد پر۔ پھر' یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطے ہی سے نہ کرتے تھے' بلکہ براہ راست ہر روز پانچ مرتبہ نماز باجماعت میں' ہر ہفتے ایک دفعہ جمعہ کے اجتماع میں' ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں ان کو قوم سے اور قوم کو ان سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ان کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب و دربان کے بغیر ان کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے اور ہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ ان تمام مواقع پر ہر شخص کو انہیں ٹوکنے' ان پر تنقید کرنے اور ان سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی اور اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت ہی نہ دیتے تھے' بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے اپنی خلافت کی پہلی ہی تقریر میں' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے' علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو میری مدد کرو' اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔ حضرت عمر ؓ نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں اس رائے کا اظہار کیا کہ کسی شخص کو نکاح میں چار سو درہم سے زیادہ مہر باندھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک عورت نے انہیں وہیں ٹوک دیا کہ آپ کو ایسا حکم دینے کا حق نہیں ہے۔ قرآن' ڈھیر سا مال (قنطار) مہر میں دینے کی اجازت دیتا ہے۔ آپ اس کی حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ حضرت عمر ؓ نے فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔[1] ایک اور موقع پر بھرے مجمع میں حضرت سلمان فارسی ؓ نے ان سے محاسبہ کیا کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر' بحوالہ ابو یعلیٰ وابن المنذر' جلد اول' ص ۴۶۷۔

سب کے حصے میں ایک ایک چادر آئی ہے' آپ نے دو چادریں کیسے لے لیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پیش کر دی کہ دوسری چادر انہوں نے اپنے والد کو مستعار دی ہے۔[1] ایک دفعہ اپنی مجلس میں انہوں نے لوگوں سے پوچھا' اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کر لوں تو تم کیا کرو گے۔ حضرت بشر بن سعد نے کہا اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کر دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تب تو تم کام کے لوگ ہو۔[2] سب سے زیادہ سخت تنقیدوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سابقہ پیش آیا اور انہوں نے کبھی کسی کا منہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہ کی' بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں برسرعام اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں خوارج کی انتہائی بدزبانیوں کو بڑے ٹھنڈے دل سے برداشت کیا۔ ایک مرتبہ پانچ خارجی ان کے پاس گرفتار کر کے لائے گئے جو علی الاعلان ان کو گالیاں دے رہے تھے اور ان میں سے ایک برسرعام کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں علی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دوں گا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سب کو چھوڑ دیا اور اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کی بدزبانی کا جواب تم چاہو تو بدزبانی سے دے لو' مگر جب تک وہ عملاً کوئی باغیانہ کارروائی نہیں کرتے' محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے۔"[3]

---

[1] الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ' للمحب الطبری' جلد ۲' ص ۵۶' طبع مصر' سیرۃ عمر بن الخطاب' لابن الجوزی' ص ۱۲۷۔

[2] کنز العمال' ج ۵' ح ۲۴۱۴۔

[3] المبسوط للسرخسی' ج ۱۰' ص ۱۲۵۔

خلافت راشدہ کا یہ دور جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے' ایک روشنی کا مینار تھا جس کی طرف بعد کے تمام ادوار میں فقہاء و محدثین اور عام دین دار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی' سیاسی' اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار سمجھتے رہے۔

باب ۱۰

اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد

- اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل اور اس میں اجتہاد کا مقام
- چند اعتراضات اور ان کا جواب
- قانون سازی' شوریٰ اور اجماع
- نظام اسلامی میں نزاعی امور کے فیصلہ کا صحیح طریقہ

جنوری ۱۹۵۸ء میں لاہور میں بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ کا اجتماع منعقد ہوا تھا جس میں مغربی مستشرقین اور اسلامی دنیا کے مفکرین نے شرکت کی تھی۔ اس اجتماع کی ایک نشست میں (منعقدہ ۳۰ جنوری ۵۸ء) میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قانون سازی اور اجتہاد کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ چونکہ یہ مقالہ بھی اسلامی ریاست کے ایک اہم پہلو ------ یعنی اس میں قانون سازی کے دائرہ عمل -------- سے بحث کرتا ہے' اس لئے اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ مقالے کے اخیر میں وہ جوابات بھی شامل کئے جا رہے ہیں جو اس پر ایک "تجدد پسند" بزرگ کے اعتراضات کے سلسلہ میں مولانا مودودی نے دیئے تھے اور اس کے ساتھ ہی دوسری بحثیں بھی پیش کی جا رہی ہیں جو تعبیر قانون کے مسئلے سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

مرتب

(ا)

اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل

اور

اس میں اجتہاد کا مقام

اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل کیا ہے اور اس میں اجتہاد کا کیا مقام ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے دو باتیں واضح طور پر ہماری نگاہ میں رہیں۔

اول یہ کہ اسلام میں حاکمیت خالصتہ" اللہ تعالٰی کی تسلیم کی گئی ہے۔ قرآن عقیدہ توحید کی جو تشریح کرتا ہے اس کی رو سے خدائے وحدہ لاشریک صرف مذہبی معنوں میں معبود ہی نہیں ہے بلکہ سیاسی اور قانونی مفہوم کے لحاظ سے حاکم، مطاع، امر و نہی کا مختار اور واضع قانون بھی ہے۔ خدا کی اس قانونی حاکمیت (Legal Sovereignty) کو قرآن اتنی ہی وضاحت اور اتنے ہی زور سے پیش کرتا ہے جس کے ساتھ اس نے خدا کی مذہبی معبودیت کا عقیدہ پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کی یہ دونوں حیثیتیں اس کی الوہیت کے لازمی تقاضے ہیں جن کو ایک دوسرے سے منفک نہیں کیا جاسکتا اور ان میں سے جس کا بھی انکار کیا جائے وہ لازماً" خدا کی الوہیت کا انکار ہے۔ پھر وہ اس شبہ کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ شاید قانون خداوندی سے مراد قانون فطرت ہو۔ اس کے برعکس وہ اپنی

ساری دعوت ہی اس بنیاد پر اٹھاتا ہے کہ انسان کو اپنی اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے اس قانون شرعی کو تسلیم کرنا چاہیے جو اس نے اپنے انبیاء کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اسی قانون شرعی کو ماننے اور اس کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانے کا نام وہ "اسلام" (Surrender) رکھتا ہے اور صاف صاف الفاظ میں انسان کے اس حق کا انکار کرتا ہے کہ جن معاملات کا فیصلہ خدا اور اس کے رسولؐ نے کر دیا ہو ان میں وہ خود اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کرے:

وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا۔

(الاحزاب: ۳۶)

دوسری بات' جو اسلام میں اتنی ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ توحید الہ' یہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت توحید الہ کا عقیدہ مجرد تخیل سے ایک عملی نظام کی شکل اختیار کرتا ہے اور اسی پر اسلام کے پورے نظام زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اس عقیدے کی رو سے اللہ تعالٰی کے تمام سابق انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیمات' بہت سے اہم اضافوں کے ساتھ' اس تعلیم میں جمع ہو گئی ہیں جو محمد ﷺ نے دی ہے' اس لئے خدائی ہدایت اور تشریع کا مستند ماخذ اب صرف یہی ایک ہے' اور آئندہ کوئی مزید ہدایت اور تشریع آنے والی نہیں ہے جس کی طرف انسان کو رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ یہی محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون (Supreme Law) ہے جو حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ قانون محمد ﷺ سے ہم کو دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن جو لفظ بلفظ خداوند عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمد ﷺ کا اسوۂ حسنہ' یا آپ ﷺ کی سنت' جو قرآن کے منشاء کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ محمد ﷺ خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ

اس کے مقرر کیے ہوئے رہنما، حاکم اور معلم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانون الٰہی کی تشریح کریں، اس کا صحیح منشا سمجھائیں، اس کے منشا کے مطابق افراد کی تربیت کریں، پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں، پھر اس اصلاح شدہ معاشرے کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھلا دیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ پورا کام جو ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ ﷺ نے انجام دیا، وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے اور اسی قانون برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں "شریعت" ہے۔

قانون سازی کا دائرہ عمل

بادی النظر میں ایک آدمی ان بنیادی حقیقتوں کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس صورت میں تو ایک اسلامی ریاست میں اسلامی قانون سازی کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، کیونکہ یہاں تو قانون ساز صرف خدا ہے اور مسلمانوں کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس پیغمبر کے دیئے ہوئے قانون خداوندی کی پیروی کریں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام قانون سازی کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے خدائی قانون کی بالاتری سے محدود کرتا ہے۔ اس بالاتر قانون کے تحت اور اس کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر، انسانی قانون سازی کا دائرہ عمل کیا ہے، اس کو میں یہاں مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

تعبیر احکام

انسانی زندگی کے معاملات میں سے ایک قسم کے معاملات وہ ہیں جن میں قرآن اور سنت نے کوئی واضح اور قطعی حکم دیا ہے، یا کوئی خاص قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کوئی فقیہ، کوئی قاضی، کوئی قانون ساز ادارہ، شریعت کے

دیئے ہوئے حکم یا اس کے مقرر کئے ہوئے قاعدے کو نہیں بدل سکتا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان میں قانون سازی کے لئے کوئی مجال کار ہے ہی نہیں۔ انسانی قانون سازی کا دائرہ عمل ان معاملات میں یہ ہے کہ سب سے پہلے ٹھیک ٹھیک معلوم کیا جائے کہ حکم فی الواقع ہے کیا' پھر اس کا منشا اور مفہوم متعین کیا جائے اور یہ تحقیق کیا جائے کہ یہ حکم کن حالات اور واقعات کے لئے ہے۔ پھر عملاً" پیش آنے والے مسائل پر ان کے انطباق کی صورتیں اور مجمل احکام کی جزائی تفصیلات طے کی جائیں اور ان سب امور کے ساتھ یہ بھی مشخص کیا جائے کہ استثنائی حالات و واقعات میں ان احکام و قواعد سے ہٹ کر کام کرنے کی گنجائش کہاں کس حد تک ہے۔

قیاس

دوسری قسم کے معاملات وہ ہیں جن کے بارے میں شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے' مگر ان سے ملتے جلتے معاملات کے متعلق وہ ایک حکم دیتی ہے۔ اس دائرے میں قانون سازی کا عمل اس طرح ہو گا کہ احکام کی علتوں کو ٹھیک سمجھ کر ان تمام معاملات میں ان کو جاری کیا جائے گا جن میں وہ علتیں فی الواقع پائی جاتی ہوں اور ان تمام معاملات کو ان سے مستثنٰی ٹھہرایا جائے گا جن میں درحقیقت وہ علتیں نہ پائی جاتی ہوں۔

استنباط

ایک اور قسم ان معاملات کی ہے جن میں شریعت نے متعین احکام نہیں بلکہ کچھ جامع اصول دیئے ہیں یا شارع کا یہ منشا ظاہر کیا ہے کہ کیا چیز پسندیدہ ہے جسے فروغ دینا مطلوب ہے اور کیا چیز ناپسندیدہ ہے جسے مٹانا مطلوب ہے۔ ایسے معاملات میں قانون سازی کا کام یہ ہے کہ شریعت کے ان اصولوں کو اور شارع کے اس منشاء کو سمجھا جائے اور عملی مسائل میں ایسے قوانین بنائے جائیں جو ان اصولوں پر

مبنی ہوں اور شارع کے منشا کو پورا کرتے ہوں۔

آزادانہ قانون سازی کا دائرہ

ان کے علاوہ ایک بہت بڑی قسم ان معاملات کی ہے جن کے بارے میں شریعت بالکل خاموش ہے' نہ براہ راست ان کے متعلق کوئی حکم دیتی ہے اور نہ ان سے ملتے جلتے معاملات ہی کے متعلق کوئی ہدایت اس میں ملتی ہے کہ ان کو اس پر قیاس کیا جا سکے۔ یہ خاموشی خود اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم اعلیٰ ان میں انسان کو خود اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا حق دے رہا ہے۔ اس لئے ان میں آزادانہ قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ قانون سازی ایسی ہونی چاہئے جو اسلام کی روح اور اس کے اصول عامہ سے مطابقت رکھتی ہو' جس کا مزاج اسلام کے مجموعی مزاج سے مختلف نہ ہو' جو اسلامی زندگی کے نظام میں ٹھیک نصب ہو سکتی ہو۔

اجتہاد

قانون سازی کا یہ سارا عمل' جو اسلام کے قانونی نظام کو متحرک بناتا اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس کو نشوونما دیتا چلا جاتا ہے' ایک خالص علمی تحقیق اور عقلی کاوش ہی کے ذریعے سے انجام پا سکتا ہے اور اسی کا نام اسلامی اصطلاح میں اجتہاد ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی تو ہیں "کسی کام کی انجام دہی میں انتہائی کوشش صرف کرنا۔" مگر اصطلاحاً" اس سے مراد ہے "یہ معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کہ ایک مسئلہ زیر بحث میں اسلام کا حکم یا اس کا منشا کیا ہے۔" بعض لوگ غلطی سے اجتہاد کو بالکل آزادانہ استعمال رائے کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا شخص جو اسلامی قانون کی نوعیت سے واقف ہے' اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ اس طرح کہ ایک قانونی نظام میں کسی آزاد اجتہاد کی بھی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہاں تو اصل قانون قرآن و سنت ہے۔ انسان جو قانون سازی کر سکتے ہیں وہ لازماً" یا تو اس اصل قانون سے ماخذ ہونی چاہئے' یا پھر ان حدود کے اندر

ہونی چاہئے جن میں وہ استعمال رائے کی آزادی دیتا ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کر جو اجتہاد کیا جائے وہ نہ اسلامی اجتہاد ہے اور نہ اسلام کے قانونی نظام میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے۔

اجتہاد کے لئے ضروری اوصاف

اجتہاد کا مقصد چونکہ خدائی قانون کو انسانی قانون سے بدلنا نہیں بلکہ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور اس کی رہنمائی میں اسلام کے قانونی نظام کو زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ متحرک کرنا ہے، اس لئے کوئی صحت مندانہ اجتہاد اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے قانون سازوں میں حسب ذیل اوصاف موجود ہوں۔

۱۔ شریعت الٰہی پر ایمان، اس کے برحق ہونے کا یقین، اس کے اتباع کا مخلصانہ ارادہ، اس سے آزاد ہونے کی خواہش کا معدوم ہونا اور مقاصد، اصول اور اقدار کسی دوسرے ماخذ سے لینے کے بجائے صرف خدا کی شریعت سے لینا۔

۲۔ عربی زبان اور اس کے قواعد اور ادب سے اچھی واقفیت، کیونکہ قرآن اسی زبان میں نازل ہوا ہے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع بھی اسی زبان میں ہیں۔

۳۔ قرآن اور سنت کا علم جس سے آدمی نہ صرف جزوی احکام اور ان کے مواقع سے واقف ہو، بلکہ شریعت کے کلیات اور اس کے مقاصد کو بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ اس کو ایک طرف یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انسانی زندگی کی اصلاح کے لئے شریعت کی مجموعی اسکیم کیا ہے اور دوسری طرف یہ جاننا چاہئے کہ اس مجموعی اسکیم میں زندگی کے ہر شعبے کا کیا مقام ہے، شریعت اس کی تشکیل کن خطوط پر کرنا چاہتی ہے اور اس تشکیل میں اس کے پیش نظر کیا مصالح ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اجتہاد کے لئے قرآن و سنت کا وہ علم درکار ہے جو مغز شریعت تک پہنچتا ہو۔

۴۔ پچھلے مجتہدین امت کے کام سے واقفیت' جس کی ضرورت صرف اجتہاد کی تربیت ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ قانونی ارتقاء کے تسلسل (Continuity) کے لئے بھی ہے۔ اجتہاد کا مقصد بہرحال یہ نہیں ہے اور نہیں ہونا چاہئے کہ ہر نسل پچھلی نسلوں کی چھوڑی ہوئی تعمیر کو ڈھا کر یا متروک قرار دے کر نئے سرے سے تعمیر شروع کرے۔

۵۔ عملی زندگی کے حالات و مسائل سے واقفیت' کیونکہ انہی پر شریعت کے احکام اور اصول و قواعد کو منطبق کرنا مطلوب ہے۔

۶۔ اسلامی معیار اخلاق کے لحاظ سے عمدہ سیرت و کردار' کیونکہ اس کے بغیر کسی اجتہاد پر لوگوں کا اعتماد نہیں ہو سکتا اور نہ اس قانون کے لئے عوام میں کوئی جذبہ احترام پیدا ہو سکتا ہے جو غیر صالح لوگوں کے اجتہاد سے بنا ہو۔

ان اوصاف کے بیان سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ہر اجتہاد کرنے والے کو پہلے یہ ثبوت پیش کرنا چاہئے کہ اس میں یہ اوصاف موجود ہیں۔ بلکہ ان سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اجتہاد کے ذریعے سے اسلامی قانون کا نشوونما اگر صحیح خطوط پر ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ قانونی تعلیم و تربیت کا نظام ایسے اوصاف کے اہل علم تیار کرنے لگے۔ اس کے بغیر جو قانون سازی کی جائے گی وہ نہ اسلامی قانون کے نظام میں جذب ہو سکے گی اور نہ مسلم سوسائٹی اس کو ایک خوش گوار غذا کی طرح ہضم کر سکے گی۔

اجتہاد کا صحیح طریقہ

اجتہاد' اور اس کی بنا پر ہونے والی قانون سازی کے مقبول ہونے کا انحصار جس طرح اس بات پر ہے کہ اجتہاد کرنے والوں میں اس کی اہلیت ہو' اس طرح اس امر پر بھی ہے کہ یہ اجتہاد صحیح طریقے سے کیا جائے۔ مجتہد خواہ تعبیر احکام کر رہا ہو یا قیاس و استنباط' بہرحال اسے اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور سنت ہی پر رکھنی

چاہئے۔ بلکہ مباحات کے دائرے میں آزادانہ قانون سازی کرتے ہوئے بھی اسے اس بات پر دلیل لانی چاہئے کہ قرآن و سنت نے واقعی فلاں معاملے میں کوئی حکم یا قاعدہ مقرر نہیں کیا ہے اور نہ قیاس ہی کے لئے کوئی بنیاد فراہم کی ہے۔ پھر قرآن و سنت سے جو استدلال کیا جائے وہ لازماً" ان طریقوں پر ہونا چاہئے جو اہل علم میں مسلم ہیں۔ قرآن سے استدلال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک آیت کے وہ معنی لئے جائیں جن کے لئے عربی زبان کی لغت' قواعد اور معروف استعمالات میں گنجائش ہو' جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے لگتے ہوئے ہوں' جو اسی موضوع کے متعلق قرآن کے دوسرے بیانات سے متناقض نہ ہوں اور جن کی تائید سنت کی قولی اور عملی تشریحات سے بھی ملتی ہو' یا کم از کم یہ کہ سنت ان معنوں کے خلاف نہ ہو۔ سنت سے استدلال کرنے میں زبان اور اس کے قواعد اور سیاق و سباق کی رعایت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن روایات سے کسی مسئلے میں سند لائی جا رہی ہو وہ قواعد علم روایت کے لحاظ سے معتبر ہوں۔ اس موضوع سے متعلق دوسری معتبر روایات کو بھی نگاہ میں رکھا گیا ہو' اور کسی ایک روایت سے کوئی ایسا نتیجہ نہ نکال لیا گیا ہو جو مستند ذرائع سے ثابت شدہ سنت کے خلاف پڑتا ہو۔ ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھے بغیر من مانی تاویلات سے جو اجتہاد کیا جائے اسے اگر سیاسی قوت کے بل پر قانون کا مرتبہ دے بھی دیا جائے تو نہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس کو قبول کر سکتا ہے اور نہ وہ حقیقتاً اسلامی نظام قانون کا جز بن سکتا ہے۔ جو سیاسی قوت اسے نافذ کرے گی اس کے ہٹتے ہی اس کا قانون بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے گا۔

اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کیسے حاصل ہوتا ہے

کسی اجتہاد کو قانون کا مرتبہ حاصل ہونے کی متعدد صورتیں اسلامی نظام قانون میں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام امت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہو۔ دوسری یہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو جائے اور لوگ خود بخود اس

کی پیروی شروع کر دیں' جس طرح مثلاً" فقہ حنفی' شافعی' مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں نے قانون کے طور پر مان لیا۔ تیسری یہ کہ کسی اجتہاد کو کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے لے' جیسے مثلاً" عثمانی سلطنت نے فقہ حنفی کو اپنا قانون ملکی قرار دیا تھا۔ چوتھی یہ کہ سیاست میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا مجاز ہو اور وہ اجتہاد سے کوئی قانون بنائے۔ ان صورتوں کے ماسوا جتنے اجتہادات مختلف اہل علم کریں ان کا مرتبہ فتوے سے زیادہ نہیں ہے۔ رہے قاضیوں کے فیصلے تو وہ ان خاص مقدمات میں تو ضرور قانون کے طور پر نافذ ہوتے ہیں جن میں وہ کسی عدالت نے کئے ہوں اور انہیں نظائر (Precedent) کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے' لیکن صحیح معنوں میں وہ قانون نہیں ہوتے' حتیٰ کہ خلفائے راشدین کے بھی وہ فیصلے اسلام میں قانون نہیں قرار پائے جو انہوں نے قاضی کی حیثیت سے کئے تھے۔ اسلامی نظام قانون میں قضاۃ کے بنائے ہوئے قانون (Judge Made Law) کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ہے۔

---

(۴)

چند اعتراضات اور ان کا جواب

اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد کے موضوع پر میرے مقالے کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے گئے ہیں' میں یہاں ان کا جواب زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ دینے کی کوشش کروں گا۔

پہلا اعتراض اس پوزیشن پر ہے جو قرآن کے ساتھ سنت کو دی گئی ہے۔ اس کے جواب میں چند باتیں میں ترتیب وار عرض کروں گا تاکہ مسئلہ پوری طرح آپ کے سامنے واضح ہو جائے۔

۱۔ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد ﷺ نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی' ایک نیا نظام تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوا یہ دوسرے کام جو حضرت محمد ﷺ نے کئے' یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنانے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح محض ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و حجت نہیں رکھتا۔ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و حجت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے

قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

۲۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد ﷺ صرف نامہ بر نہیں تھے بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے رہبر، حاکم اور معلم بھی تھے جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہل ایمان کے لئے نمونہ قرار دیا گیا تھا۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے، وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نبی ہو اور اس کے بعد وہ محض ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آغاز اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد ﷺ کو نمونہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نہی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں، حتی کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امر واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی یہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ ماخذ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیلنج کر سکتا ہے۔ جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد ﷺ صرف تلاوت قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ان کی حیثیت نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرت ﷺ کو بطور خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضور اکرم ﷺ کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔

۳۔ سنت کو بجائے خود ماخذ قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس مسئلے سے سابقہ نہیں پیش آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں ناقابل انکار ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور

محمد ﷺ کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے' اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرز فکر' اخلاق اور اقدار' عبادات اور معاملات' نظریہ حیات اور طریق حیات کے اعتبار سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے' جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے' جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے' یہی اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو ایک سنت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لئے ہمیں اندھیرے میں ٹٹولنا پڑ رہا ہو۔ دوسری تاریخی حقیقت' جو اتنی ہی روشن ہے' یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنت ثابتہ کیا ہے اور کیا نئی چیز ان کے نظام حیات میں کسی جعلی طریقے سے داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ ان کے لئے سنت قانون کی حیثیت رکھتی تھی' اسی پر ان کی عدالتوں میں فیصلے ہوتے تھے اور ان کے گھروں سے لے کر حکومتوں تک کے معاملات چلتے تھے' اس لئے وہ اس تحقیق سے بے پروا اور لاابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانے سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسل میراث میں ملے ہیں اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔ ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لاینحل معمہ ہے جس سے وہ دوچار ہو گیا ہے۔

۳۔ بلاشبہ سنت کی تحقیق اور اس کے تعین میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں' لیکن ایسے ہی اختلافات قرآن کے بہت سے احکام

اور ارشادات کے معنی متعین کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کے لئے دلیل نہیں بن سکتے تو سنت کو چھوڑ دینے کے لئے انہیں کیسے دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اصول پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج بھی اسے ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی کسی چیز کے حکم قرآن یا حکم سنت ہونے کا دعویٰ کرے وہ اپنے قول کی دلیل دے۔ اس کا قول اگر وزنی ہو گا تو امت کے اہل علم سے یا کم از کم ان کے کسی بڑے گروہ سے اپنا سکہ منوا لے گا' اور جو بات دلیل کے اعتبار سے بے وزن ہو گی وہ بہرحال نہ چل سکے گی۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہوئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکام قرآنی کی کسی تفسیر اور سنن ثابتہ کے کسی مجموعے پر اپنے اجتماعی نظام کو قائم کیا ہے۔

دوسرا اعتراض میرے مقالے پر یہ کیا گیا ہے کہ میرے کلام میں تناقض ہے' یعنی میرا یہ قول کہ قرآن و سنت کے واضح اور قطعی احکام میں تبدیلی کا اختیار کسی کو نہیں ہے' معترض کے نزدیک میرے اس قول سے متناقض ہے کہ استثنائی حالات و واقعات میں ان احکام سے ہٹ کر کام کرنے کی گنجائش اور اس کے مواقع اجتہاد سے متعین کئے جا سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس میں کیا تناقض محسوس کیا گیا ہے۔ اضطرار اور مجبوری کی حالت میں عام قاعدے سے استثناء دنیا کے ہر قانون میں ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی ایسی رخصتوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ان مثالوں سے فقہاء نے وہ اصول متعین کئے ہیں جن کو رخصت کی حد اور اس کے مواقع متعین کرنے میں ملحوظ رکھا جانا چاہئے۔ مثلاً" الضرورات تبیح المحظورات اور المشقة تجلب التیسیر۔

تیسرا اعتراض ان سب لوگوں پر کیا گیا ہے جنہوں نے یہاں اپنے مقالات میں اجتہاد کی کچھ شرائط بیان کی ہیں۔ چونکہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں اس لئے اس کا جواب میرے ذمہ بھی ہے۔ میں عرض کروں گا کہ براہ کرم ایک دفعہ پھر ان

شرطوں پر نگاہ ڈال لیجئے جو میں نے بیان کی ہیں اور پھر بتایئے کہ آپ ان میں سے کس شرط کو ساقط کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ شرط کہ اجتہاد کرنے والوں میں شریعت کی پیروی کا مخلصانہ ارادہ پایا جاتا ہو اور وہ اس کے حدود کو توڑنے کے خواہش مند نہ ہوں؟ یا یہ شرط کہ وہ قرآن و سنت کی زبان' یعنی عربی سے واقف ہوں؟ یا یہ کہ انہوں نے قرآن و سنت کا کم از کم اس حد تک گہرا مطالعہ کیا ہو کہ وہ شریعت کے نظام کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں؟ یا یہ کہ پچھلے مجتہدین کے کئے ہوئے کام پر بھی ان کی نظر ہو؟ یا یہ کہ وہ دنیا کے معاملات اور مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں؟ یا یہ کہ وہ بدکردار اور اسلامی معیار اخلاق سے گرے ہوئے نہ ہوں؟ ان میں سے جس شرط کو بھی آپ غیر ضروری سمجھتے ہیں اس کی نشان دہی کر دیں۔ یہ کہنا کہ ساری اسلامی دنیا میں دس بارہ آدمیوں سے زیادہ ایسے نہیں مل سکتے جو ان شرائط پر پورے اترتے ہوں' میرے نزدیک دنیا بھر کے مسلمانوں کے متعلق بہت ہی بری رائے ہے۔ غالباً" ابھی تک ہمارے مخالفوں نے بھی ہم کو اتنا گرا ہوا نہیں سمجھا ہے کہ چالیس پچاس کروڑ مسلمانوں میں ان صفات کے اشخاص کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ ہو۔ تاہم اگر آپ اجتہاد کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے کھولنا چاہیں تو شوق سے کھول دیجئے' لیکن مجھے یہ بتایئے کہ جو اجتہاد بدکردار' بے علم اور مشتبہ نیت و اخلاص کے لوگ کریں گے اسے مسلمان پبلک کے حلق سے آپ کس طرح اتروائیں گے؟

(۳)

قانون سازی' شوریٰ اور اجماع

پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبے سے اسلامی قانون سازی کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دوست اپنی الجھنوں کے لئے رقم طراز ہیں:

"اسلام میں قانون سازی کی حقیقت و ماہیت اور اس کے دائرہ عمل کے تعین" میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام میں قانون سازی کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے۔ قانون اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کا کام اس پر عمل کرنا اور اسے نافذ کرنا ہے۔ دوسری طرف اب کچھ لوگوں کے نزدیک قانون سازی کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو اس بات کا بھی حق دے دیا گیا ہے کہ وہ عبادات سے متعلق نبی اکرم ﷺ کی مقرر کردہ تفصیلات تک میں ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں۔ مثلاً" وہ نماز اور روزہ کی عملی شکلوں میں بھی حذف و اضافہ کر سکتے ہیں۔

براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں کہ اسلام میں قانون سازی کے حدود اور اس کی مختلف نوعیتیں کیا کیا ہیں۔ نیز اسے بھی صاف کریں کہ خلفاء کے انفرادی اور شورائی فیصلوں اور آئمہ فقہا و مجتہدین کی آراء کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلے میں اگر شوریٰ اور اجماع کی حقیقت پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے تو مناسب ہے۔"

جواب : (۱) قانون سازی کا اصول

اسلام میں دائرہ عبادات کے اندر قانون سازی کی قطعاً" کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ عبادات کے علاوہ معاملات کے اس دائرے میں قانون سازی کی گنجائش موجود ہے جس میں کتاب و سنت خاموش ہے۔ اسلام میں قانون سازی کی بنیاد یہ اصول ہے کہ عبادات میں صرف وہی عمل کرو جو بتا دیا گیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نیا طریقہ عبادت ایجاد نہ کرو اور معاملات میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کے پابند رہو' جس چیز سے روک دیا گیا ہے اس سے رک جاؤ اور جس چیز کے بارے میں شارع (اللہ اور اس کے رسول ﷺ) نے سکوت اختیار کیا ہے اس میں تم اپنی صوابدید کے مطابق کرنے کے لئے آزاد ہو۔" امام شاطبی نے اپنی کتاب "الاعتصام" میں اس اصول کو یوں بیان کیا ہے:

> "عبادات کا حکم عادات کے حکم سے مختلف ہے۔ عادات میں قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں گویا اپنی صواب دید پر کام کرنے کا اذن دے دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے عبادات میں کوئی ایسی بات استنباط سے نہیں نکالی جا سکتی جس کی اصل شرع میں موجود نہ ہو' کیونکہ عادات کے برعکس عبادات کا سررشتہ حکم صریح اور اذن صریح سے بندھا ہوا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عادات میں فی الجملہ ہماری عقلیں راہ صواب معلوم کر سکتی ہیں اور عبادات میں ہم خود عقل سے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ اللہ سے تقرب کا راستہ کون سا ہے۔" (جلد دوم' صفحہ ۱۱۵)

(۲) قانون سازی کے چار شعبے

معاملات میں قانون سازی کے چار شعبے ہیں: -

الف۔ تعبیر' یعنی جن معاملات میں شارع نے امر یا نہی کی تصریح کی ہے ان

کے بارے میں نص کے معنی یا ان کا منشا متعین کرنا۔

ب۔ قیاس' یعنی جن معاملات میں شارع کا کوئی براہ راست حکم نہیں ہے' مگر جن سے ملتے جلتے معاملات میں حکم موجود ہے' ان میں علت حکم مشخص کر کے اس حکم کو اس بنیاد پر جاری کرنا کہ یہاں بھی وہی علت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر یہ حکم اس سے مماثل واقعہ میں دیا گیا تھا۔

ج۔ استنباط و اجتهاد' یعنی شریعت کے بیان کردہ وسیع اصولوں کو جزوی مسائل و معاملات پر منطبق کرنا اور نصوص کے اشارات' دلالتوں اور اقتضاء ات کو سمجھ کر یہ معلوم کرنا کہ شارع ہمارے زندگی کے معاملات کو کس شکل میں ڈھالتا ہے۔

د۔ جن معاملات میں شارع نے کوئی ہدایت نہیں دی ہے ان میں اسلام کے وسیع مقاصد اور مصالح کو ملحوظ رکھ کر ایسے قوانین بنانا جو ضرورت کو بھی پورا کریں اور ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعی نظام کی روح اور اس کے مزاج کے خلاف بھی نہ ہوں۔ اس چیز کے فقہاء نے "مصالح مرسلہ" اور "استحسان" وغیرہ ناموں سے موسوم کیا ہے۔ مصالح مرسلہ کے معنی ہیں "وہ عمومی مصلحتیں جن کو ہماری صوابدید پر چھوڑا گیا ہے اور استحسان سے مراد یہ ہے کہ ایک معاملے میں بظاہر قیاس تو ایک حکم لگاتا ہے مگر عظیم تر دینی مصلحتیں ایک دوسرے حکم کا تقاضا کرتی ہیں' اس لئے پہلے حکم کے بجائے دوسرے حکم کو ترجیح دے کر جاری کیا جائے۔

(۳) مصالح مرسلہ اور استحسان

تعبیر' قیاس اور استنباط کے لئے تو کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے' البتہ مصالح مرسلہ اور استحسان پر ہم کچھ مزید روشنی ڈالیں گے۔ امام شاطبی نے اپنی کتاب "الاعتصام" میں اس موضوع پر ایک مستقل باب لکھا ہے اور اس کی ایسی نفیس تشریح کی ہے جس سے بہتر اصول فقہ کی کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ اس میں وہ مفصل دلائل دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مصالح مرسلہ سے مراد قانون سازی کی بالکل کھلی چھوٹ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے' بلکہ

اس کے لئے تین شرطیں لازم ہیں:

- اول یہ کہ جو قانون اس طریقہ پر بنایا جائے وہ مقاصد شریعت کے مطابق ہو نہ کہ ان کے خلاف۔

دوم یہ کہ جب وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو عام عقلیں اس کو قبول کریں۔

تیسرے یہ کہ وہ کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے، یا کسی حقیقی مشکل کو رفع کرنے کے لئے ہو۔

(الاعتصام جلد دوم صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۴)

پھر وہ استحسان پر بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اگر بظاہر کسی دلیل کی بنا پر قیاس یہ چاہتا ہو کہ ایک معاملہ میں ایک خاص حکم لگایا جائے، مگر فقیہ کی نگاہ میں وہ حکم مصلحت کے خلاف ہو یا اس سے کوئی ایسا نقصان یا حرج لازم آتا ہو جو اسلامی نقطہ نظر سے رفع کرنے کے لائق ہے یا وہ عرف کے خلاف ہو تو اسے چھوڑ کر دوسرا مناسب حکم لگا دینا استحسان ہے۔ بہرحال استحسان کے لئے شرط یہ ہے کہ ظاہر قیاس کو چھوڑ کر خلاف قیاس حکم لگانے کے لئے کوئی قوی ترجیح ہونی چاہئے جسے معقول دلائل کے ساتھ قابل لحاظ ثابت کیا جا سکے۔ (جلد دوم، صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

(۴) عدالتی فیصلوں اور ملکی قانون کا فرق

ان چار شعبوں کے متعلق کسی مجتہد یا امام کی انفرادی رائے اور تحقیق ایک ماہرانہ رائے اور تحقیق تو ہو سکتی ہے، جس کا وزن رائے دینے والے کی علمی شخصیت کے وزن کے مطابق ہی ہو گا، مگر بہرحال وہ "قانون" نہیں بن سکتی۔ قانون بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مملکت اسلامیہ کے ارباب حل و عقد کی شوریٰ ہو اور وہ اپنے اجماع سے یا جمہوری فیصلے (یعنی اکثریت کے فیصلے) سے ایک تعبیر، ایک قیاس، ایک استنباط و اجتہاد یا ایک استحسان و مصلحت مرسلہ کو اختیار کر کے قانون کی شکل دے دیں۔ خلافت راشدہ میں قانون سازی کی یہی شکل تھی۔[۱] یہاں میں چند

مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہو گا کہ خلافت راشدہ میں قومی و ملی ضرورتیں پیش آنے پر قانون سازی کس طرح ہوتی تھی اور اس دور میں "قانون" اور عدالتی فیصلوں کے درمیان کیا فرق تھا۔

الف۔ شراب کے متعلق قرآن میں صرف حرمت کا حکم دیا گیا ہے' اس کے لئے سزا کی کوئی "حد" مقرر نہیں کی گئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں اس کے لئے کوئی خاص سزا مقرر نہیں کی گئی تھی' بلکہ آپ جس کو جیسی سزا مناسب سمجھتے تھے دے دیتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں ۴۰ کوڑوں کی سزا دی' لیکن اس کے لئے کوئی باقاعدہ قانون نہیں بنایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب شراب نوشی کی شکایات زیادہ بڑھیں تو انہوں نے صحابہ کی مجلس شوریٰ میں معاملہ پیش کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مختصر تقریر میں تجویز پیش کی کہ اس کے لئے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کر دی جائے۔ شوریٰ نے اس سے اتفاق کیا اور آئندہ کے لئے یہی قانون "اجماع" کے ساتھ بنا دیا گیا۔ (الاعتصام' جلد دوم۔ صفحہ ۱۰۱)

ب۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قانون بھی بنایا گیا کہ کاریگروں کو اگر کوئی چیز بنانے کے لئے دی جائے (مثلاً" کپڑا سینے کے لئے یا سونا زیور بنانے کے لئے) اور وہ ضائع ہو جائے تو انہیں اس کی قیمت کا تاوان دینا ہو گا۔ یہ فیصلہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس تقریر پر ہوا کہ اگرچہ کاریگر کو ایسی صورت میں بظاہر قابل الزام قرار نہیں دیا جا سکتا جب کہ چیز کے ضائع ہونے میں اس کی غفلت کا دخل نہ ہو' لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ کاریگر لوگوں کی چیزوں کی حفاظت کرنے میں غفلت برتنے لگیں گے۔ اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ضامن قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ بھی اجماع سے ہوا۔

(ایضاً" جلد دوم' صفحہ ۱۰۲)

ا۔ اس کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب۔

ج۔ حضرت عمرؓ نے اس امر کا فیصلہ کیا کہ اگر ایک آدمی کے قتل میں چند آدمیوں نے شرکت کی ہو تو سب سے قصاص لیا جائے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فیصلے کو قبول کیا ہے مگر اس کو "قانون" کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ ایک عدالتی فیصلہ تھا، شوریٰ میں اجماع سے یا جمہوری رائے سے قانون نہیں بنایا گیا تھا۔ (ایضاً" جلد دوم، صفحہ ۱۰۷)

د۔ مفقود الخبر کی بیوی اگر عدالت کی اجازت سے نکاح ثانی کر چکی ہو اور پھر اس کا سابق شوہر آ جائے تو آیا وہ پہلے شوہر کو ملے گی یا دوسرے شوہر کے پاس رہے گی؟ اس مسئلے میں خلفائے راشدین نے مختلف فیصلے کئے ہیں، مگر کسی فیصلے کو بھی "قانون" کی حیثیت حاصل نہیں ہے، کیونکہ اس مسئلے کو شوریٰ میں پیش کر کے اجماع سے یا جمہور کی رائے سے کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ (ایضاً" ج ۲۔ ص ۱۲۶)

۴۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عدالتی فیصلوں کی وہ حیثیت نہیں ہے جو انگریزی قانون میں ہے۔ انگریزی قانون میں ججوں کے فیصلوں کی نظیریں "قانون" کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں، مگر اسلام میں اگرچہ ایک جج کا وہ فیصلہ نافذ ضرور ہو گا جو اس نے کسی مقدمے میں نص کی ایک تعبیر اختیار کر کے، یا اپنے قیاس یا اجتہاد سے کیا ہو، لیکن اس کو ایک مستقل "قانون" کی حیثیت حاصل نہ ہو گی۔ بلکہ ایک ہی جج ایک مقدمہ میں ایک فیصلہ دینے کے بعد ہمیشہ کے لئے اپنے اس فیصلے کا پابند نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد اسی سے ملتے جلتے دوسرے مقدمے میں وہ دوسرا فیصلہ دے سکتا ہے اگر اس پر اپنی پچھلی رائے کی غلطی واضح ہو چکی ہو۔

۵۔ خلافت راشدہ کے بعد جب شوریٰ کا نظام درہم برہم ہو گیا تو ائمہ مجتہدین نے جو فقہ کے مختلف نظام مرتب کئے ان کو نیم قانونی حیثیت اس بنا پر حاصل ہو گئی کہ ایک علاقے کے باشندوں کی عظیم اکثریت نے کسی ایک امام کی فقہ کو قبول کر لیا۔ مثلاً" عراق میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ، یا اندلس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ،

یا مصر میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ وغیرہ۔ لیکن اس قبولیت عام نے کہیں بھی کسی فقہ کو صحیح معنوں میں "قانون" نہیں بنا دیا۔ وہ قانون جہاں بھی بنی ہے اس بنا پر بنی ہے کہ ملک کی حکومت نے اسے بطور قانون تسلیم کر لیا۔

اجماع

اجماع کی تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اجماع اس چیز کا نام ہے کہ "ایک مسئلے میں تمام اہل علم متفق ہوں اور کوئی ایک قول بھی اس کے خلاف نہ پایا جاتا ہو۔" ابن جریر طبری اور ابوبکر رازی کی اصطلاح میں اکثریت کا قول بھی "اجماع" ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ جب کسی مسئلے میں یہ کہتے ہیں کہ "ہمارے علم میں اس کے خلاف کوئی قول نہیں ہے" تو ان کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ امام موصوف کے نزدیک اس مسئلے میں اجماع ہے۔

یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ "اجماع" حجت ہے۔ یعنی نص کی جس تعبیر پر، یا جس قیاس و اجتہاد پر، یا جس قانون مصلحت پر اجماع امت ہو گیا ہو اس کی پیروی لازم ہے لیکن اختلاف جس امر میں ہے وہ اجماع کا وقوع و ثبوت ہے نہ کہ بجائے خود اجماع کا حجت ہونا۔ جہاں تک خلافت راشدہ کے دور کا تعلق ہے، چونکہ اس زمانے میں اسلامی نظام جماعت باقاعدہ قائم تھا اور شوریٰ پر نظام چل رہا تھا، اس لئے اس وقت کے اجماعی اور جمہوری فیصلے تو معلوم اور معتبر روایات سے ثابت ہیں۔ لیکن بعد کے دور میں جب نظام جماعت درہم برہم اور شوریٰ کا طریقہ ختم ہو گیا تو یہ معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا کہ کس چیز پر فی الحقیقت اجماع ہے اور کس چیز پر نہیں ہے۔ اسی بنا پر خلافت راشدہ کے دور کا اجماع تو ناقابل انکار مانا جاتا ہے، مگر بعد کے دور میں جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں مسئلے پر اجماع ہے تو محققین اس کے اس دعوے کو رد کر دیتے ہیں اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کس بات پر اجماع ہے اور کس بات پر نہیں ہے اسلامی نظام کا قیام ضروری ہے۔

عام طور پر جو یہ مشہور ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ یا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سرے سے اجماع کے وجود ہی کے منکر تھے یا کسی دوسرے امام نے اس کا انکار کیا ہے' یہ سب کچھ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر اجماع ہے' درآنحالیکہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہ ہوتا' تو یہ لوگ اس کے اس دعوے کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "جماع العلم" میں اس مسئلے پر مفصل بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ دنیائے اسلام کے پھیل جانے اور جگہ جگہ اہل علم کے منتشر ہو جانے اور نظام جماعت درہم برہم ہو جانے کے بعد اب کسی جزوی مسئلے کے متعلق یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس میں تمام علماء کے اقوال کیا ہیں۔ اس لئے جزئیات میں اب اجماع کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔ البتہ اسلام کے اصولوں اور اس کے ارکان اور بڑے بڑے مسائل کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان پر اجماع ہے' مثلاً" یہ کہ نماز کے اوقات پانچ ہیں' یا روزے کے حدود یہ ہیں وغیرہ۔ اسی بات کو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"اجماع کے معنی یہ ہیں کہ کسی حکم پر تمام علماء مسلمین متفق ہو جائیں اور جب کسی حکم پر تمام امت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی شخص کو اس سے نکلنے کا حق نہیں رہتا' کیونکہ پوری امت کبھی ضلالت پر متفق نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان میں اجماع ہے حالانکہ دراصل وہ نہیں ہوتا' بلکہ بسا اوقات دوسرا قول راجح ہوتا ہے۔"

(فتاوی ابن تیمیہ رحمہ اللہ ج ۱' صفحہ ۴۰۶)

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نص شرع کی کسی تعبیر پر' یا کسی قیاس یا استنباط پر' یا کسی تدبیر و مصلحت پر اب بھی اہل حل و

عقد کا اجماع' یا ان کی اکثریت کا فیصلہ فی الواقع ہو جائے تو وہ حجت ہو گا اور قانون قرار پائے گا۔ اس طرح کا فیصلہ اگر تمام دنیائے اسلام کے اہل حل و عقد کریں تو وہ تمام دنیائے اسلام کے لئے قانون ہو گا اور کسی ایک اسلامی مملکت کے اہل حل و عقد کریں تو وہ کم از کم اس مملکت کے لئے تو قانون ہونا چاہئے۔

(۴)

نظام اسلامی میں نزاعی امور کے فیصلہ کا صحیح طریقہ

سوال : قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یایھا الذین امنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم ج فان تنازعتم فی شیئی فردوہ الی اللّٰہ والرسول ان کنتم تومنون باللّٰہ والیوم الاخر ذالک خیر و احسن تاویلا۔[1]

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو' اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک اچھا طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں آپ نے تفہیم القرآن میں فرمایا ہے:

"وہ بات جو آیت زیر بحث میں مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ پر بھی نزاع واقع ہو گی اس میں فیصلہ کے لئے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو

---

[1] النساء۔۵۹

فیصلہ وہاں سے حاصل ہو گا اس کے سامنے سب سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کو سند اور مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے ممیز کرتی ہے۔"

آپ کی اس تشریح سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ سارے نزاعی امور میں آخری اور فیصلہ کن چیز اللہ اور اس کے رسول کے احکام ہیں۔ اس ضمن میں ایک الجھن یہ پیش آتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات میں تو یہ بالکل ممکن تھا کہ جس وقت کوئی اختلاف رائے ہوا اسی وقت رسول اکرم ﷺ کی طرف رجوع کر لیا' لیکن اب جب کہ حضور اکرم ﷺ ہمارے درمیان موجود نہیں بلکہ صرف ان کی تعلیمات ہمارے سامنے ہیں' اس وقت اگر اسلام کے کسی حکم کی تعبیر کا مسئلہ درپیش ہو تو ایک اسلامی نظام میں کس شخص یا ادارہ کو اس امر کا فیصلہ کرنے کا آخری اختیار حاصل ہو گا کہ اس باب میں منشائے شریعت کیا ہے۔ امید ہے آپ اس معاملہ میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

قرآن کی اصولی ہدایات

جواب : اس سوال میں جس الجھن کا ذکر کیا گیا ہے اس کو رفع کرنے میں قرآن' سنت' دور صحابہ کا تعامل' عقل عام اور دنیا کا معروف طریق کار' سب مل جل کر ہماری مدد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کو دیکھیے۔ وہ اس معاملہ میں تین اصولی ہدایات دیتا ہے:

اول یہ کہ فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون' اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل الذکر سے پوچھ لو۔" (النحل ۴۳۔ الانبیاء ۷) اس آیت میں "اہل الذکر" کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ "ذکر" کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں مخصوص طور پر اس سبق کے لئے استعمال ہوا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے کسی امت کو دیا ہو اور اہل الذکر صرف وہ لوگ ہیں جنہیں یہ سبق یاد ہو۔ اس لحاظ سے محض علم (Knowledge) مراد نہیں لیا جا سکتا' بلکہ اس کا اطلاق لازماً "علم کتاب و سنت"

ہی پر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ معاشرے میں مرجعیت کا مقام ان لوگوں کو حاصل ہونا چاہئے جو کتاب الٰہی کا علم رکھتے ہوں اور اس طریقے سے باخبر ہوں جس پر چلنے کی تعلیم اللہ کے رسول ﷺ نے دی ہے۔

دوم یہ کہ واذا جاءھم امر من الامن اولخوف اذا عوابہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم "اور جب کبھی امن یا خوف سے تعلق رکھنے والا کوئی اہم معاملہ ان کو پیش آتا ہے تو وہ اس کا پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اس کو رسول تک اور اپنے اولی الامر تک پہنچاتے تو اس کی کنہ جان لیتے وہ لوگ جو ان کے درمیان اس کی کنہ نکال لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" (النساء : ۸۳) اس سے معلوم ہوا کہ معاشرے کو پیش آنے والے اہم معاملات میں، خواہ وہ امن کی حالت سے تعلق رکھتے ہوں یا جنگ کی حالت سے، غیر اندیشناک نوعیت کے ہوں یا اندیشناک نوعیت کے، ان میں صرف وہی لوگ مرجع ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اولی الامر ہوں، یعنی جن پر اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو، اور جو "استنباط" کی صلاحیت رکھتے ہوں، یعنی پیش آمدہ معاملے کی حقیقت بھی معلوم کر سکتے ہوں اور کتاب اللہ و طریق رسول اللہ سے بھی دریافت کر سکتے ہوں کہ اس طرح کی صورت حال میں کیا کرنا چاہئے۔ یہ آیت اجتماعی مہمات اور معاشرے کے لئے اہمیت رکھنے والے معاملات میں عام اہل الذکر کے بجائے ان لوگوں کو مرجع قرار دیتی ہے جو اولی الامر ہوں۔ لیکن بہرحال ان کو بھی ہونا چاہئے اہل الذکر ہی میں سے، کیونکہ وہی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ جس قضیے سے ان کو سابقہ پڑا ہے اس میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی قولی و عملی ہدایات کو نگاہ میں رکھ کر صحیح رائے قائم کر سکیں۔

سوم یہ کہ امرھم شوریٰ بینھم "ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔" (الشوریٰ : ۳۸) یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا آخری فیصلہ کس طرح ہونا چاہئے۔

ان تین اصولوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو تمام نزاعات میں فردوہ الی اللہ

والرسول کا منشا پورا کرنے کی عملی صورت یہ سامنے آتی ہے کہ لوگوں کو اپنی زندگی میں عموماً جو مسائل پیش آئیں ان میں وہ "اہل الذکر" سے رجوع کریں اور وہ انہیں بتائیں کہ ان معاملات میں خدا اور رسول کا حکم کیا ہے۔ رہے مملکت اور معاشرے کے لئے اہمیت رکھنے والے مسائل' تو وہ اولی الامر کے سامنے لائے جائیں اور وہ باہمی مشاورت سے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کریں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی رو سے کیا چیز زیادہ قرین حق و صواب ہے۔

عہد رسالت ﷺ میں رفع نزاع کا طریقہ

اب دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اور حضور اکرم ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں عمل درآمد کیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں جو معاملات براہ راست آپ تک پہنچتے تھے۔ ان میں تو اللہ اور رسول ﷺ کا منشا بتانے والے اور اس کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کرنے والے آپ خود تھے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری مملکت اسلامیہ میں پھیلی ہوئی آبادی کو جو معاملات پیش آتے تھے وہ سب کے سب براہ راست حضور اکرم ﷺ ہی تک نہیں پہنچائے جاتے تھے اور نہ آپ ہی سے شخصاً ان کا فیصلہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے مملکت کے مختلف علاقوں میں آپ کی طرف سے معلمین مامور تھے جو لوگوں کو دین سکھاتے تھے اور عام لوگ اپنے روزمرہ کے معاملات میں انہی سے معلوم کرتے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے کس طریقے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے میں امیر' عامل اور قاضی مقرر تھے جو اپنے اپنے دائرہ عمل سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر معاملات کے خود فیصلے کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لئے فردوہ الی اللہ والرسول کا منشاء پورا کرنے کا جو طریقہ حضور اکرم ﷺ نے خود پسند فرمایا تھا وہ حضرت معاذ بن جبل کی مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذا الی الیمن فقال کیف تقضی' قال اقضی بما فی کتاب اللہ قال فان لم یکن فی کتاب اللہ' قال

فبسنته رسول اللّٰہ قال فان لم یکن فی سنة رسول اللّٰہ قال اجتهد رائیی۔ قال الحمد لله الذی وفق رسول رسول اللّٰہ۔

(ترمذی' ابواب الاحکام۔ ابوداؤد' کتاب الاقضیہ)

رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ ؓ بن جبل کو یمن کی طرف قاضی بنا کر روانہ کیا تو ان سے پوچھا تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا اس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ملے۔ عرض کیا پھر جو سنت رسول اللہ میں ہو۔ فرمایا اگر سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی نہ ملے۔ عرض کیا میں اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کروں گا۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا شکر ہے اس خدا کا جس نے رسول اللہ کے فرستادہ شخص کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں شوریٰ کے نظام کی بنا بھی ڈال دی تھی اور ہر ایسے معاملے میں جس کے متعلق آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص حکم نہ ملا ہو۔ آپ معاشرے کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال وہ مشاورت ہے جو آنحضور ﷺ نے اس مسئلے پر فرمائی تھی کہ لوگوں کو نماز کے اوقات پر جمع کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور جس کے نتیجے میں بالآخر اذان کا طریقہ آپ ﷺ نے مقرر فرمایا۔

خلافت راشدہ کا تعامل

قریب قریب یہی طریق کار عہد رسالت ﷺ کے بعد خلافت راشدہ میں جاری رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عہد رسالت میں حضور اکرم ﷺ خود موجود تھے اس لئے معاملات کا آخری فیصلہ آپ سے شخصاً حاصل کیا جا سکتا تھا اور بعد کے دور میں مرجع آپ کی ذات نہ رہی بلکہ وہ روایات ہو گئیں جو آپ ﷺ کی سنت کے متعلق لوگوں کے پاس محفوظ تھیں۔ اس دور میں تین ادارے الگ الگ پائے جاتے تھے

جو اپنے اپنے مقام و موقف کے لحاظ سے فردوہ الی اللہ والرسول کا منشا پورا کرتے تھے۔

۱۔ عام اہل علم جو کتاب اللہ کو جانتے تھے اور جن کے پاس رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں یا حضور اکرم ﷺ کے طریق عمل یا حضور اکرم ﷺ کی تقریر[1] کے بارے میں کوئی علم موجود تھا۔ ان سے صرف عوام الناس ہی اپنی زندگی کے معاملات میں فتوے نہیں لیتے تھے بلکہ خود خلفائے راشدین کو بھی جب کسی مسئلے کا فیصلہ کرنے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کے بارے میں کوئی حکم دیا ہے یا نہیں' تو انہی لوگوں کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ خلیفہ وقت نے علم نہ ہونے کی وجہ سے ایک مسئلے کا فیصلہ اپنی رائے سے کر دیا ہے اور بعد میں جب معلوم ہوا ہے کہ اس معاملہ میں کوئی دوسری بات حضور ﷺ سے ثابت ہے تو اس فیصلے کو بدل دیا ہے۔ ان اہل علم کی موجودگی کا فائدہ صرف یہی نہ تھا کہ فردا" فردا" وہ عوام اور اولی الامر کے لئے ایک ذریعہ علم کا کام دیتے تھے' بلکہ اس سے بڑھ کر ان کا عظیم تر فائدہ یہ تھا کہ مجموعی طور پر وہ اس بات کی ضمانت تھے کہ کوئی عدالت اور کوئی حکومت اور کوئی مجلس شوریٰ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کی مضبوط رائے عام نظام اسلامی کی پشت پناہ تھی۔ ہر غلط فیصلے کو ٹوکنے کے لئے ان کا چوکنا رہنا نظام کے صحیح چلنے کا ضامن تھا۔ کسی مسئلے میں ان کا اتفاق رائے اس بات کی دلیل تھا کہ اس مسئلہ خاص میں دین کی راہ متعین ہے جس سے ہٹ کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور ان کا اختلاف رائے یہ معنی رکھتا تھا کہ اس مسئلے میں دو یا زیادہ اقوال کی گنجائش ہے اگرچہ فیصلہ ایک ہی قول پر ہو چکا ہو۔ ان کی موجودگی میں

---

[1] تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں کوئی عمل کیا گیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کو برقرار رہنے دیا ہو

یہ ممکن نہ تھا کہ امت کے اندر کوئی بدعت قبول عام حاصل کر لے جائے' کیونکہ ہر طرف دین کے جاننے والے لوگ اس پر گرفت کرنے کے لئے موجود تھے۔

۲- قضاء یعنی عدلیہ جس کے ضابطے کی وضاحت حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کے نام اپنے ایک فرمان میں اس طرح کی ہے:

اقض ما فی کتاب اللّٰہ' فان لم یکن فی کتاب اللّٰہ فبسنۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فان لم یکن فی کتاب اللّٰہ ولا فی سنۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاقض بما قضی بہ الصالحون فان لم یکن فی کتاب اللّٰہ ولا فی سنۃ رسول اللّٰہ ولم یقض بہ الصالحون فان شئت فتقدم وان شئت فتاخر ولا اری التاخر الا خیرالک والسلام علیکم۔

(النسائی' کتاب آداب القضاۃ)

فیصلہ اس حکم پر کرو جو کتاب اللہ میں ہو' اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت پر' اگر نہ کتاب اللہ میں ہو نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں تو پھر صالحین نے جو فیصلے کئے ہوں ان کے مطابق فیصلہ کرو۔ لیکن اگر کسی معاملے کا حکم نہ کتاب اللہ میں ملتا ہو اور نہ سنت رسول اللہ میں اور نہ صالحین کے فیصلوں میں اس کے متعلق کوئی نظیر موجود ہو تو تمہیں اختیار ہے چاہے خود پیش قدمی کرو یا رک جاؤ' اور میرے نزدیک رک جانا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔[1]

---

[1] رک جانے سے دو چیزیں مراد ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ قاضی کچھ دیر اس بات کا انتظار کرے کہ کوئی دوسری عدالت پیش قدمی کر کے اس طرح کے ایک معاملے میں نظیر قائم کرتی ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ قاضی خود فیصلہ کرنے کے بجائے اس معاملہ میں اس تیسرے ادارے کی طرف رجوع کرے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

اسی ضابطے کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قد اتی علینا زمان ولسنا نقضی ولسنا ھنالک ثم ان اللہ عزوجل قدر علینا ان بلغنا ما ترون فمن عرض لہ منکم قضاء بعد الیوم فلیقض بما فی کتاب اللہ فان جاء امر لیس فی کتاب اللہ فلیقض بما قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فان جاء امر لیس فی کتاب اللہ ولا قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فلیقض بما قضی بہ الصالحون فان جاء امر لیس فی کتاب اللہ ولا قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا قضی بہ الصالحون فلیجتھد رایہ ولا یقول انی اخاف وانی اخاف فان الحلال بین والحرام بین و بین ذالک امور مشتبھات فدع ما یریبک الی ما لا یریبک۔

(النسائی‘ کتاب مذکور)

وہ زمانہ گزر چکا ہے جب ہم نہ فیصلہ کرتے تھے اور نہ ہماری یہ حیثیت تھی کہ فیصلے کریں (یعنی سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا دور) اب تقدیر الٰہی سے ہم اس حالت کو پہنچے ہیں جو تم لوگ دیکھ رہے ہو۔ پس اب تم میں سے جس کے سامنے کوئی معاملہ فیصلے کے لئے پیش ہو تو اسے چاہئے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر کوئی ایسا معاملہ آ جائے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کا فیصلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق کرے اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو صالحین نے اس کا جو فیصلہ کیا ہو اس کی پیروی کرے۔ لیکن اگر ایک معاملہ ایسا آ جائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو‘ نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں اور نہ صالحین نے اس سے پہلے کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو‘ تو اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کرے اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں‘ میں ڈرتا ہوں‘ کیونکہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح اور ان دونوں کے درمیان کچھ

امور مشتبہ ہیں' سو مشتبہ امور میں آدمی کو وہ فیصلہ کرنا چاہئے جو اس کے ضمیر کو نہ کھٹکے اور ایسا فیصلہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے جس کے متعلق خود اس کے ضمیر میں کھٹک ہو۔

یہ عدلیہ صرف عوام ہی کے باہمی نزاعات کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہ تھی بلکہ انتظامیہ (Executive) کے خلاف بھی وہ لوگوں کے دعاوی سنتی اور ان کے فیصلے کرتی تھی۔ اس کے سامنے حاضر ہونے سے نہ کوئی گورنر مستثنیٰ تھا نہ خود خلیفہ وقت۔ اسی طرح انتظامیہ کے بڑے سے بڑے شخص' حتیٰ کہ خلیفہ وقت کو بھی اور خود حکومت کو بھی اگر کسی کے خلاف کوئی ذاتی یا سرکاری دعویٰ ہوتا تھا تو اسے عدالت میں جانا ہوتا تھا اور عدالت ہی یہ طے کرتی تھی کہ خدا اور رسول کے قانون کی رو سے اس کا صحیح فیصلہ کیا ہے۔

۳۔ اولی الامر' یعنی خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ۔ یہ وہ آخری باختیار ادارہ تھا جو قرآن کی ہدایت کے مطابق باہمی مشورے سے یہ طے کرتا تھا کہ معاشرے اور مملکت کو پیش آنے والے مختلف معاملات میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے کیا حکم ثابت ہے اور کسی معاملے کا حکم کتاب و سنت میں نہیں ہے تو اس کے بارے میں کون سا طرز عمل دین کے اصول اور اس کی روح اور جماعت مسلمین کی مصلحت کے لحاظ سے اقرب الی الصواب ہے۔ اس ادارے کے بکثرت فیصلے احادیث و آثار اور فقہ کی کتابوں میں مستند ذرائع سے نقل ہوئے ہیں اور اکثر و بیشتر کے ساتھ وہ تفصیلی بحثیں بھی منقول ہوئی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت صحابہ کی مجلس میں ہوئی تھیں۔ ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ پوری سختی کے ساتھ جس قاعدہ کلیہ کی پابندی کرتا تھا وہ یہ تھا کہ ہر معاملے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے' پھر یہ معلوم کیا جائے کہ اگر اس طرح کا کوئی معاملہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں پیش آیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے اور اپنی صواب دید پر صرف اس صورت میں فیصلہ کیا جائے

جب کہ یہ دونوں ماخذ ہدایت خاموش ہوں۔ جس معاملے میں بھی اللہ کی کتاب سے کوئی آیت یا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے کوئی نظیر ان کو مل گئی ہے' اس میں کبھی انہوں نے اس سے ہٹ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ پورے دور صحابہ میں اس قاعدے کے خلاف ایک مثال بھی ہم کو نہیں ملتی۔ اگرچہ عملاً" مملکت میں آخری فیصلے کے اختیارات اولی الامر ہی کو حاصل تھے' لیکن قانوناً" وہ قرآن اور سنت رسول اللہ ﷺ کو آخری فیصلہ کن سند تسلیم کرتے تھے اور مسلم معاشرہ بھی ان کے اقتدار کی اطاعت اسی اطمینان و اعتماد کی بناء پر کرتا تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں قرآن و سنت کی پیروی سے تجاوز نہ کریں گے۔ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ وہم و گمان تک نہ تھا کہ وہ نص قرآن کے خلاف کوئی قانون بنانے یا حکم دینے کے مجاز ہیں۔ اسی طرح کسی کے حاشیہ خیال میں بھی اس تصور نے کبھی راہ نہیں پائی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے کے صاحب امر تھے اور ہم اپنے زمانے کے صاحب امر ہیں' ہم اس کے پابند نہیں ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے دور حکومت میں جو احکام دیئے ہوں ان کے نظائر کی پیروی کریں۔ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا ادارہ جس روز وجود میں آیا اسی روز خلیفہ اول نے اپنے خطبہ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ:

اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم

میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میرے لئے کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔

اس اعلان سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ خلافت کا یہ ادارہ قائم ہی اس معاہدے پر ہوا تھا کہ خلیفہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اور امت خلیفہ کی اطاعت کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں امت پر خلیفہ کی اطاعت اس شرط

کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرے گا۔ اس شرط کے فوت ہوتے ہی امت پر سے خلیفہ کی اطاعت کا فریضہ آپ سے آپ ساقط ہو جاتا تھا۔

عقل عام کا تقاضا

اس کے بعد ذرا عقل عام سے کام لے کر دیکھئے کہ قرآن مجید کی آیت زیر بحث کا منشا کیا ہے اور اس کے تقاضے عملاً کس طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت پورے مسلم معاشرے کو خطاب کر کے اسے علی الترتیب تین اطاعتوں کا ملتزم قرار دیتی ہے۔ پہلے خدا کی' پھر رسول ﷺ کی' پھر ان اولی الامر کی جو خود اس معاشرے میں سے ہوں۔ اور نزاعات کے بارے میں ہدایت کرتی ہے کہ فیصلے کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس سے آیت کا جو منشا ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے پر اصل اطاعت خدا اور رسول کی واجب ہے' اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔ نزاعِ صرف عوام کے درمیان ہی نہیں عوام اور اولی الامر کے درمیان بھی ہو سکتی ہے' اور نزاع کی تمام صورتوں میں آخری فیصلہ کن اقتدار اولی الامر کا نہیں بلکہ خدا اور رسول ﷺ کا ہے' ان کا جو حکم بھی ہو اس کے آگے عوام کو بھی سر جھکا دینا چاہیے اور اولی الامر کو بھی۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ فیصلہ کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا خود سامنے موجود ہو اور اس کے حضور مقدمہ پیش کر کے فیصلہ حاصل کیا جائے' بلکہ اس سے مراد خدا کی کتاب سے یہ معلوم کرنا ہے کہ معاملہ متنازع فیہ میں اس کا حکم کیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ذات رسول سے براہ راست رجوع کیا جائے' بلکہ لامحالہ اس کا مطلب بھی یہی ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کے قول و عمل سے ہدایت حاصل کی جائے۔ یہ بات تو خود حضور ﷺ کی زندگی میں بھی ممکن نہ تھی کہ

عدن سے لے کر تبوک تک' اور بحرین سے لے کر جدے تک ساری مملکت اسلامیہ کا ہر باشندہ اپنے ہر معاملے کا فیصلہ براہ راست حضور ﷺ ہی سے کراتا ہو۔ اس زمانے میں بھی سنت رسول ہی کو احکام کا ماخذ ہونا چاہئے تھا۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ نزاعات میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے فیصلہ حاصل کرنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ انسان ہی دیں گے' کتاب اور سنت خود تو نہیں بولیں گے۔ لیکن لامحالہ یہ انسان وہی ہونے چاہئیں جن کے پاس کتاب و سنت کا قابل اعتماد علم ہو۔ اور کتاب و سنت کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والے بہرحال نزاع کے فریقین خود نہیں ہو سکتے' ان کے سوا کوئی تیسرا غیر جانب دار شخص یا ادارہ ایسا ہونا چاہئے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اب یہ بات نزاعات کی نوعیت پر منحصر ہے کہ کس قسم کی نزاع میں فیصلہ دینے کے لئے کون موزوں ہو سکتا ہے۔ ایک قسم کی نزع ایسی ہے جس کا فیصلہ ہر ذی علم آدمی کر سکتا ہے۔ دوسری قسم کی نزاع لازماً" ایک عدالت چاہتی ہے۔ اور بعض نزاعات اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ ان کا حتمی فیصلہ اولی الامر کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مگر ان سب صورتوں میں فیصلے کا ماخذ کتاب و سنت ہی کو ہونا چاہئے۔

یہ وہ بات ہے جو عقل عام کی مدد سے آیت کے الفاظ پر غور کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ اس کے ذہن میں کوئی اینچ پینچ نہ ہو۔ اب ایک نظریہ بھی دیکھ لیجئے کہ دنیا کا معروف طریقہ اس آیت کے تجویز کردہ نظام اور اس کی عملی صورت کے سمجھنے میں ہماری کیا مدد کرتا ہے۔ دنیا میں آج قانون کی حکومت (Rule of Law) کا بڑا چرچا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انصاف کے قیام کے لئے قانون کی بالاتری ناگزیر ہے جس کے آگے بڑے اور چھوٹے سب یکساں ہوں اور جسے عامی اور حاکم اور خود حکومت پر بے لاگ طریقے سے نافذ کیا جائے۔ اس قانون کو چاہے ایک پارلیمنٹ ہی بنائے' مگر جب وہ قانون بن جائے تو جب تک

وہ قانون ہے خود پارلیمنٹ کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہئے۔ اس حاکیت قانون کے نظریے کو جہاں بھی عملی جامہ پہنایا گیا ہے وہاں لازماً" چار چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے:

ایک' ایسا معاشرہ جو قانون کا احترام کرنے والا ہو اور اس کی پیروی کا حقیقی ارادہ رکھتا ہو۔

دوسرے' معاشرے میں بکثرت ایسے لوگوں کا پایا جانا جو قانون کو جانتے ہوں' لوگوں کو قانون کی پیروی میں مدد دے سکتے ہوں۔ اور جن کا مجموعی علم اور رسوخ و اثر اس بات کا ضامن ہو کہ نہ معاشرہ قانون کی راہ سے ہٹ سکے اور نہ سیاسی اقتدار کو اس سے ہٹنے کی جرات ہو سکے۔

تیسرے' ایک بے لاگ عدلیہ جو عوام اور حاکم اور حکومت کی باہمی نزاعات میں قانون کے مطابق ٹھیک ٹھیک فیصلے کرے۔

چوتھے' ایک بلند ترین اختیارات رکھنے والا ادارہ جو معاشرے کو پیش آنے والے تمام مسائل و معاملات کا آخری حل تجویز کرے اور وہی حل معاشرے میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔

ان حقائق کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کی زیر بحث آیت دراصل اسلامی معاشرے میں قانون کی فرمانروائی ہی قائم کرتی ہے اور اس پر عمل درآمد کے لئے وہی چار چیزیں درکار ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ وہ جس قانون کی فرمانروائی قائم کرتی ہے وہ فی الواقع اس کا مستحق ہے اور دنیا میں جن قوانین کی بالاتری قائم کی جاتی ہے وہ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو بالاتر قانون قرار دیتی ہے جس کے آگے سب کو سر تسلیم خم کر دینا چاہئے اور جس کے تابع ہونے میں سب یکساں ہوں۔ اس کا مخاطب ایک ایسا معاشرہ ہے جو اس قانون پر ایمان لائے اور اپنے قلب و ضمیر کے تقاضے سے اس کی اطاعت کرے۔ اس کا منشا پورا کرنے کے

لئے ضروری ہے کہ معاشرے میں اہل الذکر کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی ہو جن کی مدد سے افراد معاشرہ اپنی زندگی کے معاملات میں ہر جگہ ہر وقت اس بالاتر قانون کی رہنمائی حاصل کرتے رہیں اور جن کے ذریعہ سے رائے عام اس نظام کی حفاظت کے لئے ہمیشہ بیدار رہے۔ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک نظام عدالت موجود ہو جو عوام ہی کے درمیان نہیں بلکہ عوام اور ان کے حاکموں کے درمیان بھی بالاتر قانون کے مطابق فیصلے کرے اور وہ اولی الامر کے ایک ایسے ادارے کی طالب بھی ہے جو خود اس بالاتر قانون کا تابع ہو اور معاشرے کی اجتماعی ضروریات کے لئے اس کی تفسیر و تعبیر اور اس کے تحت اجتہاد کے آخری اختیارات استعمال کرے۔

باب ۱۱

چند دستوری اور سیاسی مسائل

- ☐ اسلامی ریاست کے چند پہلو
- ☐ خلافت و حاکمیت
- ☐ ملکی سیاست میں عورتوں کا حصہ
- ☐ ذمیوں کے حقوق
- ☐ چند متفرق مسائل

مولانا مودودیؒ نے ان مختلف دستوری' سیاسی (نظری) مسائل پر وقتاً" فوقتاً"
روشنی ڈالی ہے جو ملک میں دستوری بحث کے دوران پیدا ہوئے۔ ان میں کچھ
مسائل کی تنقیح فسادات لاہور کی تحقیقاتی عدالت کے سامنے کی گئی تھی اور کچھ
کی تشریح تقاریر' اور اخباری بیانات میں اور کچھ کی تحریری سوال و جواب کے
ذریعہ۔ ویسے تو ان مسائل کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے چند اہم
سوالات اور ان کے جوابات کو ہم ذیل میں مرتب کرکے پیش کر رہے ہیں۔

مرتب

(۱)

اسلامی ریاست کے چند پہلو

(الف) لادینی جمہوریت، تھیاکریسی اور اسلامی ریاست

اسلامی ریاست، جس کا قیام اور فروغ ہمارا نصب العین ہے، نہ تو مغربی اصطلاح کے مطابق مذہبی حکومت (Theocracy) ہے اور نہ جمہوری حکومت (Democracy)۔ بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان یک الگ نوعیت کا نظام سیاست و تمدن ہے۔ جو ذہنی الجھنیں آج کل مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں "اسلامی ریاست" کے تصور کے متعلق پائی جاتی ہیں وہ دراصل ان مغربی اصطلاحات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں جو لازماً اپنے ساتھ مغربی تصورات اور اپنے پیچھے مغرب کی تاریخ کا ایک پورا سلسلہ بھی ان کے ذہن کے سامنے لے آتی ہیں۔ مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (Theocracy) دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے:

۱۔ خدا کی بادشاہی قانونی حاکمیت (Legal Sovereignty) کے معنی ہیں اور

۲۔ پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ جو خدا کا نمائندہ اور ترجمان بن کر خدا کی اس بادشاہی کو قانونی اور سیاسی حیثیت سے عملاً نافذ کرے۔

ان دو تصورات پر ایک تیسرے امر واقعی کا بھی وہاں اضافہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجیل کی اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی قانونی ہدایت نامہ چھوڑ کر نہیں گئے اور سینٹ پال نے شریعت کو لعنت قرار دے کر عیسائیوں کو

احکام تورات کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ اب اپنی عبادت' معاشرت' معاملات اور سیاست وغیرہ کے لئے عیسائیوں کو قوانین و احکام کی جو ضرورت پیش آئی اسے ان کے مذہبی پیشواؤں نے اپنے خود ساختہ احکام سے پورا کیا اور ان احکام کو خدائی احکام کی حیثیت سے منوایا۔ اسلام میں اس مذہبی حکومت (Theocracy) کا صرف ایک جز آیا ہے اور وہ ہے خدا کی حاکمیت کا عقیدہ۔ اس کا دوسرا جز اسلام میں قطعاً" نہیں ہے۔ رہا تیسرا جز' تو اس کے بجائے یہاں قرآن اپنے جامع اور وسیع احکام کے ساتھ موجود ہے اور اس کی تشریح کے لئے نبی اکرم ﷺ کی ایسی قولی اور عملی ہدایات موجود ہیں جن کی روایات میں سے صحیح کو غلط سے ممیز کرنے کے مستند ذرائع ہمیں حاصل ہیں۔ ان دو ماخذ سے جو کچھ ہمیں ملے صرف وہی من جانب اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی فقیہہ' امام' ولی یا عالم کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے قول فعل کو حکم خداوندی کی حیثیت سے بے چون و چرا مان لیا جائے اس صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (Theocracy) کہنا قطعاً" غلط ہے۔

دوسری طرف مغرب میں جس چیز کو جمہوری حکومت (Democracy) کہتے ہیں وہ بھی دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے۔

۱۔ عوام کی قانونی اور سیاسی حاکمیت جو عوام کی اکثریت' یا ان کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے اور

۲۔ ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش سے بننا اور بدل سکنا۔

اسلام اس کے صرف دوسرے جز کو لیتا ہے۔ رہا پہلا جزو' تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے قانونی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کرتا ہے جس کے احکام (خواہ وہ کتاب اللہ میں ہوں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں) ریاست کے لئے ناقابل تغیر و تبدل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیاسی حاکمیت کو "حاکمیت" کے بجائے

"خلافت" (یعنی اللہ، حاکم حقیقی کی نیابت) قرار دے کر ریاست کے عام مسلمان باشندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ خلافت مسلم عوام کی اکثریت یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے گی۔ اس بنیادی فرق کو دیکھتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوریت (Democracy) کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

(ب) اسلام میں قانون سازی

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام جس نوعیت کی ریاست بناتا ہے اس میں ایک مجلس قانون ساز (Legislature) کی موجودگی ضروری ہے جو مسلم عوام کے معتمد علیہ نمائندوں پر مشتمل ہو اور جن کے اجماع یا اکثریت کے فیصلے دارالاسلام میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہوں۔ اس مجلس (Legislature) کی ترکیب، اس کے کام کا ضابطہ اور اس کے ارکان کے انتخاب کا طریقہ اسلام میں مقرر نہیں کیا گیا ہے، اس لئے ہر زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے اس کی الگ شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ مگر جو باتیں اصولاً" طے کر دی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

۱- ریاست کا کام مشورے سے چلایا جائے۔

۲- فیصلے یا تو اجماع (اتفاق رائے) سے ہوں یا جمہور (اکثریت) کی رائے کے مطابق۔

۳- قرآن و سنت کے خلاف کوئی فیصلہ اجماع سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۴- قرآن و سنت کے احکام کی جس تعبیر پر اجماعی یا جمہوری فیصلہ ہو جائے وہ ملک کا قانون قرار پائے۔

۵- جن امور میں قرآن و سنت کا کوئی حکم موجود نہ ہو ان میں مسلم عوام کے نمائندے خود قانون بنا سکتے ہیں اور ان کا اجماعی یا جمہوری فیصلہ نافذ ہو گا۔

۶۔ اس امر کا کوئی موزوں انتظام ہونا چاہئے کہ افراد ریاست کے درمیان' یا حکومت اور عوام کے درمیان یا عوام اور مجلس قانون ساز کے درمیان یا حکومت کے مختلف شعبوں اور اجزاء کے درمیان جو نزاع بھی ہو اس کا فیصلہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں کیا جا سکے۔

(ج) اسلامی ریاست کیوں؟

پاکستان کو اس طرح کی ایک ریاست بنانے کے لئے ہمارا مطالبہ بہت سے معقول وجوہ پر مبنی ہے جن میں سے اہم ترین وجوہ تین ہیں۔ ایک یہ کہ یہ عین ہمارے ایمان کا تقاضا ہے اور ہم ہرگز اپنے ایمان میں مخلص نہیں ہو سکتے اگر آزادی اور اختیارات پانے کے بعد بھی ہم اس قرآن اور اس رسول کے احکام کو نافذ نہ کریں جس کے برحق ہونے پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ یہاں ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے جس میں خدا اور رسول کے احکام جاری ہوں اور اسی تمنا کے پیچھے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں اور عزتیں اور جائیدادیں قربان کیں۔ تیسرے یہ کہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم الشان اکثریت چاہتی ہے کہ ان کی قومی ریاست ایک اسلامی ریاست ہو اور اکثریت کی مرضی کو بہرحال نافذ ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کچھ تھوڑے سے لوگ ایسے ضرور ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن اور اس کے نظریات کو برحق سمجھتے ہیں اور ان کے لئے اسلامی ریاست کے تخیل سے اپنے ذہن کو مانوس کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ نیز پاکستان کی ملازمتوں میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جن کی ساری ذہنی و عملی تربیت مغربی طرز کا نظام حکومت چلانے ہی کے لئے ہوئی ہے اور انہیں اسلامی ریاست کا نظام آتے دیکھ کر طرح طرح کے خدشات لاحق ہو رہے ہیں۔ مگر ان کے لئے مناسب یہی ہے کہ جو چیز ہونی اور شدنی ہے اس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابق بنائیں جس طرح ان کے بزرگوں نے انگریزی دور کی آمد پر اپنے آپ کو نئے دور کے مطابق بنایا تھا۔

ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو جمہوریت کا بڑا شیدائی ظاہر کرتے ہیں۔ اب یہ سوچنا ان کا اپنا کام ہے کہ چند لوگوں یا خاندانوں کی سہولت کی خاطر ایک ایسی چیز کی مزاحمت کرنا کہاں تک صحیح ہے جسے باشندگان ملک کی اکثریت چاہتی ہو۔

(د) اسلامی ریاست میں ذمیوں کی حیثیت

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت کے متعلق عدالت میں جو سوالات چھیڑے گئے ہیں ان کے جوابات سلسلہ وار حسب ذیل ہیں:

(الف) اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو اسلامی اصطلاح میں "ذمی" کہا جاتا ہے۔ ذمی کوئی گالی نہیں ہے اور نہ یہ لفظ شودر اور ملیچھ کا ہم معنیٰ ہے۔ ذمہ عربی زبان میں (Guarantee) کو کہتے ہیں اور ذمی وہ شخص ہے جس کے حقوق ادا کرنے اور محفوظ رکھنے کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہو۔ اسلامی حکومت یہ ذمہ محض اپنی طرف سے یا مسلم باشندوں کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور رسول کی طرف سے لیتی ہے اور اس کی اہمیت اس درجے کی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کا قتل عام بھی کر ڈالا جائے تو ہم انتقاماً" اپنے ملک میں اس کے ہم مذہب ذمیوں کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک اسلامی حکومت میں کوئی پارلیمنٹ ان کے شرعی حقوق غصب کرنے کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔

(ب) ذمیوں کی تین قسمیں ہیں۔ اول' وہ جو کسی معاہدے کے ذریعہ سے اسلامی حکومت کے تابع ہوئے ہیں۔ دوم' وہ جو بزور شمشیر فتح ہوئے ہوں۔ سوم' وہ جو نہ مفتوح ہوں اور نہ جن سے کوئی باقاعدہ معاہدہ ہی ہوا ہو۔ پہلی قسم کے ذمیوں سے اس معاہدے کے مطابق برتاؤ کیا جائے گا جو ان سے طے کیا گیا ہو۔ دوسری قسم کے ذمیوں کو وہ حقوق دیئے جائیں گے جو شریعت میں اہل ذمہ کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ رہے تیسری قسم کے ذمی' تو انہیں بہرحال دوسری قسم والوں کے حقوق تو دیئے ہی جائیں گے' اور مزید ایسے حقوق بھی ہم ان کو دے سکتے ہیں جو اسلامی اصولوں سے نہ ٹکراتے ہوں اور جنہیں دنیا ہم اپنے حالات کے لحاظ سے

مناسب سمجھیں۔

(ج) ذمیوں کے کم سے کم حقوق جو شریعت میں مقرر کئے گئے ہیں' یہ ہیں:
مذہب کی پوری آزادی۔ مذہبی تعلیم کی اجازت۔ مذہبی لٹریچر طبع اور شائع کرنے کی اجازت۔ قانون کے حدود میں مذہبی بحث کی آزادی۔ معابد کی حفاظت۔ پرسنل لاء کی حفاظت۔ جان و مال اور عزت کی حفاظت۔ دیوانی اور فوجداری قوانین میں مسلمانوں کے ساتھ پوری مساوات۔ حکومت کے عام برتاؤ میں ذمی اور مسلم رعایا کے درمیان عدم امتیاز۔ معاشی کاروبار کے ہر میدان میں مسلمانوں کی طرح یکساں مواقع۔ حاجت مند ہونے کی صورت میں مسلمان کی طرح ذمی کا بھی بیت المال سے مدد پانے کا استحقاق۔ یہ حقوق اسلامی ریاست صرف کاغذ ہی پر نہیں دیتی۔ بلکہ وہ اپنے دین و ایمان کی رو سے عملاً انہیں ادا کرنے پر مجبور ہے قطع نظر اس سے کہ غیر مسلم ریاستیں مسلمانوں کو کاغذ پر کیا حقوق دیتی ہیں اور عملاً کیا۔

(د) ذمیوں کو صرف امصار مسلمین میں نئے معابد بنانے سے روکا گیا ہے۔ البتہ اگر ان کے پرانے معابد وہاں موجود ہوں تو ان کی حفاظت اور مرمت کر سکتے ہیں۔ امصار مسلمین سے مراد وہ شہر ہیں جو مسلمانوں نے خاص اپنے لئے آباد کئے ہوں' جیسے کوفہ اور بصرہ اور فسطاط۔ باقی رہے ملک کے دوسرے شہر اور قصبے اور دیہات' تو ان کو وہاں نئے معابد تعمیر کرنے اور پرانے معابد کی مرمت کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔

(ھ) ذمیوں پر لباس وغیرہ کے متعلق جن قیود کا ذکر بعض فقہی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ اس سے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ دراصل یہ تین قسم کی قیود تھیں جو پہلی دوسری صدی ہجری کے فقہاء نے حالات و ضروریات کے لحاظ سے عاید کی تھیں۔

پہلی قسم کی قیود وہ تھیں جن میں ذمیوں کو فوجی وردی استعمال کرنے سے روکا گیا تھا۔ مسلمانوں کو اس چیز سے اس لئے نہیں روکا گیا کہ ہر بالغ مسلمان مرد کے

لئے اس وقت فوجی خدمت لازمی تھی اور ذمی اس سے مستثنیٰ تھے۔

دوسری قسم کی قیود وہ تھیں جن میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے اور غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مشابہ بننے سے روکا گیا تھا' کیونکہ اس طرح کے تشبہ میں بہت سی قباحتیں ہیں۔ اس میں اندیشہ ہے کہ مختلف تہذیبوں کے مصنوعی اختلاط سے ایک دوغلی تہذیب پیدا ہو جائے گی۔ اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی غلبے سے مرعوب ہو کر غیر مسلموں میں وہ غلامانہ خصوصیات پیدا ہو جائیں گی جن کی وجہ سے مغلوب قوم اپنے لباس اور اپنی معاشرت میں غالب قوم کی نقل اتارنے لگتی ہے۔ اسلام اس طرح کی ذہنیت کو کسی کافر میں بھی پرورش ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسی لئے غیر مسلموں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے مذہب کی خصوصیات کو محفوظ رکھیں اور مسلمانوں کی ریس نہ کریں۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں یہ حکم ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

ان اهل الذمة یوخذون باظهار علامات یعرفون بها ولا یترکون یتشبهون بالمسلمین فی لباسهم۔ (جلد ۷۔ ص ۱۱۳)

اہل ذمہ کو ایسی علامات اور نشانیاں رکھنے کا پابند کیا جائے گا جن سے وہ پہچانے جائیں اور ان کو اپنے لباس میں مسلمانوں کے مشابہ بننے سے روکا جائے گا۔

علاوہ بریں اس میں قانونی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے لئے شراب پینا' رکھنا اور بیچنا فوج داری جرم ہے اور ذمیوں کے لئے یہ جرم نہیں ہے۔ اب اگر ایک مسلمان ذمیوں کے مشابہ لباس پہنے تو وہ پولیس کے مواخذہ سے بچ سکتا ہے' اور اگر ایک ذمی مسلمانوں کے مشابہ بن کر رہے تو وہ پولیس کی گرفت میں آ سکتا ہے۔

تیسری قسم کی قیود اس وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے عائد کی گئی تھیں۔ اس وقت سندھ سے لے کر اسپین تک بہت سے ممالک مسلمانوں کی تلوار

سے مفتوح ہوئے تھے اور قدرتی طور پر ان سب ملکوں کی آبادی میں سابق حکمران طبقوں کے ایسے کثیر التعداد لوگ موجود تھے جن میں اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینے کا دم داعیہ تھا۔ مسلمانوں نے دنیا کے دوسرے فاتحین کی طرح ان طبقوں کو تہ تیغ نہیں کیا تھا' بلکہ ذمی بنا کر محفوظ و مامون کر دیا تھا۔ مگر بہر حال سیاسی مصالح کی بنا پر ان کو کچھ نہ کچھ دبا کر رکھنا ضروری تھا' تاکہ وہ پھر سر اٹھانے کی ہمت نہ کریں۔ اس لئے ان کو اپنی سواریوں اور اپنے لباس اور دوسرے لوازم معاشرت میں وہ شان دکھانے سے روک دیا گیا جس سے ان کے دور حکمرانی کی یاد تازہ ہوتی ہو۔ اس طرح کے احکام وقتی تھے نہ کہ ابدی۔ اور یہ احکام چاہے فقہ کی کتابوں ہی میں لکھے گئے ہوں' مگر ہمیشہ کے لئے تمام اہل ذمہ پر ان کو چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔

(د) اسلامی حکومت میں کوئی غیر مسلم صدر ریاست' وزیر' سپہ سالار' قاضی اور ایسے کلیدی مناصب کا حامل نہیں بن سکتا جہاں وہ حکومت کی پالیسی میں حصہ دار ہو سکے۔ اس کی وجہ کوئی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت ایک نظریئے پر مبنی ہے اور اس میں یہ مناصب ایسے ہی شخص کو دیئے جا سکتے ہیں جو اس نظریئے کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور اس کی صحت و صداقت پر ایمان رکھتا ہو۔ اسلامی حکومت چونکہ خلوص اور ایمان داری پر قائم ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی غیر مسلم رعایا میں بھاڑے کے ٹٹوؤں کی ذہنیت (Mercenary spirit) پیدا کرنا پسند نہیں کرتی۔ اس کے برعکس وہ ان سے کہتی ہے کہ اگر تم ہمارے نظریے اور اصولوں کو صحیح سمجھتے ہو تو ان کی صداقت کا علانیہ اقرار کرو' تمہارے لئے حکمران جماعت میں شامل ہونے کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ اور اگر تم ان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو محض پیٹ اور جاہ طلبی کی خاطر اس نظام کو چلانے اور فروغ دینے کے لئے نہ آؤ جسے "عقیدتاً" تم غلط سمجھتے ہو۔

(ر) ہمارے لئے یہ سوال "قطعاً" کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ غیر مسلم حکومتیں

اپنے دائرہ اقتدار میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں اور کیا نہیں کرتیں۔ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس پر اپنے ملک میں عمل کریں گے اور دوسرے جس چیز کو حق سمجھیں اسے عمل میں لانے کے لئے وہ آزاد ہیں۔ آخر کار ہمارا اور ان کا مجموعی طرز عمل دنیا کی رائے عام کے سامنے واضح کر دے گا کہ ہم کیا ہیں اور وہ کیا۔ ہم بہرحال یہ مکاری نہیں کر سکتے کہ اپنے دستور کے صفحات پر غیر مسلموں کو سارے نمائشی حقوق دے دیں مگر عملاً ان کی وہ حالت بنا کر رکھیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی' امریکہ میں حبشیوں اور ریڈ انڈین قبائل کی اور روس میں غیر اشتراکی لوگوں کی ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا ایسی حالت میں غیر مسلم اقلیتیں اسلامی حکومت کی وفادار بن کر رہ سکیں گی' تو اس کا جواب یہ ہے کہ وفاداری اور ناوفاداری دستور کے چند لفظوں سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس مجموعی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے جو حکومت اور اکثریت اپنی زیر اثر اقلیتوں کے ساتھ عملاً اختیار کرے۔

(ہ) مرتد کی سزا اسلام میں

عدالت میں مرتد کی سزا کا مسئلہ بھی چھیڑا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں مرتد کی انتہائی سزا قتل ہے۔ اگر کوئی کہنا چاہے کہ ایسا نہ ہونا چاہیے تو یہ بات کہنے کا اسے اختیار ہے۔ لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ اسلام میں فی الواقع ایسا کوئی قانون نہیں ہے' تو وہ یا تو اسلامی قانون سے ناواقف ہے یا پھر (شماتت ہمسایہ) سے شرما کر اپنے دین کے ایک حکم پر پردہ ڈالتا ہے۔ اسلام کے اس قانون کو سمجھنے میں لوگوں کو جو الجھنیں پیش آتی ہیں ان کے کئی وجوہ ہیں۔

اول یہ کہ وہ اسلام بحیثیت مذہب اور اسلام بحیثیت ریاست کا فرق نہیں سمجھتے اور ایک کا حکم دوسرے پر چسپاں کرنے لگتے ہیں' حالاں کہ ان دونوں حیثیتوں اور ان کے احکام میں فرق ہے۔

دوم یہ کہ وہ موجودہ حالات کو نگاہ میں رکھ کر اس حکم پر غور کرتے ہیں جب کہ غیر مسلم حکومتوں ہی میں نہیں' خود مسلمانوں کی اپنی حکومتوں میں بھی غیر اسلامی

تعلیم اور غیر اسلامی تہذیب کے غلبے سے مسلمانوں کی نئی نسلوں میں بکثرت لوگ گمراہ ہو کر اٹھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر ایک صحیح اسلامی حکومت موجود ہو تو اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ان تمام اسباب کا سدباب کرے جن سے کوئی مسلمان واقعی اسلام سے غیر مطمئن اور ارتداد پر آمادہ ہو سکتا ہو۔ جہاں اسلامی حکومت اپنے حقیقی فرائض انجام دے رہی ہو وہاں تو غیر مسلموں کا کفر پر مطمئن رہنا بھی مشکل ہے' کجا کہ ایک مسلمان الٹا اسلام سے غیر مطمئن ہو جائے۔

سوم یہ کہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ مسلم سوسائٹی ہی وہ چٹان ہے جس پر اسلامی ریاست کا قصر تعمیر ہوتا ہے اور اسی چٹان کے استحکام پر ریاست کے استحکام کا پورا انحصار ہے۔ آخر دنیا میں وہ کون سی ریاست ہے جو اپنے اندر خود اپنی تخریب کے اسباب و وسائل کو پرورش کرنا یا گوارا ہی کرنا پسند کرتی ہو؟ ہم اپنی حد تک اپنی ریاست کی بنیادی چٹان کے ہر ذرے کو چٹان سے بدل و جان وابستہ رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ پھر بھی اگر کوئی ذرہ ایسا نکل آئے جو علیحدگی کو ہی ترجیح دیتا ہو تو ہم اس سے کہیں گے کہ تمہیں علیحدہ ہونا ہے تو ہمارے حدود سے باہر نکل جاؤ' ورنہ یہاں ہم تمہیں دوسرے ذروں کی پراگندگی کا سبب بننے کے لئے آزاد نہ چھوڑیں گے۔

چہارم یہ کہ وہ اس غلط فہمی میں ہیں کہ ہر قسم کے مرتد کو ہر حال میں ضرور قتل ہی کیا جائے گا۔ حالانکہ ایک جرم کی انتہائی سزا شدید ترین نوعیت جرم پر دی جاتی ہے نہ کہ مجرد جرم پر۔ ایک شخص محض عقائد کی حد تک اسلام سے منحرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوسرا شخص اسلام کو اعلانیہ چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب میں جا ملتا ہے۔ تیسرا شخص مرتد ہونے کے بعد اسلام کی مخالفت میں عملی سرگرمیاں دکھانے لگتا ہے۔ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون اس طرح کے تمام

مختلف آدمیوں کو ہر حال میں ایک ہی نگاہ سے دیکھے گا؟[1]

(و) اسلامی قانون جنگ اور غلامی

اسلامی قانون جنگ اور خصوصاً" غلامی کے مسئلے پر بھی عدالت میں کچھ سوالات کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اسلام کا قانون جنگ حقیقت میں ایک قانون ہے جس پر اسلامی ریاست میں لازماً" عمل کیا جائے گا قطع نظر اس سے کہ دوسری قومیں، جن سے ہماری جنگ ہو، اس کے مقرر کردہ قواعد اور حدود کو ملحوظ رکھیں یا نہ رکھیں۔ اس کے برعکس جس چیز کو بین الاقوامی قانونی جنگ کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں قانون نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی راضی ناموں کا ایک مجموعہ ہے جس کے قواعد اور حدود کی پابندی ہر قوم نے اس امید اور سمجھوتے پر قبول کی ہے کہ دوسری قومیں بھی جنگ میں انہیں ملحوظ رکھیں گی۔ اسلام نے ہمیں جنگ کے چند کم سے کم حدود تہذیب و اخلاق کا تو پابند کر دیا ہے جنہیں اگر دوسرے توڑ بھی دیں تو ہم بہرحال نہیں توڑ سکتے، اور ان سے زائد اگر کچھ مزید مہذب قوانین پر دوسری قومیں راضی ہوں تو ہم نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ ایسے سمجھوتے کرنے کے لئے آزاد ہیں، بلکہ ان سب سے بڑھ کر یہ ہمارا منصب ہے کہ انہیں جنگ میں مزید تہذیب اختیار کرنے کی ترغیب دیں۔ مثال کے طور پر غلامی ہی کے مسئلے کو لے لیجئے۔ اسلام نے اس کی اجازت اس حالت میں دی ہے جب کہ دشمن نہ تبادلہ اسیران جنگ پر راضی ہو اور نہ فدیے کے عوض اپنے قیدی چھڑانا اور ہمارے قیدی چھوڑنا قبول کرے۔ اس صورت میں اسلام نے قیدیوں کو جیلوں اور اجتماعی کیمپوں میں رکھ کر جبری محنت لینا پسند نہ کیا بلکہ انہیں افراد میں تقسیم کر

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لاہور۔

دینے کو ترجیح دی تاکہ ان کا مسلمانوں میں جذب ہو جانا زیادہ آسانی کے ساتھ ممکن ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں دنیا کے دوسرے ممالک بھی قیدیوں کو غلام ہی بنا کر رکھتے تھے' اور غلامی کا لفظ ہمارے اور ان کے درمیان ضرور مشترک تھا' مگر جہاں تک غلامی کی حقیقت کا تعلق ہے' اسے جس طرح اسلام نے بدلا اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ آخر وہ دنیا کی کون سی قوم ہے جس میں اس کثرت سے غلام اور غلام زادے سے امامت اور قضاء اور سپہ سالاری اور امارت و فرماں روائی کے مرتبوں پر پہنچے ہوں؟ یہ تو وہ کم سے کم تہذیب و انسانیت کی حد تھی جس پر اسلامی قانون نے ہمیں قائم کیا۔ اب اگر دنیا کی قومیں تبادلہ اسیران جنگ کا قاعدہ قبول کر چکی ہیں تو اسلام میں کوئی چیز اس کا خیر مقدم کرنے سے ہم کو نہیں روکتی۔ ہمارے لئے تو یہ خوشی کا مقام ہے کہ دنیا بالآخر اس بات پر راضی ہو گئی جس پر ہم صدیوں پہلے اسے راضی کرنا چاہتے تھے۔

(ر) اسلام اور فنون لطیفہ

یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ اسلامی حکومت میں آرٹ کا کیا حشر ہو گا اور اس سلسلہ میں تصویر' ڈرامے' موسیقی' سینما اور مجسموں کا خاص طور پر نام لیا گیا ہے۔ میں اس سوال کا یہ مختصر جواب دوں گا کہ آرٹ تو انسانی فطرت کی ایک پیدائشی امنگ ہے جسے خود خالق فطرت نے اپنے ہر کام میں ملحوظ رکھا ہے' اس لئے بجائے خود اس کے ناجائز یا ممنوع ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مگر آرٹ کے مظاہر لازماً" وہی نہیں ہیں جو اس وقت مغربی تہذیب میں پائے جاتے ہیں' بلکہ ہر تہذیب اپنے اصول اور نظریات اور رجحانات کے مطابق فطرت کی اس امنگ کا اظہار مختلف جاموں میں کرتی ہے اور دوسری تہذیبوں کے اختیار کردہ جاموں کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کیا کرتی ہے۔ آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ "آرٹ" بس اسی چیز کا نام ہے جو مغرب سے درآمد ہو رہی ہے اور اگر اس پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں تو بجائے خود آرٹ ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسلام آرٹ کے متعلق

خود اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ وہ فطرت کی اس امنگ کو بت پرستی، حسن پرستی اور شہوانیت کی راہوں پر جانے سے روکتا ہے اور اس کے ظہور کے لئے دوسرے راستے دکھاتا ہے۔ اس کی حکومت میں لازماً" اس کا اپنا ہی نظریہ فرماں روا ہو گا، مغربی تہذیب کے نظریات کی فرماں روائی بہرحال جاری نہ رہ سکے گی۔

(ح) فقہی اختلافات اسلامی ریاست کے قیام میں حائل نہیں ہیں

یہ سوال بھی چھیڑا گیا ہے کہ مسلمان فرقوں کے درمیان اعتقادی اور فقہی اختلاف کی کیا نوعیت ہے اور یہ کہ جب ان کے درمیان بنیادی امور میں بھی اتفاق نہیں ہے، حتیٰ کہ "سنت" تک شیعوں اور سینوں میں متفق علیہ نہیں ہے تو ایک اسلامی ریاست کا نظام کیسے چل سکتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں میرے نزدیک صرف اتنی تصریح کافی ہے کہ پاکستان میں ہم کو روایتی ۷۳ فرقوں سے عملاً کوئی سابقہ درپیش نہیں ہے، اور ہر نیا خیال جسے کسی شخص نے کسی اخبار یا رسالے میں پیش کیا ہوا اور کچھ منتشر لوگوں نے قبول کر لیا ہو، کوئی قابل ذکر فرقہ نہیں بنا دیتا۔ ہمارے ملک میں بالفعل صرف تین فرقے پائے جاتے ہیں۔ ۱۔ حنفی جو دیوبندیوں اور بریلویوں میں تقسیم ہونے کے باوجود فقہ میں متفق ہیں۔ ۲۔ اہل حدیث۔ ۳۔ شیعہ۔ ان تینوں فرقوں کے اختلافات عملاً ایک اسلامی ریاست کا نظام بننے اور چلنے میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرتے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ پرسنل لاء مذہبی رسوم و عبادات اور مذہبی تعلیم کی حد تک ہر فرقے کا مسلک دوسرے فرقے کی مداخلت سے محفوظ رہے گا اور ملک کا انتظام ان قواعد اور قوانین کے مطابق چلے گا جو پارلیمنٹ کی اکثریت طے کرے۔ اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں "۷۳ فرقوں" کے اس افسانے کی حقیقت بھی کھول دوں جس سے خواہ مخواہ ناواقف لوگ اپنے ذہن کو بھی الجھاتے ہیں اور دوسروں کے ذہنوں میں بھی الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان فرقوں کی وہ کثیر تعداد جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے، اس کا بہت بڑا حصہ کاغذی وجود کے سوا نہ پہلے کوئی وجود رکھتا تھا اور نہ اب

رکھتا ہے۔ جس شخص نے بھی کوئی نرالا خیال پیش کیا اور اس کے سو پچاس حامی پیدا ہو گئے اسے ہمارے مصنفین نے ایک فرقہ شمار کر لیا۔ اس طرح کے فرقوں کے علاوہ ایک معتدبہ تعداد ایسے فرقوں کی بھی ہے جو گزشتہ تیرہ سو برس کی مدت میں پیدا بھی ہوئے اور مٹ بھی گئے۔ اب دنیا میں مسلمانوں کے بمشکل چھ' سات فرقے باقی ہیں جنہیں اصولی اختلافات کی بنا پر مستقل فرقہ کہا جا سکتا ہے اور جو اپنی تعداد کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں بھی بعض فرقے بہت قلیل التعداد ہیں اور یا تو خاص خاص علاقوں میں مجتمع ہیں یا دنیا بھر میں اس طرح منتشر ہیں کہ کہیں بھی ان کی کوئی قابل لحاظ آبادی نہیں ہے۔ دنیا میں بڑے مسلم فرقے صرف دو ہی ہیں۔ ایک سنی' دوسرے شیعہ۔ ان میں سے امت کا سواد اعظم سنیوں پر مشتمل ہے اور ان کے ضمنی فرقوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو حقیقتاً دوسرے سنی فرقوں سے کوئی اصولی اختلاف رکھتا ہو۔ یہ صرف مذاہب فکر (School of Thought) ہیں جن کو مناظرہ بازیوں نے خواہ مخواہ فرقوں کی شکل دے رکھی ہے۔ اگر کوئی عملی سیاست دان دنیا کے کسی ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہے تو ان اختلافات کی موجودگی کہیں بھی سد راہ نہیں ہو سکتی۔[1]

---

[1] یہاں تک کی پوری تحریر عدالتی بیان سے ماخوذ ہے جو اب اسلامک پبلی کیشنز کی شائع کردہ کتاب "قادیانی مسئلہ ۔ اور اس کے اخلاقی' تمدنی اور سیاسی پہلو" کا ایک جزو ہے۔ مرتب

(۲)

خلافت و حاکمیت

(الف) اسلامی ریاست اور خلافت کے متعلق چند سوالات[1]

(یہ ایک سوالنامہ ہے جو جرمنی سے ایک طالب علم نے اسلامی ریاست اور خلافت کے بعض مسائل کی تحقیق کے لئے بھیجا ہے۔ اصل سوالات انگریزی میں ہیں۔ ذیل میں ہم ان کا ترجمہ دے رہے ہیں:

۱۔ کیا اسلامی ریاست کے سربراہ کے لئے صرف خلیفہ کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے؟

۲۔ کیا اموی خلفاء صحیح معنوں میں خلفاء کہلائے جانے کے مستحق ہیں؟

۳۔ خلفائے بنو عباس خصوصاً" المامون کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۴۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ' حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کی نظر میں ۶۸۰ء میں ملت اسلامیہ کا اصل رہنما کون تھا؟ حسین یا یزید؟

۵۔ کیا اسلامی ریاست میں خروج ایک نیکی کا کام قرار پا سکتا ہے؟

۶۔ اگر خروج کرنے والے مساجد یا دوسرے مقدس مقامات (حرم اور کعبہ) میں پناہ گزیں ہوں تو ایسی صورت میں اسلامی ریاست کا ایسے لوگوں کے ساتھ کیا طرز عمل ہونا چاہئے؟

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن۔ جلد ۵۲ عدد ۲ بابت مئی ۱۹۵۹ء۔ مرتب

۷۔ وہ ایسے کون سے ٹیکس ہیں جو ایک اسلامی ریاست اپنے شہریوں سے ازروئے قرآن و سنت وصول کرنے کی مجاز ہے؟

۸۔ کیا کوئی خلیفہ ایسا کام بھی کر سکتا ہے جو سابق خلفاء کے طرز عمل سے مختلف ہو؟

۹۔ حجاج بن یوسف کو بحیثیت گورنر اور منتظم آپ کیا حیثیت دیتے ہیں؟

۱۰۔ کیا اسلامی ریاست اس بات کا استحقاق رکھتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں پر ایسے ٹیکس عائد کرے جو نہ تو قرآن و سنت میں مذکور ہوں اور نہ ہی ان کی کوئی نظیر سابق خلفاء کے ہاں ملتی ہو؟

جواب : آپ کے ارسال کردہ سوالات کے مفصل جوابات لکھنے کے لئے تو فرصت درکار ہے جو مجھے میسر نہیں۔ البتہ مختصر جوابات حاضر ہیں:

۱۔ اسلامی ریاست کے رئیس یا صدر کے لئے "خلیفہ" کا لفظ کوئی لازمی اصطلاح نہیں ہے۔ امیر' امام' سلطان وغیرہ الفاظ بھی حدیث' فقہ' کلام اور اسلامی تاریخ میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مگر اصولاً" جو چیز ضروری ہے وہ یہ کہ ریاست کی بنیاد نظریہ خلافت پر قائم ہو۔ ایک صحیح اسلامی ریاست نہ تو بادشاہی یا آمریت ہو سکتی ہے اور نہ ایسی جمہوریت جو حاکمیت عوام (Popular Sovereignty) کے نظریے پر مبنی ہو۔ اس کے برعکس صرف وہی ریاست حقیقت میں اسلامی ہو سکتی ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم کرلے' خدا اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت کو قانون برتر اور اولین ماخذ قوانین مانے' اور حدود اللہ کے اندر رہ کر کام کرنے کی پابند ہو۔ اس ریاست میں اقتدار کی اصل غرض خدا کے احکام کا اجراء اور اس کی رضا کے مطابق برائیوں کا استیصال اور بھلائیوں کا ارتقاء ہے۔ اس ریاست کا اقتدار' اقتدار اعلیٰ نہیں ہے بلکہ خدا کی نیابت و امانت ہے۔ یہی معنی ہیں خلافت کے۔

۲۔ اموی فرماں رواؤں کی حکومت حقیقت میں خلافت نہ تھی۔ اگرچہ ان کی

حکومت میں قانون اسلام ہی کا تھا' لیکن دستور (Constitution) کے بہت سے اسلامی اصولوں کو انہوں نے توڑ دیا تھا۔ نیز ان کی حکومت اپنی روح میں اسلام کی روح سے بہت ہٹی ہوئی تھی۔ اس فرق کو ان کی حکومت کے آغاز ہی میں محسوس کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس حکومت کے بانی حضرت امیر معاویہؓ کا اپنا قول یہ تھا کہ انا اول الملوک (میں سب سے پہلا بادشاہ ہوں) اور جس وقت حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کیا اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمان نے اٹھ کر برملا کہا کہ "یہ تو قیصریت ہے کہ جب قیصر مرا تو اس کا بیٹا قیصر ہو گیا۔"

۳۔ اصولی حیثیت سے خلافت عباسیہ کی پوزیشن بھی وہی ہے جو خلافت بنی امیہ کی ہے۔ فرق بس اتنا تھا کہ خلفائے بنی امیہ دین کے معاملہ میں بے پروا (Indifferent) تھے اور اس کے برعکس خلفائے بنی عباس نے اپنی مذہبی خلافت اور روحانی سیاست کا سکہ بٹھانے کے لئے دین کے معاملہ میں ایجابی طور پر دلچسپی لی۔ لیکن ان کی یہ دلچسپی اکثر دین کے لئے مضر ہی ثابت ہوئی۔ مثلاً" مامون کی دلچسپی نے جو شکل اختیار کی وہ یہ کہ اس نے ایک فلسفیانہ مسئلے کو جو دین کا مسئلہ نہ تھا' خواہ مخواہ دین کا ایک عقیدہ بنایا اور پھر حکومت کی طاقت سے زبردستی اس کو تسلیم کرانے کے لئے ظلم و ستم کیا۔

۴۔ جس دور کے متعلق یہ سوال کیا گیا ہے وہ حقیقت میں فتنے کا دور تھا۔ مسلمان اس وقت سخت انتشار ذہنی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس وقت عملاً مسلمانوں کا حقیقی لیڈر کون تھا۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ یزید کا سیاسی اثر جو کچھ بھی تھا صرف اس بنا پر تھا کہ اس کے پاس طاقت تھی اور اس کے والد نے ایک مضبوط سلطنت قائم کرنے کے بعد اسے اپنا ولی عہد بنا دیا تھا۔ یہ بات اگر نہ ہوتی اور یزید عام مسلمانوں کی صف میں شامل ہوتا تو شاید وہ آخری شخص ہوتا جس پر لیڈر شپ کے لئے مسلمانوں کی نگاہ انتخاب پڑ سکتی۔ اس کے برعکس حسین ابن علیؓ اس وقت امت کے نمایاں ترین آدمی تھے اور ایک آزادانہ

انتخاب میں اغلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ ووٹ ان کے حق ہی میں پڑتے۔

۵۔ ظالم امراء کے مقابلے میں خروج ایسی صورت میں نہ صرف جائز بلکہ فرض ہو جاتا ہے جب کہ ان کو ہٹا کر ایک صالح و عادل حکومت کرنے کا امکان ہو۔ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ کا مسلک بہت واضح ہے جسے ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں اور الموفق المکی نے مناقب ابوحنیفہ میں نقل کیا ہے۔ اس کے برعکس ایک حکومت عادلہ کے خلاف خروج بہت بڑا گناہ ہے اور تمام اہل ایمان پر لازم ہے کہ ایسے خروج کو دبا دینے میں حکومت کی تائید کریں۔ بین بین حالت میں، جب کہ حکومت عادل نہ ہو مگر صالح انقلاب کے بھی امکانات واضح نہ ہوں، پوزیشن مشتبہ ہے اور آئمہ و فقہاء نے اس معاملے میں مختلف طرز عمل اختیار کیے ہیں۔ بعض نے صرف کلمہ حق کہنے پر اکتفا کیا مگر خروج کو ناجائز سمجھا۔ بعض نے خروج کیا اور جام شہادت نوش کرنے کو ترجیح دی اور بعض نے بامید اصلاح تعاون بھی کیا۔

۶۔ حکومت عادلہ کے مقابلہ میں جو لوگ خروج کریں اور وہ اگر مساجد میں پناہ لیں تو ان کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ وہاں سے گولہ باری کریں تو جوابی گولہ باری بھی کی جا سکتی ہے۔ رہا حرم میں ان کا پناہ لینا تو اس صورت میں صرف محاصرہ کر کے اس حد تک تنگ کیا جا سکتا ہے کہ بالآخر باغی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ حرم میں قتل و خون کرنا یا حرم پر سنگ باری یا گولہ باری کرنا درست نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ایک ظالم حکومت کا وجود خود گناہ ہے اور اپنے قیام و بقا کے لئے اس کی کوشش بھی گناہ میں اضافے کے سوا کچھ نہیں۔

۷۔ قرآن و سنت نے ٹیکسوں کا کوئی نظام تجویز نہیں کیا ہے بلکہ مسلمانوں پر زکوۃ بطور عبادت اور غیر مسلموں پر جزیہ (بطور علامت اطاعت) لازم کرنے کے بعد یہ بات حکومت کی صوابدید پر چھوڑی ہے کہ جیسی ملک کی ضروریات ہوں ان کے مطابق باشندوں پر ٹیکس عائد کریں۔ خراج اور محاصل درآمد و برآمد اس کی ایک مثال ہیں جنہیں قرآن و سنت میں شرعاً" مقرر نہیں کیا گیا تھا اور حکومت

اسلامی نے اپنی صوابدید کے مطابق انہیں خود مقرر کیا۔ اس معاملہ میں اصل معیار ملک کی حقیقی ضروریات ہیں۔ اگر کوئی فرمانروا اپنے تصرف میں لانے کے لئے ٹیکس وصول کرے تو حرام ہے اور ملک کی حقیقی ضروریات پر صرف کرنے کے لئے لوگوں کی رضامندی سے ان پر عائد کرے تو حلال ہے۔

۸- جی ہاں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود اپنے کئے ہوئے سابق فیصلوں کو بھی بدل سکتا ہے۔

۹- حجاج بن یوسف دنیوی سیاست کے نقطہ نظر سے بڑا لائق اور دینی نقطہ نظر سے سخت ظالم حاکم تھا۔

۱۰- جی ہاں' ان شرائط کے ساتھ جو نمبر ۷ میں بیان ہوئی ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۲ مئی ۱۹۵۹ء)

(ب) الخلافت یا الحکومت[1]

سوال : اگر بیسویں صدی میں بھی اسلام قابل نفاذ ہے تو موجودہ رجحان و نظریات کی جگہ لینے میں جو مشکلات یا موانع درپیش ہوں گے ان کا بہترین حل ابن خلدون کے ہر دو نظریہ حکومت و ریاست یعنی الخلافت یا الحکومت کس سے ممکن ہے؟

جواب : اس زمانے میں اسلامی نظام کو جو چیز روک رہی ہے اور جو رجحانات اور نظریات اس کے راستے میں سد راہ ہیں ان کا اگر تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کے طویل سیاسی غلبہ نے پیدا کیا ہے۔ مغربی قومیں جب ہمارے ملکوں پر مسلط ہوئیں تو انہوں نے ہمارے قانون کو ہٹا کر اپنا قانون ملک میں رائج کیا۔ ہمارے نظام تعلیم کو معطل کر کے اپنا

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن جلد ۵۷۔ عدد ۱۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء۔ مرتب

نظام تعلیم رائج کیا۔ تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں سے ان سب لوگوں کو برطرف کیا جو ہمارے تعلیمی نظام کی پیداوار تھے اور ہر ملازمت ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دی جو ان کے قائم کردہ نظام تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے تھے۔ معاشی زندگی میں بھی اپنے ادارے اور طور طریقے رائج کئے اور معیشت کا میدان بھی رفتہ رفتہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو گیا جنہوں نے مغربی تہذیب و تعلیم کو اختیار کیا تھا۔ اس طریقہ سے انہوں نے ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن اور اس کے اصولوں اور نظریات سے انحراف کرنے والی ایک نسل خود ہمارے اندر پیدا کر دی جو اسلام اور اس کی تاریخ' اس کی تعلیمات اور اس کی روایات' ہر چیز سے علمی طور پر بھی بیگانہ ہے اور اپنے رجحانات کے اعتبار سے بھی بیگانہ۔ یہی وہ چیز ہے جو دراصل ہمارے اسلام کی طرف پلٹنے میں مانع ہے اور یہی اس غلط فہمی کا موجب بھی ہے کہ اسلام اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ساری تعلیم اور تربیت غیر اسلامی طریقے پر دی گئی ہو وہ آخر اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں کہ اسلام قابل عمل نہیں ہے' کیونکہ نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ جس نظام زندگی کے لئے وہ تیار کئے گئے ہیں اسی کو وہ قابل عمل تصور کر سکتے ہیں۔ اب لامحالہ ہمارے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہم من حیث القوم کافر ہو جانے پر تیار ہو جائیں اور خواہ مخواہ اسلام کا نام لے کر دنیا کو دھوکا دینا چھوڑ دیں۔ یا پھر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ (منافقانہ طریق سے نہیں) اپنے موجودہ نظام تعلیم کا جائزہ لیں اور اس کا پورے طریقہ سے تجزیہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہم کو اسلام سے منحرف بنانے والی ہیں اور اس میں کیا تغیرات کئے جائیں جن سے ہم ایک اسلامی نظام کو چلانے کے قابل لوگ تیار کر سکیں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی کمیشن نے اس مسئلہ کی طرف کوئی اچٹتی ہوئی توجہ بھی نہیں کی۔ یہ مسئلہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہے اور جب تک ہم اسے حل نہیں کر لیں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ

کی راہ کبھی ہموار نہ کر سکیں گے۔

ابن خلدون کے کسی نظریہ کی طرف رجوع کرنے سے اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد نہیں مل سکتی، کیونکہ اس مسئلہ کی جو نوعیت اب پیدا ہوئی ہے وہ ابن خلدون کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ مغربی استعمار رخصت ہوتے ہوئے ہمارے ملکوں میں اس نسل کو حکمران بنا کر چھوڑ گیا ہے جس کو اس نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب کا دودھ پلا پلا کر اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ جسمانی حیثیت سے تو ہماری قوم کا حصہ ہے لیکن علمی اور ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے انگریزوں، فرانسیسیوں یا ولندیزیوں کا پورا جانشین ہے۔ اس طبقہ کی حکومت جو مشکلات پیدا کرتی ہے ان کو رفع کرنے کا معاملہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے جسے حل کرنا ابن خلدون کے نظریات کا کام نہیں ہے۔ اس لئے بڑے سنجیدہ غور و فکر کی اور حالات کو سمجھ کر اصلاح کے لئے نئی راہیں نکالنے کی ضرورت ہے۔

(ج) حکومت الہیہ اور پاپائیت کا اصولی فرق[1]

سوال : "رسالہ پیغام حق" میں ابو سعید بزمی صاحب نے اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"اسلامی سیاست کا ایک تصور وہ بھی ہے جسے حال ہی میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بڑے زور و شور کے ساتھ پیش کیا ہے اور جس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ تاریخی حیثیت سے یہ اصول نیا نہیں۔ یورپ میں ایک عرصہ تک تھیاکریسی (theocracy) کے نام سے اس کا چرچا رہا اور روم کے پاپائے اعظم کا اقتدار اسی تصور کا نتیجہ تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ خدا

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۶۵ھ۔ جون ۱۹۴۶ء

کوئی ناطق ادارہ نہیں' اس لئے جس شخص کو خدا کے نام پر اختیار و اقتدار مل جائے وہ بڑی آسانی سے اس کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ مولانا مودودی کے حلقہ خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تصور سیاست پاپائے اعظم کے تصور سے مختلف ہے' لیکن چونکہ وہ حکومت کو عوام کے سامنے جوابدہ قرار نہیں دیتے اور اسی بنیاد پر جمہوریت کو غلط سمجھتے ہیں اس لئے نتیجۃً" ان کا تصور پاپائے اعظم ہی کا تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔

پھر برنی صاحب اپنی طرف سے ایک حل پیش کرتے ہیں لیکن وہ بھی وجہ تسلی نہیں ہوتا۔ آپ براہ کرم ترجمان القرآن کے ذریعے سے اس غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں اور صحیح نظریہ کی توضیح کر دیں۔"

جواب : برنی صاحب نے غالباً" میرا مضمون "اسلام کا نظریہ سیاسی" ملاحظہ نہیں فرمایا ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ جو اعتراضات انہوں نے میرے مسلک پر کئے ہیں' ان کا پورا جواب اس مضمون میں موجود ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے اور پھر یہ اعتراضات کئے ہیں تو میں سوائے اس کے کہ اظہار تعجب کروں اور کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میرے اس مضمون میں یہ عبارتیں قابل ملاحظہ ہیں :

"مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے' اسلامی تھیاکریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیاکریسی سے واقف ہے' جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی تمام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو الٰہی حکومت کہنے کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کے مطابق

چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو الٰہی جمہوری حکومت (Theo-Democratic State) کے نام سے موسوم کروں گا' کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حکومت عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی' مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے' سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہو گا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہو گا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔"

پھر میں نے اوپر کی عبارت کے نیچے حاشیہ میں اس کی مزید تشریح کی ہے کہ:

"عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح علیہ السلام کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں' لٰہذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور انہیں یہ کہہ کر نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔"

کوئی شخص جو مسیحی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے واقف ہے' میرے اس اشارہ کو جو میں نے ان چند فقروں میں کیا ہے' سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف ان اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہد نامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک سیاست کا نظام چلایا جا سکے۔ مگر جب پاپاؤں نے یورپ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ تھیاکریسی قائم کی تو اس کے لئے ایک قانون شریعت بھی وضع کیا۔ جو ظاہر ہے کہ

کسی وحی الہام سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ خود ان کا گھڑا ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے جو نظام عقائد، جو مذہبی اعمال و رسوم، جو نذریں اور نیازیں، جو معاشرتی ضوابط وغیرہ تجویز کئے تھے ان میں سے کسی کی سند بھی ان کے پاس کتاب اللہ سے نہ تھی۔ اسی طرح انہوں نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی منصب داروں کو جو ایک مستقل واسطہ قرار دے دیا تھا۔ یہ بھی ان کا خود ساختہ تھا نیز انہوں نے نظام کلیسا کے کارپردازوں کے لئے جو حقوق اور اختیارات تجویز کئے تھے اور جو مذہبی ٹیکس لوگوں پر لگائے تھے ان کے لئے بھی کوئی ماخذ ان کی اپنی ہوائے نفس کے سوا نہ تھا۔ ایسے نظام کا نام چاہے انہوں نے تھیاکریسی رکھ دیا ہو، لیکن وہ فی الحقیقت تھیاکریسی نہیں تھا۔ اس کو آخر اسلام کی حکومت الٰہیہ یا شرعی حکومت سے کیا مماثلت ہو سکتی ہے جس کے لئے کتاب و سنت کی صورت میں بالکل واضح اور ناقابل حذف و ترمیم قانون موجود ہے اور جس کو چلانا کسی مخصوص مذہبی طبقے کا اجارہ نہیں ہے۔

پھر بزمی صاحب کا یہ ارشاد بالکل عجیب ہے کہ ہم خلیفہ کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو عیسائیوں میں پوپ کی حیثیت ہے اور یہ کہ ہم اسے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ اس کے جواب میں میں پھر اپنے اسی مضمون کی چند عبارتیں نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ میں نے آیت وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم[1] سے استنباط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کس کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت ہے۔"

---

[1] النور۔ ۵۵

پھر آگے چل کر میں نے لکھا ہے کہ:

"یہاں ہر شخص خلیفہ ہے' کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان' یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لئے اس شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔"

اس کے بعد میں نے پھر اسی مضمون میں دوسرے مقام پر تصریح کی ہے کہ:

"اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے' اس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے خلیفہ کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مرتکز ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد یہ فقرہ بھی میرے اسی مضمون میں موجود ہے کہ:

"امیر تنقید سے بالاتر نہ ہو گا۔ ہر عامی مسلمان اس کے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ اس کی پرائیویٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہو گا۔ وہ قابل عزل ہو گا۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہو گی اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکے گا اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہو گا۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ مجلس شوریٰ ایسی ہو گی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی مانع شرعی نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے

منتخب کیا جائے۔ ہر صورت میں عامہ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوف خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفسانیت کے ساتھ؟ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اتار لا سکتی ہے۔"

ان تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہماری تھیاکریسی کو پاپایان روم کی قائم کردہ تھیاکریسی سے مشابہ قرار دے تو بہرحال ہم اسے اس کی آزادی رائے سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ مگر یہ ضرور عرض کریں گے کہ یہ رائے علم و دلیل سے آزاد ہے۔

(د) اسلامی حکومت اور مسلم حکومت[1]

سوال : خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی جو حکومتیں مختلف زمانوں میں قائم ہوئیں، وہ اسلامی حکومتیں تھیں یا غیر اسلامی؟

جواب : درحقیقت نہ وہ پوری اسلامی تھیں نہ پوری غیر اسلامی۔ ان میں اسلامی دستور کی دو اہم چیزوں کو بدل دیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ امارت انتخابی ہو، دوسرے یہ کہ حکومت کا نظام مشورے سے چلایا جائے۔ باقی ماندہ اسلامی دستور چاہے اپنی صحیح اسپرٹ میں برقرار نہ رکھا گیا ہو، لیکن اسے منسوخ یا تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ ان حکومتوں میں قرآن و سنت ہی کو ماخذ قانون مانا جاتا تھا، عدالتوں میں اسلامی قانون ہی نافذ ہوتا تھا اور مسلمان حکمرانوں نے کبھی یہ جرات نہیں کی کہ قانون اسلام کو منسوخ کر کے اس کی جگہ انسانی ساخت کے قوانین جاری کر دیں اور اگر کبھی کسی حکمران نے اس کی جرات کی تو تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کسی نہ کسی

---

[1] (د) اور (ھ) میں دیئے ہوئے سوال و جواب اس بحث سے لئے جا رہے ہیں جو ۲۴ نومبر ۵۲ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقدہ مجلس مباحثہ میں ہوئی تھی۔ مرتب

اللہ کے بندے نے اٹھ کر اس کے خلاف جہاد عظیم کیا' یہاں تک کہ اس فتنے کا سدباب ہو کر رہا۔ ابن تیمیہ اور مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس طرح کی کوششوں کے مقابلے میں جو کچھ کیا اس پر تاریخ گواہ ہے۔

(ھ) مسئلہ خلافت اور فرقہ پرستی

سوال : کیا خلافت کا مسئلہ اس وقت آسانی سے طے ہو سکتا ہے جب کہ اسلام میں بہتر فرقے موجود ہیں؟

جواب : میں یہاں تمام دنیائے اسلام کی خلافت کے مسئلے سے بحث نہیں کر رہا ہوں' بلکہ صرف پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام تک میری گفتگو محدود ہے۔ اگر مختلف مسلمان ملکوں میں ان اصولوں پر جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں' اسلامی حکومتیں قائم ہو جائیں تو البتہ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب ان سب کی ایک فیڈریشن بن سکے اور تمام دنیائے اسلام کا ایک خلیفہ منتخب کیا جا سکے۔ رہے بہتر فرقے تو وہ صرف علم کلام کی کتابوں کے صفحات میں پائے جاتے ہیں۔ عملاً پاکستان میں تو اس وقت تین ہی فرقے موجود ہیں۔ ایک حنفی' دوسرے اہل حدیث' تیسرے شیعہ۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ان تینوں فرقوں کے علماء پہلے ہی اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں پر اتفاق کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب اس اندیشے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ فرقوں کی موجودگی اسلامی حکومت کے قیام میں مانع ہو گی۔

(۳)

ملکی سیاست میں عورتوں کا حصہ

(الف) مجالس قانون ساز میں عورتوں کی شرکت کا مسئلہ[1]

ہم سے پوچھا گیا ہے کہ آخر وہ کون سے اسلامی اصول یا احکام ہیں جو عورتوں کی رکنیت مجالس قانون ساز میں مانع ہیں؟ اور قرآن و حدیث کے وہ کون سے ارشادات ہیں جو ان مجالس کو صرف مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان مجالس کی صحیح نوعیت اچھی طرح واضح کر دیں جن کی رکنیت کے لئے عورتوں کے استحقاق پر گفتگو کی جا رہی ہے۔ ان مجالس کا نام مجالس قانون ساز رکھنے سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ ان کا کام صرف قانون بنانا ہے اور پھر یہ غلط فہمی ذہن میں رکھ کر جب آدمی دیکھتا ہے کہ عہد صحابہ میں خواتین بھی قانونی مسائل پر بحث' گفتگو' اظہار رائے' سب کچھ کرتی تھیں اور بسا اوقات خود خلفاء ان سے رائے لیتے اور اس رائے کا لحاظ کرتے تھے' تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ آج اسلامی اصولوں کا نام لے کر اس قسم کی مجالس میں عورتوں کی شرکت کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مجالس اس نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان کا کام محض قانون سازی کرنا نہیں ہے بلکہ عملاً وہی پوری ملکی سیاست کو کنٹرول کرتی ہیں' وہی وزارتیں بناتی اور توڑتی ہیں' وہی نظم و نسق کی پالیسی طے کرتی ہیں' وہی مالیات

---

[1] یہ تحریر ترجمان القرآن بابت ماہ فروری ۵۲ء سے لی جا رہی ہے۔

اور معاشیات کے مسائل طے کرتی ہیں اور انہی کے ہاتھ میں صلح وجنگ کی زمام کار ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے ان مجالس کا مقام محض ایک فقیہ اور مفتی کا مقام نہیں ہے بلکہ پوری مملکت کے "قوام" کا مقام ہے۔

اب ذرا دیکھئے' قرآن اجتماعی زندگی میں یہ مقام کس کو دیتا ہے اور کسے نہیں دیتا۔ سورہ نساء میں اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم' فالصالحات قنتت حفظت للغیب بما حفظ اللّٰہ

(آیت: ۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں' بوجہ اس فضیلت کے جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر دی ہے اور بوجہ اس کے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کے تحت۔

اس آیت میں اللہ تعالٰی صاف الفاظ میں قوامیت کا مقام مردوں کو دے رہا ہے اور صالح عورتوں کی دو خصوصیات بیان کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اطاعت شعار ہوں' دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں ان چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے۔

آپ کہیں گے یہ حکم تو خانگی معاشرت کے لئے ہے نہ کہ ملکی سیاست کے لئے' مگر یہاں اول تو مطلقاً" الرجال قوامون علی النساء کہا گیا ہے" فی البیوت کے الفاظ ارشاد نہیں ہوئے ہیں جن کو بڑھائے بغیر اس حکم کو خانگی معاشرت تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر آپ کی یہ بات مان بھی لی جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ جسے اللہ نے گھر میں قوام نہ بنایا بلکہ قنوت (اطاعت شعاری) کے مقام پر رکھا' آپ اسے تمام گھروں کے مجموعے' یعنی پوری مملکت میں قنوت کے مقام سے اٹھا کر قوامیت کے مقام پر لانا چاہتے ہیں؟ گھر کی قوامیت سے مملکت کی قوامیت تو زیادہ بڑی اور

اونچے درجے کی ذمہ داری ہے۔ اب کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوام نہ بنائے گا مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوام بنا دے گا؟

اور دیکھئے۔ قرآن صاف الفاظ میں عورت کا دائرہ عمل یہ کہہ کر معین کر دیتا ہے کہ

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجھالیۃ الاولی۔ (الاحزاب: ۳۳)

اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھہری رہو اور پچھلی جاہلیت کے سے تبرج[1] کا ارتکاب نہ کرو۔

آپ پھر فرمائیں گے کہ یہ حکم تو نبی اکرم ﷺ کے گھر کی خواتین کو دیا گیا تھا مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال مبارک میں کیا نبی اکرم ﷺ کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جس کی وجہ سے وہ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں کے لئے نا اہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے ان پر کوئی فوقیت حاصل ہے؟ پھر اگر اس سلسلے کی ساری آیات صرف اہل بیت نبوت کے لئے مخصوص ہیں تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو تبرج جاہلیت کی اجازت ہے؟ اور کیا انہیں غیر مردوں سے اس طرح کی باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے کہ ان کے دل میں طمع پیدا ہو؟ اور کیا اللہ اپنے نبی ﷺ کے گھر کے سوا ہر مسلمان گھر کو "رجس" میں آلودہ دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد حدیث کی طرف آیئے۔ یہاں ہم کو نبی اکرم ﷺ کے یہ واضح ارشادات ملتے ہیں:

اذا کان امرائکم شرارکم و اغنیائکم بخلائکم و امورکم الیٰ نسائکم فبطن الارض خیر من ظھرھا۔ (ترمذی)

---

[1] تبرج کے معنی ہیں بن سنور کر ناز و ادا کے ساتھ نکلنا۔

جب تمہارے امراء تمہارے بدترین لوگ ہوں اور جب تمہارے دولت مند بخیل ہوں اور جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے۔

عن ابی بکرۃ لما بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اھل فارس ملکوا علیھم بنت کسری قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ۔

(بخاری' احمد' نسائی' ترمذی)

ابو بکرہ سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو خبر پہنچی کہ ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ' نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کئے ہوں۔

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد الرجال قوامون علی النساء کی ٹھیک ٹھیک تفسیر بیان کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیاست و ملک داری عورت کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔ رہا یہ سوال کہ عورت کا دائرہ عمل ہے کیا' تو نبی اکرم ﷺ کے یہ ارشادات اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

والمراۃ راعیۃ علی بیت بعلھا وولدہ وھی مسؤلۃ عنھم۔ (ابو داؤد)

اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی راعیہ ہے اور وہ ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔

یہ ہے آیت وقرن فی بیوتکن کی صحیح تفسیر' اور اس کی مزید تفسیر وہ احادیث ہیں جن میں عورت کو سیاست و ملک داری سے کمتر درجہ کے خارج از بیت فرائض و واجبات سے بھی مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ الا اربعۃ: عبد مملوک' اوامراۃ او صبی او مریض۔ (ابو داؤد)

جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا حق اور واجب ہے۔ بجز چار قسم کے لوگوں کے' ایک غلام' دوسرے عورت' تیسرے بچہ' چوتھے

مریض۔

عن ام عطیة قالت نہینا عن اتباع الجنائز۔ (بخاری)

ام عطیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ہم کو جنازوں کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا تھا۔

اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطہ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں اور کوئی چیلنج کرے تو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں' مگر اول تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا ہے' دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لئے تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی تعمیل کرنے سے پہلے اور تعمیل کے لئے شرط کے طور پر' عقلی دلائل کا مطالبہ کرے۔ مسلمان کو' اگر وہ واقعی مسلمان ہے' پہلے حکم کی تعمیل کرنی چاہئے' پھر وہ اپنے دماغی اطمینان کے لئے عقلی دلائل مانگ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے پہلے عقلی حیثیت سے مطمئن کرو ورنہ میں خدا اور رسول ﷺ کا حکم نہ مانوں گا تو ہم اسے سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے' کجا کہ اس کو ایک اسلامی ریاست کے لئے دستور بنانے کا مجاز تسلیم کریں۔ تعمیل حکم کے لئے عقلی دلیل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے نہ کہ اس کے اندر۔

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھہرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ جمل میں نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اول تو یہ دلیل اصولاً" ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ جس مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی واضح ہدایت موجود ہو' اس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو' ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ مگر اس غرض کے لئے کہ ہم ان کی روشنی میں اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں' نہ اس غرض کے

لئے کہ ہم اللہ اور رسول ﷺ کی ہدایت کو چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں۔ پھر جس فعل کو اسی زمانے میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ نے غلط قرار دیا تھا اور جس پر بعد میں خود ام المومنین رضی اللہ عنہا بھی نادم ہوئیں' اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لئے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی اطلاع پاتے ہی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے ان کو جو خط لکھا تھا وہ پورا کا پورا ابن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ میں اور ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں نقل کیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمایئے کتنے پرزور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ "آپ کے دامن کو قرآن نے سمیٹ دیا ہے' آپ اسے پھیلایئے نہیں۔" اور "کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو دین میں افراط برتنے سے روکا ہے؟" اور یہ کہ آپ رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دیتیں اگر وہ آپ کو اس طرح کسی صحرا میں ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ کی طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ لیتے؟"

پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول کو یاد کیجئے کہ "عائشہؓ کے لئے ان کا گھر ان کے ہودے سے بہتر ہے۔"

اور حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول بخاری میں ملاحظہ فرما لیجئے کہ میں جنگ جمل کے فتنے میں مبتلا ہونے سے صرف اس لئے بچ گیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد یاد آ گیا کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیئے ہوں۔"

حضرت علیؓ سے بڑھ کر اس زمانے میں کون شریعت کا جاننے والا تھا؟ انہوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ آپ کا یہ اقدام حدود شریعت سے متجاوز ہے اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں۔ حضرت علیؓ کے الفاظ یہ تھے کہ

"بلاشبہ آپ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کی خاطر غضب ناک ہو کر نکلی ہیں' مگر آپ ایک ایسے کام کے پیچھے پڑی ہیں جس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی۔ عورتوں کو آخر جنگ اور اصلاح بین الناس سے کیا تعلق؟ آپ عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا دعوئی لے کر اٹھی ہیں' مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے آپ کو اس بلا میں ڈالا اور اس معصیت پر آمادہ کیا وہ آپ کے حق میں عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے زیادہ گنہ گار ہے۔"

دیکھیے' اس خط میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہؓ کے فعل کو صریحاً" خلاف شرع قرار دے رہے ہیں۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہ دے سکیں کہ جل الامر عن العتاب۔ معاملہ اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ عتاب و ملامت سے کام چل سکے۔"

پھر جنگ جمل کے خاتمے پر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ام المومنینؓ سے ملنے تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا: یا صاحبة الهودج قد امرک اللّٰه ان تقعدی فی بیتک ثم خرجت تقاتلین؟ "اے ہودے والی' اللہ نے آپ کو گھر بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے کے لیے نکل پڑیں۔" مگر اس وقت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ نہ کہہ سکیں کہ اللہ نے ہم عورتوں کو گھر بیٹھنے کا حکم نہیں دیا ہے اور ہمیں سیاست اور جنگ میں حصہ لینے کا حق ہے۔

پھر یہ بھی ثابت ہے کہ آخر کار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود اپنے اس فعل پر پچھتاتی رہیں۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں یہ روایت لائے ہیں کہ ام المومنینؓ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے شکایتاً" فرمایا "اے ابو عبدالرحمٰن تم نے کیوں نہ مجھے اس کام پر جانے سے منع کیا؟" انہوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا کہ ایک شخص (یعنی عبداللہ بن زبیر) آپ کی رائے پر حاوی ہو گیا ہے اور مجھے امید نہ تھی کہ آپ اس کے خلاف چل سکیں گی۔" اس پر ام المومنینؓ نے فرمایا "کاش تم مجھے منع کر دیتے تو میں نہ نکلتی۔"

اس کے بعد جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کے عمل میں آخر کیا دلیل باقی رہ جاتی ہے جس کے بل بوتے پر کوئی صاحب علم یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ اسلام میں عورتیں بھی سیاست اور نظم مملکت کی ذمہ داری میں شریک قرار دی گئی ہیں؟ رہے وہ لوگ جن کے لئے اصل معیار حق صرف دنیا کی غالب قوموں کا طرز عمل ہے اور جنہیں بہرحال چلنا اسی طرف ہے جس طرح انبوہ جا رہا ہو' تو انہیں کس نے کہا ہے کہ اسلام کو اپنے ساتھ ضرور لے چلیں؟ ان کا جدھر جی چاہے شوق سے جائیں' مگر کم از کم اتنی راست بازی تو ان میں ہونی چاہئے کہ جس مقتدا کے دراصل وہ پیرو ہیں اسی کا نام لیں' بلا دلیل اسلام کی طرف وہ باتیں منسوب نہ کریں جن سے خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت اور قرون مشہود لہا بالخیر کی تاریخ صاف صاف انکار کر رہی ہے۔

(ب) اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل [1]

سوال : کیا اس دور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی' معاشی و معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی جب کہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس نے تاریک ترین دور میں بھی عورت کو ایک مقام (Status) عطا کیا؟ کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے ورثہ کا حصہ لینے کا حق دیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کو اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم یا مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے ملک و قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہو گی؟ فرض کیجئے اگر اسلامی حکومت خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرت آراء سے وزارت و صدارت کے عہدوں کے لے الیکشن لڑ کر کامیاب ہو جائیں تو موجودہ بیسویں صدی

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن جلد ۵۷۔ عدد ۴۔ جنوری ۱۹۶۲ء۔

میں بھی کیا ان کو منصب اعلیٰ کا حق اسلامی احکام کی رو سے نہیں مل سکتا جب کہ بہت سی مثالیں ایسی آج موجود ہیں' مثلاً" سیلون میں وزارت عظمیٰ ایک عورت کے پاس ہے یا نیدر لینڈ میں ایک خاتون حکمران اعلیٰ ہے۔ برطانیہ پر ملکہ کی شہنشاہیت ہے۔ سفارتی حد تک جیسے عابدہ سلطانہ دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہیں اور اب بیگم رعنا لیاقت علی خان نیدر لینڈ میں سفیر ہیں یا دیگر جس طرح مسز وجے لکشمی پنڈت برطانیہ میں ہائی کمشنر ہیں اور اقوام متحدہ کی صدر رہ چکی ہیں اور بھی مثالیں جیسے نور جہاں' جھانسی کی رانی' رضیہ سلطانہ' حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ جو کہ (Pride of Woman) کہلاتی ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لکھنؤ میں جنگ کی کمانڈ کی۔ اس طرح خواتین نے خود کو پورا اہل ثابت کر دیا ہے۔ تو کیا اگر آج محترمہ فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت نہ دیں گے؟ کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر' وکلاء' مجسٹریٹ' جج' فوجی افسر یا پائلٹ وغیرہ بننے کی مطلق اجازت نہ ہو گی؟ .... خواتین کا یہ بھی کارنامہ کہ وہ نرسوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں قابل ذکر ہے۔ خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے مجاہدین کی مرہم پٹی کی' پانی پلایا اور حوصلے بلند کئے۔ تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدھی قوم کو مکانات کی چار دیواری میں مقید رکھا جائے گا؟

جواب : اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے' اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے

بھی برابر ہیں۔ آخرت میں اپنے اجر کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ یا تو ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو جائے گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر عورتوں پر دہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً" شریک نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔ عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لازماً" پہلی صورت ہی رونما ہو گی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آنکھیں بند کر کے دوسروں کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقلمندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ اس باب میں قرآن کا صریح حکم مانع ہے۔ نیز یہ انصاف کے بھی خلاف ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو کیونکہ اسلامی احکام کی رو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی بار مرد پر ڈالا گیا ہے۔ بیوی کا مہر اور نفقہ بھی اس پر واجب ہے اس کے مقابلہ میں عورت پر کوئی مالی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس صورت میں آخر عورت کو مرد کے برابر حصہ کیسے دلایا جا سکتا ہے۔

اسلام اصولاً" مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کے استحکام کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھگتنے کے لئے تیار ہوں تو شوق سے بھگتے رہیں لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں ان افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی کا کام لیا گیا ہے تو اس

کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لا کھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرہ عمل میں آکر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں' اس لئے کہ وہ ان کاموں کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لئے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کیے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے' نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرہ عمل میں' جس کے لئے وہ فطرتاً" پیدا کی گئی ہے' ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نا اہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہو کیا وہاں تمام خواتین موزوں ہو سکیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری محکموں' اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی بہ نسبت ۵۵ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ عورتوں کے پاس پہنچ کر کوئی راز راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً" کسی نہ کسی طرح عورت کا دخل ہوتا ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلوائی جانی چاہئے' لیکن چند شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی جائے جس سے وہ اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے لئے ٹھیک ٹھیک تیار ہو سکیں

اور ان کی تعلیم بعینہ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو۔ دوسرے یہ کہ تعلیم مخلوط نہ ہو اور عورتوں کو زنانہ تعلیم گاہوں میں عورتوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے۔ مخلوط تعلیم کے مہلک نتائج مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آ چکے ہیں کہ اب صرف عقل کے اندھے ہی ان کا انکار کر سکتے ہیں' مثال کے طور پر دیکھئے' امریکہ میں ۱۷ سال تک عمر کی لڑکیاں جو ہائی سکولوں میں پڑھتی ہیں' مخلوط تعلیم کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اوسطاً" ایک ہزار حاملہ نکلتی ہیں۔ گو ابھی یہ شکل ہمارے ہاں رونما نہیں ہوئی ہے لیکن اس مخلوط تعلیم کے نتائج کچھ ہمارے سامنے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سے ایسے اداروں میں کام لیا جائے جو صرف عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہوں مثلاً" زنانہ تعلیم گاہیں اور زنانہ ہسپتال وغیرہ۔

(ج) معاشرہ کی اصلاح و تربیت[1]

سوال : کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی؟ جیسے ان کی زیبائش اور نیم عریاں لباس زیب تن کرنے اور فیشن کا رجحان۔ اور جیسے آج کل نوجوان لڑکیاں نہایت تنگ و دلفریب سنٹ سے معطر لباس اور غازہ و سرخی سے مزین اپنے ہر خدوخال اور نشیب و فراز کی نمائش بر سرعام کرتی ہیں اور آج کل نوجوان لڑکے بھی ہالی وڈ فلموں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائز بن رہے ہیں۔ تو کیا حکومت قانون (Legislation) کے ذریعہ سے ہر مسلم و غیر مسلم لڑکے اور لڑکی کے آزادانہ رجحان کو روکے گی؟ خلاف ورزی پر سزا دے گی؟ والدین و سرپرستوں کو جرمانہ کیا جا سکے گا؟ تو اس طرح کیا ان کی شہری

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن۔ جنوری ۶۲ء

آزادی پر ضرب نہ لگے گی؟ کیا گرلز گائیڈ۔ اپوا (APWA) یا دیگر وائی' ایم' سی' اے (YMCA) اور وائی' ڈبلیو' سی' اے (YWCA) جیسے ادارے اسلامی نظام میں گوارا کئے جا سکتے ہیں؟ کیا خواتین ------- اسلامی عدلیہ سے -------- خود طلاق لینے کی مجاز ہو سکیں گی اور مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کی پابندی آج جائز ہو گی؟ یا خواہ اسلامی عدالت کے روبرو ہی ان کو اپنی پسند سے (Civil Marriage) کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا خواتین کو یوتھ فیسٹیول' کھیلوں' نمائش' ڈراموں' ناچ' فلموں یا مقابلہ حسن میں شرکت یا (Air Hostess) وغیرہ بننے کی آج بھی اسلامی حکومت مخالفت کرے گی؟ ساتھ ہی قومی کردار تباہ کرنے والے ادارے مثلاً" سینما' فلمیں' ٹیلی ویژن' ریڈیو پر فحش گانے و عریاں رسائل و لٹریچر' موسیقی' ناچ و رنگ کی ثقافتی محفلیں وغیرہ کو بند کر دیا جائے گا یا فائدہ اٹھانا ممکن ہو گا؟

جواب : اسلام معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا سارا کام محض قانون کے ڈنڈے سے نہیں لیتا۔ تعلیم' نشرو اشاعت اور رائے عام کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ جائے تو اسلام قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ عورتوں کی عریانی اور بے حیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی سچی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری تدابیر اصلاح سے درست نہ ہو یا اس کا وجود باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو ازروئے قانون روکنا پڑے گا۔ اس کا نام اگر شہری آزادی پر ضرب لگانا ہے تو جواریوں کو پکڑنا اور جیب کتروں کو سزائیں دینا بھی شہری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ اجتماعی زندگی لازماً" افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔ افراد کو اس کے لئے آزاد نہیں

چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور دوسروں سے سیکھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرہ کو خراب کریں۔

گرلز گائیڈ (Girls Guides) کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ اپوا (APWA) قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال کرنا چھوڑ دے۔ (YWCA) عیسائی عورتوں کے لئے رہ سکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مسلمان عورتیں چاہیں تو (YWMA) بنا سکتی ہیں' بشرطیکہ وہ اسلامی حدود میں رہیں۔

مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعے سے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ فسخ نکاح اور تفریق (Judicial Separation) کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری عدالت سے حاصل کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن طلاق (Divorce) کے اختیارات قرآن نے صریح الفاظ میں صرف مرد کو دیئے ہیں اور کوئی قانون مردوں کے اس اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخ عہد رسالت سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے نا آشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مرد سے سلب کر لیا جائے اور کوئی عدالت یا پنچایت اس میں دخل دے۔ یہ تخیل سیدھا یورپ سے چل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانون طلاق کا پس منظر (Back Ground) کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے برے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکینڈل نکل کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے گا کہ خدا کے قوانین میں ترمیم کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں از روئے قانون پابندی عائد

کرنے کا یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تخیل بھی ایک بیرونی مال ہے جسے قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے۔ یہ اس سوسائٹی میں سے آیا ہے جس میں ایک ہی عورت اگر منکوحہ بیوی کی موجودگی میں داشتہ کے طور پر رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابل برداشت ہے بلکہ اس کے حرامی بچوں کے حقوق محفوظ کرنے کی بھی فکر کی جاتی ہے (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے) لیکن اگر اسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے۔ گویا ساری پابندیاں حلال کے لئے ہیں' حرام کے لئے نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ابجد سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار (Values) اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانونا" جائز اور نکاح قانونا" حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ مسلمانوں میں زنا کا رواج بڑھے گا۔ گرل فرینڈز اور داشتائیں (Mistresses) فروغ پائیں گی اور دوسری بیوی ناپید ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسی سوسائٹی ہو گی جو اپنے خدوخال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہو گی۔ اس صورت حال کے تصور سے جس کا جی چاہے مطمئن ہو۔ مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو کسی مشرک عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں یا کسی ایسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لئے تیار نہ ہو اور مسلمان مرد اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہو گا۔ یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہو تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اس کی اجازت دے؟ اور ایک اسلامی عدالت کا یہ کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کروائے؟

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یوتھ فیسٹیول (Youth Festival) اور

کھیلوں کی نمائشوں اور ڈراموں اور رقص و سرور اور مقابلہ حسن میں مسلمان عورتوں کو لائے یا ائیر ہوسٹس بنا کر مسافروں کے دل موہنے کی خدمت ان سے لے تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی حکومت کی آخر ضرورت کیا ہے؟ یہ سارے کام تو کفر اور کفار کی حکومت میں باسانی ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

سینما، فلم، ٹیلی وژن اور ریڈیو وغیرہ تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ان کے اس استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والا ہے۔ اسلامی حکومت کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی فلاح کے لئے استعمال کرے اور اخلاقی فساد کے لئے استعمال ہونے کا دروازہ بند کر دے۔

---

(۴)

ذمیوں کے حقوق

(الف) اسلامی ریاست میں ذمی رعایا[1]

سوال : "میں ہندو مہا سبھا کا ورکر ہوں۔ سال گذشتہ صوبہ کی ہندو سبھا کا پروپیگنڈا سیکرٹری منتخب ہوا تھا۔ میں حال ہی میں جناب کے نام سے شناسا ہوا ہوں۔ آپ کی چند کتابیں مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اول و سوم، اسلام کا نظریہ سیاسی، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ سلامتی کا راستہ وغیرہ دیکھی ہیں، جن کے مطالعہ سے اسلام کے متعلق میرا نظریہ قطعاً" بدل گیا ہے اور میں ذاتی طور پر یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ چیز کچھ عرصہ پہلے ہو گئی ہوتی تو ہندو مسلم مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ ہوتا۔ جس حکومت الہیہ کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس میں زندگی بسر کرنا قابل فخر ہو سکتا ہے۔ مگر چند امور دریافت طلب ہیں۔ خط و کتابت کے علاوہ ضرورت ہوگی تو جناب کا نیاز بھی حاصل کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو حکومت الہیہ کے اندر کس درجہ میں رکھا جائے گا؟ آیا ان کو اہل کتاب کے حقوق دیئے جائیں گے یا ذمی کے؟ اہل کتاب اور ذمی لوگوں کے حقوق کی تفصیل ان رسائل میں بھی نہیں ملتی۔ مجھے جہاں تک سندھ پر

---

[1] ترجمان القرآن رجب، شوال ۱۳۶۳ھ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

عربی حملہ کی تاریخ کا علم ہے' محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے سندھ کے ہندوؤں کو اہل کتاب کے حقوق دیئے تھے۔ امید ہے کہ آپ اس معاملہ میں تفصیلی طور پر اظہار خیال کریں گے۔

نیز یہ بھی فرمایئے کہ اہل کتاب اور ذمی کے حقوق میں کیا فرق ہے؟ کیا وہ ملک کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں؟ کیا پولیس' فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہو گا؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لئے وہ پوزیشن قبول کرنے کو تیار ہوں گے جو کہ آپ حکومت الٰہیہ میں ہندوؤں کو دیں گے؟

دوسری دریافت طلب چیز یہ ہے کہ کیا قرآن کے فوجداری اور دیوانی احکام مسلمانوں کی طرح ہندوؤں پر بھی حاوی ہوں گے؟ کیا ہندوؤں کا قومی قانون (Personal Law) ہندوؤں پر نافذ ہو گا یا نہیں؟ میرا مدعا یہ ہے کہ ہندو اپنے قانون وراثت' مشترکہ فیملی سسٹم اور متبنٰی وغیرہ بنانے کے قواعد (مطابق منوشاستر) کے مطابق زندگی بسر کریں گے یا نہیں؟

واضح رہے کہ یہ سوالات محض ایک متلاشی حق کی حیثیت سے پیش کئے جا رہے ہیں۔"

جواب : میں آپ کے ان خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں جو آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ظاہر کئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ کو پیچیدہ اور ناقابل حل حد تک پیچیدہ بنا دینے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اصول حق اور راستی کی بنیادوں پر مسائل زندگی حل کرنے کے بجائے شخصی' خاندانی' طبقاتی' نسلی اور قومی بنیادوں پر انہیں دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا انجام وہی کچھ ہونا چاہئے تھا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اور اس بدقسمتی میں ہم

آپ سب برابر کے شریک ہیں' کوئی بھی "ذمی" نہیں ہے۔

آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کے مختصر جوابات نمبروار درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر حکومت ایسی قائم ہو تو اس کی حیثیت یہ نہ ہو گی کہ ایک قوم دوسری قوم یا اقوام پر حکمران ہے' بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہو گی کہ ملک پر ایک اصول کی حکومت قائم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی حکومت کو چلانے کی ذمہ داری باشندگان ملک میں سے وہی لوگ اٹھا سکیں گے جو اس اصول کو مانتے ہوں۔ دوسرے لوگ جو اس اصول کو نہ مانتے ہوں یا کم از کم اس پر مطمئن نہ ہوں' ان کو اس حکومت میں قدرتی طور پر "اہل ذمہ" کی حیثیت حاصل ہو گی' یعنی جن کی حفاظت کی ذمہ داری وہ لوگ لیتے ہیں جو اس اصولی حکومت کو چلانے والے ہیں۔

۲۔ "اہل کتاب" اور "عام اہل ذمہ" کے درمیان اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور دوسرے ذمیوں کی عورتوں سے نہیں کر سکتے۔ لیکن حقوق میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ ذمیوں کے حقوق کے بارے میں تفصیلات تو میں اس خط میں نہیں دے سکتا' البتہ اصولی طور پر آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ ذمی دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی حکومت کا ذمہ قبول کرتے وقت کوئی معاہدہ کریں اور دوسرے وہ جو بغیر کسی معاہدہ کے ذمہ میں داخل ہوں۔ پہلی قسم کے ذمیوں کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو معاہدہ میں طے ہوا ہو۔ رہے دوسری قسم کے ذمی' تو ان کا ذمی ہونا ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ ہم ان کی جان اور مال اور آبرو کی اسی طرح حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں جس طرح خود اپنی جان اور مال اور آبرو کی کریں گے۔ ان کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے۔ ان کے خون کی قیمت وہی ہو گی جو مسلمان کے خون کی ہے۔ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔ ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ان کو اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسلامی تعلیم بہ جبر ان پر نہیں ٹھونسی جائے گی۔

ذمیوں کے متعلق اسلام کے دستوری قانون کی تفصیلات انشاء اللہ ہم ایک کتاب کی شکل میں الگ شائع کریں گے۔ [1]

۴- جہاں تک ذمیوں کے پرسنل لاء کا تعلق ہے وہ ان کی مذہبی آزادی کا ایک لازمی جز ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت ان کے قوانین نکاح و طلاق اور قوانین وراثت و تبنیت کو اور ایسے ہی دوسرے تمام قوانین کو جو ملکی قانون (Law of the Land) سے نہ ٹکراتے ہوں' ان پر جاری کرے گی اور صرف ان امور میں ان کے پرسنل لاء کے نفاذ کو برداشت نہ کرے گی جن میں ان کا برا اثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ذمی قوم سود کو جائز رکھتی ہو تو ہم اس کو اسلامی حکومت میں سودی لین دین کی اجازت نہ دیں گے کیونکہ اس سے پورے ملک کی معاشی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ یا مثلاً" اگر کوئی ذمی قوم زنا کو جائز رکھتی ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے طور پر بدکاری (Prostitution) کا کاروبار جاری رکھ سکے' کیونکہ یہ اخلاق انسانی کے مسلمات کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمارے قانون تعزیرات (Criminal Law) سے بھی ٹکراتی ہے' جو ظاہر ہے کہ ملکی قانون بھی ہو گا۔ اسی پر آپ دوسرے امور کو قیاس کرسکتے ہیں۔

۵- آپ کا یہ سوال کہ آیا ذمی ملک کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً" پولیس' فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہو گا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لئے وہ پوزیشن منظور کریں گے جو آپ ہندوؤں کو حکومت الیہ میں دیں گے؟ یہ سوال میرے نزدیک دو غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ اصولی غیر قومی حکومت (Ideological Non-National State) کی صحیح حیثیت آپ نے اس

---

[1] اس موضوع پر جماعت اسلامی کی طرف سے دو مستقل رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

میں ملحوظ نہیں رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ کاروباری لین دین کی ذہنیت اس میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نمبر اول میں تصریح کر چکا ہوں' اصولی حکومت کو چلانے اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو اس اصول پر یقین رکھتے ہوں۔ وہی اس کی روح کو سمجھ سکتے ہیں' انہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ اپنا دین و ایمان سمجھتے ہوئے اس "ریاست" کے کام کو چلائیں گے اور انہی سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس ریاست کی حمایت کے لئے گر ضرورت پڑے تو میدان جنگ میں قربانی دے سکیں گے۔ دوسرے لوگ جو اس اصول پر ایمان نہیں رکھتے' اگر حکومت میں شریک کئے بھی جائیں گے تو نہ وہ اس کی اصولی اور اخلاقی روح کو سمجھ سکیں گے۔ نہ اس روح کے مطابق کام کر سکیں گے اور نہ ان کے اندر ان اصولوں کے لئے اخلاص ہو گا جن پر اس حکومت کی عمارت قائم ہو گی۔ سول محکموں میں اگر وہ کام کریں گے تو ان کے اندر ملازمانہ ذہنیت کار فرما ہو گی اور محض روزگار کی خاطر وہ اپنا وقت اور اپنی قابلیتیں بیچیں گے اور اگر وہ فوج میں جائیں گے تو ان کی حیثیت کرائے کے سپاہیوں (Merecenaries) جیسی ہو گی اور وہ ان اخلاقی مطالبات کو پورا نہ کر سکیں گے جو اسلامی حکومت اپنے مجاہدوں سے کرتی ہے اس لئے اصولا" اور اخلاقی اعتبار سے اسلامی حکومت کی پوزیشن اس معاملہ میں یہ ہے کہ وہ فوج میں اہل ذمہ سے کوئی خدمت نہیں لیتی بلکہ اس کے برعکس فوجی حفاظت کا پورا پورا بار مسلمانوں پر ڈال دیتی ہے اور اہل ذمہ سے صرف ایک دفاعی ٹیکس لینے پر اکتفا کرتی ہے۔ لیکن یہ ٹیکس اور فوجی خدمت دونوں بیک وقت اہل ذمہ سے نہیں لئے جا سکتے۔ اگر اہل ذمہ بطور فوجی خدمت کے اپنے آپ کو پیش کریں تو وہ ان سے قبول کر لی جائے گی اور اس صورت میں دفاعی ٹیکس ان سے نہ لیا جائے گا۔ رہے سول محکمے تو ان میں سے کلیدی مناصب (Key Positions) اور وہ عہدے جو پالیسی کے تعین و

تحفظ سے تعلق رکھتے ہیں' بہرحال اہل ذمہ کو نہیں دیئے جا سکتے۔ البتہ کارکنوں کی حیثیت سے ذمیوں کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح جو اسمبلی شوریٰ کے لئے منتخب کی جائے گی اس میں بھی اہل ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا۔ البتہ ذمیوں کی الگ کونسلیں بنا دی جائیں گی جو ان کی تہذیبی خود اختیاری کے انتظام کی دیکھ بھال بھی کریں گی اور اس کے علاوہ ملکی نظم و نسق کے متعلق اپنی خواہشات' اپنی ضروریات اور شکایات اور اپنی تجاویز کا اظہار بھی کر سکیں گی جن کا پورا پورا لحاظ اسلامی مجلس شوریٰ (Assembly) کرے گی۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ حکومت الہیہ کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے' جو بھی اس کے اصول کو تسلیم کرے وہ اس حکومت کو چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ لیکن جو اس کے اصول کو تسلیم نہ کرے وہ خواہ مسلم زادہ ہی کیوں نہ ہو' حکومت کی محافظت (Protection) سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے لیکن اس کے چلانے میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

آپ کا یہ سوال کہ "کیا ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی وہی پوزیشن قبول کرو گے جو حکومت الہیہ میں ہندوؤں کو دو گے؟" دراصل مسلم لیگ کے لیڈروں سے کیا جانا چاہئے تھا' کیونکہ لین دین کی باتیں وہی کر سکتے ہیں۔ ہم سے آپ پوچھیں گے تو ہم تو اس کا بے لاگ اصولی جواب دیں گے۔

جہاں حکومت قائم کرنے کے اختیارات ہندوؤں کو حاصل ہوں وہاں آپ اصولاً" دو ہی طرح کی حکومتیں قائم کر سکتے ہیں:

یا ایسی حکومت جو ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو۔

یا پھر ایسی حکومت جو وطنی قومیت کی بنیاد پر ہو۔

پہلی صورت میں آپ کے لئے یہ کوئی سوال نہیں ہونا چاہئے کہ جیسے حقوق حکومت الہیہ میں ہندوؤں کو ملیں گے ویسے ہی حقوق ہم "رام راج" میں مسلمانوں

کو دے دیں گے۔ بلکہ آپ کو اس معاملہ میں اگر کوئی رہنمائی ہندو مذہب میں ملتی ہے تو بے کم و کاست اسی پر عمل کریں گے، قطع نظر اس سے کہ دوسرے کس طرح عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ کا معاملہ ہمارے معاملہ سے بہتر ہو گا تو اخلاق کے میدان میں آپ ہم پر فتح پالیں گے، اور بعید نہیں کہ ایک روز ہماری حکومت ا پیہ آپ کے رام راج میں تبدیل ہو جائے۔ اور اگر معاملہ ان کے برعکس ہوا تو ظاہر ہے کہ دیر یا سویر نتیجہ بھی برعکس نکل کر ہی رہے گا۔

رہی دوسری صورت کہ آپ کی حکومت وطنی قومیت کی بنیاد پر قائم ہو تو اس صورت میں بھی آپ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو جمہوری (Democratic) اصول اختیار کریں اور مسلمانوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے حصہ دیں، یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ یہ ہندو قوم کی حکومت ہے اور مسلمانوں کو اس میں ایک مغلوب قوم (Subject Nation) کی حیثیت سے رہنا ہو گا۔

ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر بھی آپ چاہیں مسلمانوں سے معاملہ کریں۔ بہرحال آپ کے برتاؤ کو دیکھ کر اسلامی ریاست ان اصولوں میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر نہ کرے گی جو ذمیوں سے معاملہ کرنے کے لئے قرآن و حدیث میں مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنی قومی ریاست میں مسلمانوں کا قتل عام کر دیں اور ایک مسلمان بچے تک کو زندہ نہ چھوڑیں۔ اسلامی ریاست میں اس کا انتقام لینے کے لئے کسی ذمی کا بال تک بیکا نہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس آپ کا جی چاہے تو ہندو ریاست میں صدر جمہوریہ اور وزیراعظم اور کمانڈر انچیف سب ہی کچھ مسلمان باشندوں کو بنا دیں۔ بہرحال اس کے جواب میں کوئی ایک ذمی بھی کسی ایسی پوزیشن پر مقرر نہیں کیا جائے گا جو اسلامی ریاست کی پالیسی کی شکل اور سمت معین کرنے میں دخل رکھتی ہو۔

مزید تصریحات[1]

سوال : آپ کی جملہ تصانیف اور سابق عنایت نامہ پڑھنے کے بعد میں یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہیں اور اس اسلامی حکومت کے عہد میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہو گی جیسی ہندوؤں میں اچھوتوں کی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہندوؤں کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی انہیں ان کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا۔" مگر آپ نے یہ نہیں تحریر فرمایا کہ آیا ہندوؤں کو تبلیغ کا حق بھی حاصل ہو گا یا نہیں؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جو بھی اس حکومت کے اصول کو تسلیم کر لے وہ اس کے چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے؟ خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ۔" براہ کرم اس کی توضیح کیجئے کہ ایک ہندو ہندو رہتے ہوئے بھی کیا آپ کی حکومت کے اصولوں پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہو سکتا ہے؟

پھر آپ نے فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں مگر آپ نے ساتھ ہی یہ واضح نہیں کیا کہ آیا اہل کتاب بھی مسلم عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا آپ اس احساس برتری (Superiority Complex) کے بارے میں مزید روشنی ڈالیں گے؟ اگر آپ اس کے اثبات (Justification) کے لئے اسلام پر ایمان کی اوٹ لیں تو کیا آپ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ موجودہ نام نہاد مسلمان آپ کے قول .... کے مطابق ان اسلامی قواعد اور کریکٹر کے اصولوں پر پورے اتریں گے؟ آج کے

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن' ذی القعدہ۔ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ نومبر۔ دسمبر ۱۹۴۴ء

مسلمان کی بات تو الگ رہی۔ کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ خلافت راشدہ کے عہد میں اکثر و بیشتر جو لوگ اسلام لائے وہ زیادہ تر سیاسی اقتدار کے خواہاں تھے؟ اگر آپ یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں تو فرمایئے کہ پھر وہ اسلامی حکومت کیوں صرف تیس پینتیس سال چل کر رہ گئی؟ پھر کیوں حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے مدبر اور مجاہد کی اس قدر مخالفت ہوئی اور مخالفین میں حضرت عائشہ صاحبہ تک تھیں؟

نیز یہ گرہ بھی کھولئے کہ آپ موجودہ ماحول میں اس طرز حکومت کو چلانے کے لئے ایسے بلند اخلاق اور بہترین کریکٹر کی شخصیتیں کہاں سے پیدا کریں گے؟ جب کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے عدیم المثال بزرگ اسے چند سالوں سے زیادہ نہ چلا سکے۔ چودہ سو سال کے بعد ایسے کون سے موافق حالات آپ کے پیش نظر ہیں جن کی بنا پر آپ کی دور رس نگاہیں حکومت الہیہ کو عملی صورت میں دیکھ رہی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آپ کا پیغام ہر خیال کے مسلمانوں میں زور و شور سے پھیل رہا ہے اور مجھے جس قدر بھی مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ سب اس خیال کے حامی ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ عین اسلام ہے۔ مگر ہر شخص کا اعتراض یہی ہے جو میں نے گزشتہ سطور میں پیش کیا ہے، یعنی آپ کے پاس عہد خلافت راشدہ کی اصولی حکومت چلانے کے لئے فی زمانہ کریکٹر کے آدمی کہاں ہیں؟ پھر جب کہ وہ بہترین نمونہ کی ہستیاں اس نظام کو نصف صدی تک بھی کامیابی سے نہ چلا سکیں تو اس دور میں اس طرز کی حکومت کا خیال خوش فہمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

جواب : آپ کے سوالات کا سرا حقیقت میں ابھی تک میں نہیں پا سکا ہوں۔ اس وجہ سے جو جوابات میں دیتا ہوں ان میں سے کچھ اور ایسے سوالات نکل آتے

ہیں جن کے نکلنے کی مجھے توقع نہیں ہوتی۔ اگر آپ پہلے بنیادی امور سے بات شروع کریں اور پھر بتدریج فروعی معاملات اور وقتی سیاسیات (Current Politics) کی طرف آئیں تو چاہے آپ مجھ سے متفق نہ ہوں لیکن کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ ضرور لیں گے۔ سردست تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری پوزیشن آپ کے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہے۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "جس اسلامی حکومت کا میں خواب دیکھ رہا ہوں اس میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت وہی ہو گی جو ہندوؤں میں اچھوتوں کی ہے۔" مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ یا تو آپ ذمیوں کی حیثیت میرے صاف صاف بیان کر دینے کے باوجود نہیں سمجھے ہیں یا ہندوؤں میں اچھوتوں کی حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ اول تو اچھوتوں کی جو حیثیت منو کے دھرم شاستر سے معلوم ہوتی ہے اس کو ان حقوق و مراعات سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اسلامی فقہ میں ذمیوں کو دیئے گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھوت پن کی بنیاد نسلی امتیاز پر ہے۔ اور ذمیت کی بنیاد محض عقیدہ پر۔ اگر ذمی اسلام قبول کر لے تو وہ ہمارا امیر و امام تک بن سکتا ہے۔ مگر کیا ایک شودر کسی عقیدہ و مسلک کو قبول کر لینے کے بعد ورن آشرم کی پابندیوں سے بری ہو سکتا ہے؟

آپ کا یہ سوال بہت ہی عجیب ہے کہ "کیا ایک ہندو رہتے ہوئے بھی آپ کی حکومت کے اصولوں پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہو سکتا ہے؟" شاید آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اسلامی حکومت کے اصولوں پر ایمان لے آنے کے بعد ہندو ہندو کب رہے گا' وہ تو مسلم ہو جائے گا۔ آج جو کروڑوں "ہندو زادے" اس ملک میں مسلمان ہیں وہ اسلام کے اصولوں پر ایمان لا کر ہی تو مسلمان ہوئے ہیں۔ اسی طرح آئندہ جو ہندو زادے اسے مان لیں گے وہ بھی مسلم ہو جائیں گے۔ اور جب وہ مسلم ہو جائیں گے تو یقیناً" اسلامی حکومت کو چلانے میں ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے۔

آپ کا یہ سوال کہ "آیا ہندوؤں کو اسلامی ریاست میں تبلیغ کا حق بھی حاصل ہو گا یا نہیں۔" جتنا مختصر ہے اس کا جواب اتنا مختصر نہیں ہے۔ تبلیغ کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ خود اپنی آئندہ نسلوں کو اور اپنے عوام کو اپنے مذہب کی تعلیم دے۔ اس کا حق تمام ذمی گروہوں کو حاصل ہو گا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے اپنے مذہب کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور اسلام سمیت دوسرے مسلکوں سے اپنے وجوہ اختلاف کو علمی حیثیت سے بیان کرے۔ اس کی اجازت بھی ذمیوں کو ہو گی، مگر ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک منظم تحریک ایسی اٹھائے جس کی غرض یا جس کا مال یہ ہو کہ ملک کا نظام زندگی تبدیل ہو کر اسلامی اصولوں کے بجائے اس کے اصولوں پر قائم ہو جائے۔ ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی کو نہیں دیں گے۔ اس مسئلے پر میرا مفصل مضمون "اسلام میں قتل مرتد کا حکم" ملاحظہ فرمایئے۔[1]

اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز اور مسلمان عورتوں سے اہل کتاب کا نکاح ناجائز ہونے کی بنیاد کسی احساس برتری پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے، مرد بالعموم متاثر کم ہوتا ہے اور اثر زیادہ ڈالتا ہے۔ عورت بالعموم متاثر زیادہ ہوتی ہے اور اثر کم ڈالتی ہے۔ ایک غیر مسلمہ اگر کسی مسلمان کے نکاح میں آئے تو اس کا امکان کم ہوتا ہے کہ وہ اس مسلمان کو غیر مسلم بنا لے گی اور اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان عورت اگر کسی غیر مسلم کے نکاح میں چلی جائے تو اس کے غیر مسلمہ ہو

---

[1] یہ مضمون اب کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ "مرتد کی سزا۔ اسلامی قانون میں۔" مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور۔

جانے کا بہت زیادہ اندیشہ ہے اور اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اور اپنی اولاد کو مسلمان بنا سکے گی۔ اسی لئے مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنی لڑکیوں کا نکاح غیر مسلم سے کریں۔ البتہ اگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص خود اپنی بیٹی مسلمان کو دینے پر راضی ہو تو مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اس چیز کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم بیوی کی محبت میں مبتلا ہو کر تم نے ایمان کھو دیا تو تمہارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا اور آخرت میں تم خسارے میں رہو گے۔ نیز یہ اجازت ایسی ہے جس سے خاص ضرورتوں کے مواقع پر ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے جسے قبول عام حاصل ہو' بلکہ بعض حالات میں تو اس سے منع بھی کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں غیر مسلم عناصر کے داخل ہونے کے کسی نامناسب اخلاقی اور اعتقادی حالت کا نشوونما نہ ہو سکے۔

آپ کا یہ سوال کہ اسلامی حکومت صرف تیس پینتیس سال چل کر کیوں رہ گئی' ایک اہم تاریخی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اگر آپ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو اس کے اسباب سمجھنا آپ کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہ ہو گا۔ کسی خاص اصول کی علمبردار جماعت جو نظام زندگی قائم کرتی ہے اس کا اپنی پوری شان کے ساتھ چلنا اور قائم رہنا اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ لیڈر شپ ایک ایسے چیدہ گروہ کے ہاتھ میں رہے جو اس اصول کا اور سرگرم پیرو ہے۔ اور لیڈر شپ ایسے گروہ کے ہاتھ میں صرف اسی حالت میں رہ سکتی ہے جب کہ عام باشندوں پر اس گروہ کی گرفت قائم رہے اور ان کی عظیم اکثریت کم از کم اس حد تک تعلیم و تربیت پائے ہوئے ہو کہ اسے اس خاص اصول کے ساتھ گہری وابستگی بھی ہو اور وہ ان لوگوں کی بات سننے کے لئے تیار بھی نہ ہو جو اس اصول سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقہ کی طرف بلانے والے ہوں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اسلامی تاریخ پر نظر ڈالئے۔

نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں جو تمدنی انقلاب رونما ہوا اور جو نیا نظام زندگی قائم ہوا اس کی بنیاد یہ تھی کہ عرب کی آبادی میں ایک طرح کا اخلاقی انقلاب (Moral Revolution) واقع ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ کی قیادت میں صالح انسانوں کا جو مختصر گروہ تیار ہوا تھا اس کی قیادت تمام اہل عرب نے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن آگے چل کر عہد خلافت راشدہ میں جب ملک پر ملک فتح ہونے شروع ہوئے تو اسلام کی مملکت میں توسیع بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور استحکام اتنی تیزی کے ساتھ نہ ہو سکا۔ چونکہ اس زمانے میں نشرو اشاعت اور تعلیم و تبلیغ کے ذرائع اتنے نہ تھے جتنے آج ہیں اور نہ وسائل حمل و نقل موجودہ زمانہ کے مانند تھے' اس لئے جو فوج در فوج انسان اس نئی مسلم سوسائٹی میں داخل ہونے شروع ہوئے ان کو اخلاقی' ذہنی اور عملی حیثیت سے اسلامی تحریک میں مکمل طور پر جذب کرنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام آبادی میں صحیح قسم کے مسلمانوں کا تناسب بہت کم رہ گیا اور خام قسم کے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ لیکن اصولاً" ان مسلمانوں کے حقوق اور اختیارات اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت صحیح قسم کے مسلمانوں کی بہ نسبت کچھ بھی مختلف نہ ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے جب حضرت علی ؓ کے زمانہ میں ارتجاعی تحریکیں[1] (Reactionary Movements) رونما ہوئیں تو مسلمان پبلک کا ایک بہت بڑا حصہ ان سے متاثر ہو گیا اور لیڈرشپ ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گئی جو ٹھیٹھ اسلامی طرز پر کام کرنے والے تھے۔ اس تاریخی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ واقعہ ذرہ برابر بھی دل شکستہ نہیں کرتا کہ خالص اسلامی حکومت تیں پینتیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت' اس اخلاق اور اس سیرت کے

---

[1] یعنی جن کا مقصد اسلام سے پھر کسی نہ کسی طرح کی جاہلیت کی طرف پلٹ جانا تھا۔

انسانوں کا منظم کر سکیں جو اسلام کے منشا کے مطابق ہو تو ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے ذرائع و وسائل سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی و تمدنی انقلاب برپا کر سکیں گے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایسے گروہ کے منظم ہو جانے کے بعد عام انسانوں کی قیادت اس گروہ کے سوا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی۔ آپ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر جو رائے قائم کر رہے ہیں وہ اس حالت پر چسپاں نہیں ہو سکتی جو ہمارے پیش نظر ہے۔

اگر صحیح اخلاق کے حامل انسان میدان عمل میں آ جائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ ہندو' عیسائی' پارسی اور سکھ سب ان کے گرویدہ ہو جائیں گے اور خود اپنے ہم مذہب لیڈروں کو چھوڑ کر ان پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ ایسے ہی ایک گروہ کو تربیت اور تعلیم اور تنظیم کے ذریعہ سے تیار کرنا اس وقت میرے پیش نظر ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کام میں وہ میری مدد کرے۔

(ب) ذمیوں کے حقوق [1]

سوال : اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں کو' مثلاً" عیسائی' یہودی' بدھ' جین' پارسی' ہندو وغیرہ کو کیا مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے؟ کیا ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ بھی اسی طرح کرنے کی اجازت ہو گی جیسا کہ آج کل پاکستان اور دیگر ممالک میں کھلے بندوں پر پرچار ہوتا ہے؟ کیا اسلامی مملکت میں ایسے مذہبی یا نیم مذہبی ادارے مثلاً" ادارہ مکتی فوج (Salvation Army) کیتھڈرل' کانونٹ' سینٹ

---

[1] ماخوذ ترجمان القرآن جلد ۵۷ عدد ۱ ۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء

جان یا سینٹ فرانسز وغیرہ جیسے ادارے قانونا" بند کر دیئے جائیں گے (جیسا کہ حال میں سیلون میں ہوا یا دو ایک ممالک میں ہو چکا ہے) یا فراخ دلی سے مسلمان بچوں کو وہاں بھی ماڈرن ایجوکیشن حاصل کرنے کی عام اجازت ہوگی؟ کیا اس صدی میں بھی ان اقلیتی فرقوں سے جزیہ وصول کرنا مناسب ہو گا (عالمی حقوق انسانی کی روشنی میں بھی) جب کہ وہ نہ صرف فوج اور سرکاری عہدوں پر فائز اور حکومت کے وفادار ہوں؟

جواب : اسلامی مملکت میں غیر مسلم گروہوں کو تمام مدنی حقوق (Civil Rights) مسلمانوں کی طرح حاصل ہوں گے مگر سیاسی حقوق (Political Rights) مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن اور سنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں۔ چونکہ غیر مسلم نہ قرآن اور سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں اس لئے وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ نظم و نسق میں ایسے عہدے ان کو دیئے جا سکتے ہیں جن کا کام پالیسی بنانا نہ ہو۔ اس معاملہ میں غیر مسلم حکومتوں کا طرز عمل منافقانہ ہے اور اسلامی حکومت کا طرز عمل صاف صاف ایمان دارانہ۔ مسلمان اس بات کو صاف صاف کہتے ہیں اور اس پر عمل درآمد کرنے میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی شرافت اور فراخ دلی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ غیر مسلم بظاہر کاغذ پر قومی اقلیتوں (National Minorities) کو سب قسم کے حقوق دے دیتے ہیں مگر عملاً انسانی حقوق تک نہیں دیتے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو دیکھ لے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں (Negroes) کے ساتھ اور روس میں غیر کمیونسٹ باشندوں کے ساتھ اور چین و ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک

ہو رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ دوسروں سے شرما کر ہم اپنے مسلک کو صاف صاف کیوں نہ بیان کریں اور اس پر صاف صاف کیوں نہ عمل کریں۔

جہاں تک غیر مسلموں کی تبلیغ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جب تک ہم بالکل خودکشی کے لئے ہی تیار نہ ہو جائیں ہمیں یہ حماقت نہیں کرنی چاہئے کہ اپنے ملک کے اندر ایک طاقتور اقلیت پیدا ہونے دیں جو غیر ملکی سرمایہ سے پرورش پائے اور بڑھے اور جس کی پشت پناہی بیرونی حکومتیں کر کے ہمارے لئے وہی مشکلات پیدا کریں جو ایک مدت دراز تک ترکی کے لئے عیسائی اقلیتیں پیدا کرتی رہی ہیں۔

عیسائی مشنریوں کو یہاں مدارس اور ہسپتال جاری رکھ کر مسلمانوں کے ایمان خریدنے کی کوشش کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی ملت سے بیگانہ (De-Nationalise) کرنے کی کھلی اجازت دینا بھی میرے نزدیک قومی خودکشی ہے۔ ہمارے حکمران اس معاملہ میں انتہائی کم نظری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کو قریب کے فائدے تو نظر آتے ہیں مگر دور رس نتائج دیکھنے سے ان کی آنکھیں عاجز ہیں۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم اس حالت کے لئے دیا گیا ہے جب کہ وہ یا تو مفتوح ہوئے ہوں یا کسی معاہدہ کی رو سے جزیہ دینے کی واضح شرط پر اسلامی حکومت کی رعایا بنائے گئے ہوں۔ پاکستان میں چونکہ یہ دونوں صورتیں پیش نہیں آئی ہیں اس لئے یہاں غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنا میرے نزدیک شرعاً ضروری نہیں ہے۔

---

(۵)

چند متفرق مسائل

(الف) تعبیر دستور کا حق[1]

سوال : دستور کی تعبیر کا حق کس کو ہونا چاہئے؟ مقننہ کو یا عدلیہ کو؟ سابق دستور میں یہ حق عدلیہ کو تھا اور موجودہ دستور میں یہ حق عدلیہ سے چھین کر مقننہ کو ہی دے دیا گیا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عدالتوں کے اختیارات کو کم کر دیا گیا ہے اور یہ حق عدلیہ کے پاس باقی رہنا چاہئے۔ اس مسئلہ پر ایک صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ اسلام کے دور اول میں عدالتوں کا کام صرف مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ قانون کی تشریح اور تعبیر کا حق عدالتوں کو نہ تھا اور نہ عدالتیں یہ طے کرنے کی مجاز تھیں کہ قانون صحیح ہے یا غلط۔ یہ رائے کہاں تک درست ہے؟[2]

جواب : موجودہ زمانے کے قانونی و دستوری مسائل پر اسلام کے دور اول کی نظیریں چسپاں کرنے کا رجحان آج کل بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن جو لوگ اس طرح کے استدلال کرتے ہیں وہ ہمیشہ اس عظیم الشان فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اس وقت کے معاشرے اور ہمارے آج کے معاشرے میں' اور اس وقت کے کارفرماؤں اور اس دور کے کارفرماؤں میں فی الواقع موجود ہے۔

خلافت راشدہ میں خلیفہ خود قرآن و سنت کا بہت بڑا عالم ہوتا تھا اور اس کی

---

[1] ترجمان القرآن۔ جلد ۵۹۔ عدد ۳۔ دسمبر ۱۹۶۲ء

[2] واضح رہے کہ اب دستور میں ترمیم ہو چکی ہے اور تعبیر دستور کا حق عدلیہ کو دیا جا چکا ہے۔

متقیانہ سیرت کی وجہ سے مسلمان اس پر یہ اعتماد رکھتے تھے کہ زندگی کے کسی مسئلے میں بھی اس کا اجتہاد کبھی دین کے راستے سے منحرف نہ ہو گا۔ اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان بھی سب کے سب بلا استثناء اس بنیاد پر رکنیت کا شرف حاصل کرتے تھے کہ وہ قوم میں سب سے زیادہ دین کے جاننے اور سمجھنے والے ہیں۔ ان کے زمرے میں کوئی ایسا آدمی بار نہیں پا سکتا تھا جو دین سے جاہل ہو' یا نفسانیت کی بنا پر دین میں تحریف کرنے والا ہو' یا جس سے مسلمانوں کو کسی بدعت یا غیر اسلامی رجحان کا اندیشہ ہو۔ معاشرے کی عظیم اکثریت بھی اس وقت دین کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور کوئی شخص اس ماحول میں یہ جرات نہ کر سکتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے خلاف کوئی حکم دے یا کوئی قاعدہ و ضابطہ جاری کر دے۔ یہی بلند معیار اس وقت کی عدالتوں کا بھی تھا۔ منصب قضا پر وہ لوگ سرفراز ہوتے تھے جو قرآن و سنت میں گہری بصیرت رکھتے تھے' کمال درجہ کے متقی و پرہیزگار تھے اور قانون خداوندی سے بال برابر بھی تجاوز کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان حالات میں مقننہ اور عدلیہ کے تعلقات کی وہی نوعیت تھی جو ایسے معاشرے میں ہونی چاہئے تھی۔ تمام جج مقدمات کے فیصلے براہ راست قرآن و سنت کے احکام کی بنیاد پر کرتے تھے اور جن امور میں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی تھی ان میں بالعموم وہ خود اجتہاد کرتے تھے۔ البتہ جہاں معاملات کی نوعیت اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ جج اپنے انفرادی اجتہاد سے فیصلہ نہ کریں بلکہ خلیفہ کی مجلس شوریٰ ان میں شریعت کا حکم مشخص کرے' ان کے بارے میں اجتماعی اجتہاد سے ایک ایسا ضابطہ بنا دیا جاتا تھا جو دین کے اصولوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والا ہو سکتا تھا۔ اس نظام میں کوئی وجہ نہ تھی کہ ججوں کو مجلس شوریٰ کے بنائے ہوئے قانون پر نظر ثانی کرنے کا اختیار ہوتا کیونکہ وہ اگر کسی قانون کو رد کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے تو اسی بنیاد پر تو ہو سکتے تھے کہ وہ اصل دستور (یعنی قرآن و سنت) کے خلاف ہے۔ اور قانون وہاں سرے سے کسی ایسے معاملہ میں بنایا ہی نہیں جاتا تھا

جس کے متعلق قرآن و سنت میں واضح حکم موجود ہو۔ قانون سازی کی ضرورت صرف ان معاملات میں پیش آتی تھی جن میں نص موجود نہ ہونے کی وجہ سے اجتہاد ناگزیر ہوتا تھا اور ایسے معاملات میں ظاہر ہے کہ انفرادی اجتہاد کی بہ نسبت اجتماعی اجتہاد زیادہ قابل اعتماد ہو سکتا تھا' خواہ بعض افراد کا ذاتی اجتہاد اس سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔

اب ظاہر ہے کہ اس وقت کی یہ دستوری نظیر آج کے حالات پر کسی طرح بھی چسپاں نہیں ہوتی۔ نہ آج کے حکمران اور مجالس قانون ساز کے ارکان خلفائے راشدین اور ان کی مجلس شوریٰ سے کوئی نسبت رکھتے ہیں' نہ آج کے جج اس وقت کے قاضیوں جیسے ہیں اور نہ اس دور کی قانون سازی ان حدود کی پابند ہے جن کی پابندی اس دور میں کی جاتی تھی۔ اس لئے اب آخر اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے دستوری ضابطے اس وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر تجویز کریں اور خلافت راشدہ کی نظیروں پر عمل شروع کرنے سے پہلے وہ حالات پیدا کرنے کی فکر کریں۔ جن سے وہ نظیریں عملاً تعلق رکھتی تھیں۔ موجودہ حالات میں جہاں تک شرعی معاملات کا تعلق ہے' آخری فیصلہ نہ انتظامیہ پر چھوڑا جا سکتا ہے' نہ مقننہ پر' نہ عدلیہ پر اور نہ مشاورتی کونسل پر۔ ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ مسلمان شرعی امور میں اس پر کامل اعتماد کر سکیں۔ شریعت کو مسخ کرنے والے اجتہادات سے امن میسر آنے کی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلمانوں کی رائے عام کو بیدار کیا جائے اور قوم بحیثیت مجموعی اس قسم کے ہر اجتہاد کی مزاحمت کے لئے تیار ہو۔ رہے عام دستوری مسائل' جن میں شریعت کوئی منفی یا مثبت احکام نہیں دیتی' ان میں مقننہ کو آخری فیصلہ کن اختیارات دے دینا بحالات موجودہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک غیر جانب دار ادارہ ایسا موجود ہونا چاہئے جو یہ دیکھ سکے کہ مقننہ نے کوئی قانون بنانے میں دستور کے حدود سے تجاوز تو نہیں کیا ہے اور ایسا ادارہ ظاہر ہے کہ عدلیہ ہی ہو سکتا ہے۔

(ب) اسلام اور جمہوریت[1]

سوال : جمہوریت کو آج کل ایک بہترین نظام قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام سیاست کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بہت بڑی حد تک جمہوری اصولوں پر مبنی ہے۔ مگر میری نگاہ میں جمہوریت کے بعض نقائص ایسے ہیں جن کے متعلق میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اسلام انہیں کس طرح دور کر سکتا ہے۔ وہ نقائص درج ذیل ہیں :

۱۔ دوسرے سیاسی نظاموں کی طرح جمہوریت میں بھی عملاً آخر کار اقتدار جمہور کے ہاتھوں سے چھن کر اور چند افراد میں مرتکز ہو کر جنگ زرگری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور (Plutocracy) یا (Oligarchy) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا کیا حل ممکن ہے؟

۲۔ عوام کے متنوع اور متضاد مفادات کی بیک وقت رعایت ملحوظ رکھنا نفسیاتی طور پر ایک بڑا مشکل کام ہے۔ جمہوریت اس عوامی ذمہ داری سے کس شکل میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے؟

۳۔ عوام کی اکثریت جاہل' سادہ لوح' بے حس اور شخصیت پرست ہے اور خود غرض عناصر انہیں برابر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں نیابتی اور جمہوری ادارت کے لئے کامیابی سے کام کرنا بڑا دشوار ہے۔

۴۔ عوام کی تائید سے جو انتخابی اور نمائندہ مجالس وجود میں آتی ہیں' ان کے ارکان کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے اور ان کے مابین باہمی بحث و مشاورت اور آخری فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ جلد ٦۔ عدد ٣۔ جون ١٩٦٣ء

آپ رہنمائی فرمائیں کہ آپ کے خیال میں اسلام اپنے جمہوری ادارت میں
ان خرابیوں کو راہ پانے سے کیسے روکے گا؟

جواب : آپ نے جمہوریت کے بارے میں جو تنقید کی ہے اس کے تمام نکات اپنی جگہ درست ہیں' لیکن اس مسئلے میں آخری رائیں قائم کرنے سے پہلے چند اور نکات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اولین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لئے اصولاً" کون سا طریقہ صحیح ہے؟ آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مرضی سے سربراہ کار مقرر کئے جائیں اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو حاصل رہے اسی وقت تک وہ سربراہ کار رہیں؟ یا یہ کہ کوئی شخص یا گروہ خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلائے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کارپردازی میں سے کسی چیز میں بھی ان لوگوں کی مرضی و رائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو' اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی برانصاف ہے تو ہمارے لئے دوسری صورت کی طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہئے اور ساری بحث اس پر ہونی چاہئے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے۔

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہئے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں' ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے اگر انہیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں' تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اول یہ کہ "جمہور" کو مختار مطلق اور حاکم مطلق (Sovereign) فرض کر لیا گیا اور اس بنا پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی

جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے۔ وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (Sovereign) نے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کی پابندی جمہور اور اس کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سہارنے کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لئے عام مسلمانوں کی فرداً فرداً تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہو گی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور یہ جتنی زیادہ ہو گی' امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمہوریت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار مضبوط رائے عام پر ہے اور اس طرح کی رائے عامہ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو' ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے اس میں نہ پھل پھول سکیں اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں۔ اسلام نے اس کے لئے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ بالا تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عمل درآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے' وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اصلاح و ارتقاء کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ

جمہوریت کو تجربے کا موقع ملے۔ تجربات سے بتدریج ایک ناقص مشینری بہتر اور کامل تر بنتی چلی جائے گی۔

(ج) صدر ریاست کو ویٹو کا حق[1]

سوال : کچھ عرصہ سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جا رہی ہیں کہ صدر پاکستان کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کے معزز خطاب سے آراستہ کیا جائے۔ اس تصور میں مزید جان ڈالنے کے لئے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر کو حق تنسیخ ملنا چاہئے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جلیل القدر صحابہ کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا۔ اور منکرین زکوۃ و مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لئے جہاد کا حکم دے کر صحابہؓ کی رائے کو رد کر دیا۔ گویا اس دلیل سے شرعی حیثیت کے ساتھ ویٹو جیسے دھاندلی آمیز قانون کو مستحکم فرمایا جا رہا ہے۔

ان حالات کی روشنی میں جناب والا کی خدمت میں چند سوالات پیش کئے جا رہے ہیں امید ہے کہ بصراحت جوابات سے مطمئن فرمائیں گے۔

۱۔ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آج کے معنوں میں ویٹو استعمال فرمایا تھا؟

اور

۲۔ اگر استعمال فرمایا تھا تو ان کے پاس کوئی شرعی دلیل تھی یا نہیں؟

---

[1] ترجمان القرآن۔ جلد ۶۱۔ عدد ۲۔ نومبر ۱۹۶۳ء

جواب :۔ خلفائے راشدین کی حکومت کے نظام اور آج کل کے صدارتی نظام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کو ایک چیز صرف وہی لوگ قرار دے سکتے ہیں جو اسلام کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ میں نے اس فرق پر مفصل بحث اپنی کتاب اسلامی ریاست میں صفحہ ۳۳۱ تا ۳۴۳ پر کی ہے۔ اسے ملاحظہ فرمالیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کو خلافت کے نظام میں "ویٹو" کے اختیارات سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ موجودہ زمانے کی دستوری اصطلاح سے بالکل مختلف چیز تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے صرف دو فیصلے ہیں جن کو اس معاملہ میں بنائے استدلال بنایا جاتا ہے۔ ایک جیش اسامہ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا مسئلہ۔ ان دونوں معاملات میں حضرت ابوبکرؓ نے محض اپنی ذاتی رائے پر فیصلہ نہیں کر دیا تھا' بلکہ اپنی رائے کے حق میں کتاب و سنت سے استدلال کیا تھا۔ جیش اسامہ کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جس کام کا فیصلہ نبی اکرم ﷺ اپنے عہد میں کر چکے تھے اسے حضور اکرم ﷺ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دینا میرا فرض ہے۔ میں اسے بدل دینے کے اختیارات نہیں رکھتا۔ مرتدین کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جو شخص یا گروہ بھی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتا ہو' اور یہ کہے کہ میں نماز تو پڑھوں گا لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کروں گا' وہ مرتد ہے' اسے مسلمان سمجھنا ہی غلط ہے' لہٰذا ان لوگوں کی دلیل قابل قبول نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے قائلین پر تم کیسے تلوار اٹھاؤ گے۔ یہی دلائل تھے جن کی بناء پر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ یہ اگر "ویٹو" ہے تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا ویٹو ہے نہ کہ سربراہ ریاست کا۔

حقیقت میں اسے ویٹو کہنا ہی سرے سے غلط ہے' کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے استدلال کو تسلیم کر لینے کے بعد اختلاف کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اس کی صحت کے قائل ہو گئے تھے اور اپنی سابقہ رائے سے انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔

حصہ سوم

اسلام کا اصول حکمرانی

- انسان کے بنیادی حقوق
- غیر مسلموں کے حقوق
- اسلام اور عدل اجتماعی
- اسلامی ریاست کے رہنما اصول

(قرآن کی روشنی میں)

باب ۱۲

انسان کے بنیادی حقوق

ایک مدت سے یہ سوال زیر بحث ہے کہ آیا اسلام نے کچھ بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی ہے یا نہیں۔ جو لوگ صرف مغرب کی تاریخ اور اس کے سیاسی ارتقاء ہی سے واقف ہیں وہ اپنی لاعلمی میں اس خیال کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ اس باب میں اصل ترقی مغربی ممالک ہی میں ہوئی ہے حالانکہ یہ بات بداہتاً" غلط ہے۔ اسلام نے انسانی حقوق کی ضمانت اس وقت دی جب دنیا اس تصور سے ناآشنا تھی ------- اور یہی الہامی ہدایت کا اعجاز ہے کہ وہ زندگی کی ان بنیادوں کو واضح کرتی ہے جن تک انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے روٹری کلب لاہور کی دعوت پر انسانی حقوق کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا جسے خلیل حامدی صاحب نے قلم بند کر لیا تھا۔ یہاں اس تقریر کو درج کیا جا رہا ہے۔

یہ انسانی حقوق ایک طرف اسلامی ریاست کے دستور کا ایک ناقابل تغیر جزو ہوتے ہیں اور دوسری طرف اسلام کی تمام پالیسیوں کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حصہ سوئم کا آغاز انہی حقوق کے بیان سے کیا جا رہا ہے۔

مرتب

انسان کے بنیادی حقوق

جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے' انسان کے بنیادی حقوق کا تصور ہمارے لئے کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی نگاہ میں ان حقوق کی تاریخ یو' این' او کے چارٹر سے شروع ہوتی ہو یا انگلستان کے میگنا کارٹا (Magna Carta) سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ لیکن ہمارے لئے اس تصور کا آغاز بہت پہلے سے ہے۔ اس موقع پر میں انسان کے بنیادی حقوق پر روشنی ڈالنے سے پہلے مختصر طور پر یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسانی حقوق کے تصور کا آغاز کیونکر ہوا ہے۔

بنیادی حقوق کا سوال کیوں؟

درحقیقت یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ دنیا میں ایک انسان ہی ایسا ہے جس کے بارے میں خود انسانوں ہی کے درمیان بار بار یہ سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ انسان کے سوا دوسری مخلوقات جو اس کائنات میں بس رہی ہیں' ان کے حقوق خود فطرت نے دیئے ہیں اور آپ سے آپ انہیں مل رہے ہیں' بغیر اس کے کہ وہ اس کے لئے سوچ بچار کریں۔ لیکن صرف انسان وہ مخلوق ہے جس کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اس کے حقوق متعین کئے جائیں۔

اتنی ہی عجیب بات یہ بھی ہے کہ اس کائنات کی کوئی جنس ایسی نہیں ہے جو اپنی جنس کے افراد سے وہ معاملہ کر رہی ہو۔ جو انسان اپنے ہم جنس افراد سے کر رہا ہے بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ حیوانات کی کوئی نوع ایسی نہیں جو کسی دوسری نوع کے

حیوانات پر بھی محض لطف و لذت کے لئے یا ان پر حکمران بننے کے لئے حملہ آور ہوتی ہو۔....

قانون فطرت نے ایک حیوان کو دوسرے حیوان کے لئے اگر غذا بنایا ہے تو وہ صرف غذا کی حد تک ہی اس پر دست درازی کرتا ہے۔ کوئی درندہ ایسا نہیں ہے جو غذائی ضرورت کے بغیر یا اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد بلاوجہ جانوروں کو مارتا چلا جاتا ہو۔ خود اپنے ہم جنسوں کے ساتھ نوع حیوانی کا وہ سلوک نہیں ہے جو انسان کا اپنے افراد کے ساتھ ہے۔ یہ غالباً" اس فضل و شرف کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالٰی نے انسان کو عطا کیا ہے۔ یہ اللہ تعالٰی کی عطا کردہ ذہانت اور قوت ایجاد کا کرشمہ ہے کہ انسان نے دنیا میں یہ غیر معمولی روش اختیار کر رکھی ہے۔

شیروں نے آج تک کوئی فوج تیار نہیں کی۔ کسی کتے نے آج تک دوسرے کتوں کو غلام نہیں بنایا۔ کسی مینڈک نے دوسرے مینڈکوں کی زبان بندی نہ کی۔ یہ انسان ہی ہے جس نے اللہ تعالٰی کی ہدایات سے بے نیاز ہو کر جب اس کی دی ہوئی قوتوں سے کام لینا شروع کیا تو اپنی ہی جنس پر ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اس وقت سے آج تک تمام حیوانات نے اتنے انسانوں کی جان نہیں لی ہے جتنی انسانوں نے صرف دوسری جنگ عظیم میں انسان کی جان لی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو فی الواقع دوسرے انسانوں کے بنیادی حقوق کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ صرف اللہ ہی ہے جس نے انسان کی رہنمائی اس باب میں کی ہے اور اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسانی حقوق کی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ درحقیقت انسانی حقوق متعین کرنے والا انسان کا خالق ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس خالق نے انسان کے حقوق نہایت تفصیل سے بتائے ہیں۔

دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کا ارتقاء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقوق انسانی کے اسلامی منشور کے نکات پر گفتگو کرنے سے قبل دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کی ارتقائی تاریخ پر اجمالی نظر

ڈال لی جائے۔

(۱) انگلستان میں کنگ جان نے ۱۲۱۵ء میں جو میگنا کارٹا جاری کیا تھا' وہ دراصل اس کے امراء (Barons) کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اس کی حیثیت بادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد کی سی تھی اور زیادہ تر امراء ہی کے مفاد میں وہ مرتب کیا گیا تھا۔ عوام الناس کے حقوق کا اس میں کوئی سوال نہ تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس کے اندر وہ معنی پڑھے جو اس کے اصل لکھنے والوں کے سامنے بیان ہوتے تو وہ حیران رہ جاتے۔ سترہویں صدی کے قانون پیشہ لوگوں نے اس میں یہ پڑھا کہ تحقیق جرم روبروئے مجلس قضا (Trial by Jury) حبس بیجا کے خلاف دادرسی (Rights of Habeas Corpus) اور ٹیکس لگانے کے اختیارات پر کنٹرول کے حقوق انگلینڈ کے باشندوں کو اس میں دیئے گئے ہیں۔

(۲) ٹام پین (Tom Paine) ۱۷۳۷ء تا ۱۸۰۹ء کے پمفلٹ "حقوق انسانی" (Rights of Man) نے اہل مغرب کے خیالات پر بہت بڑا انقلابی اثر ڈالا اور اسی کے پمفلٹ (۱۷۹۱ء) نے مغربی ممالک میں حقوق انسانی کے تصور کی عام اشاعت کی۔ یہ شخص الہامی مذہب کا قائل نہ تھا اور ویسے بھی وہ دور الہامی مذہب سے بغاوت کا دور تھا۔ اس لئے مغربی عوام نے یہ سمجھا کہ الہامی مذہب حقوق انسانی کے تصور سے خالی ہے۔

(۳) انقلاب فرانس کی داستان کا اہم ترین ورق "منشور حقوق انسانی" (Declaration of the Rights of Man) ہے جو ۱۷۸۹ء میں نمودار ہوا۔ یہ اٹھارہویں صدی کے اجتماعی فلسفے اور خصوصاً" روسو کے نظریہ معاہدہ عمرانی (Social Contnact Theory) کا ثمرہ تھا۔ اس میں قوم کی حاکمیت' آزادی' مساوات اور ملکیت کے فطری حقوق کا اثبات کیا گیا تھا۔ اس میں ووٹ کے حق' قانون سازی اور ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات پر رائے عام کے کنٹرول' تحقیق جرم روبروئے مجلس قضا (Trial by Jury) وغیرہ کا اثبات کیا

گیا۔[1]

اس منشور حقوق انسانی کو فرانس کی دستور ساز اسمبلی نے انقلاب فرانس کے عہد میں اس غرض کے لئے مرتب کیا تھا کہ جب دستور بنایا جائے تو اس وقت اسے اس کے آغاز میں درج کیا جائے اور دستور میں اس کی سپرٹ کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۴) امریکہ (U.S.A) کی دس ترامیم میں بڑی حد تک وہ تمام حقوق گنوائے گئے ہیں جو برطانوی فلسفہ جمہوریت پر مبنی ہو سکتے تھے۔

(۵) انسانی حقوق و فرائض کا وہ منشور بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جسے بگوٹا کانفرنس میں امریکی ریاستوں نے ۱۹۴۸ء میں منظور کیا۔

(۶) پھر جمہوری فلسفہ کے تحت یو' این' او نے تدریجاً" بہت سے مثبت اور بہت سے تحفظاتی حقوق کے متعلق قراردادیں پاس کیں اور بالآخر "عالمی منشور حقوق انسانی" منظرعام پر آیا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک ریزولیشن پاس کیا جس میں انسانوں کی نسل کشی (Genocide) کو بین الاقوامی قانون کے خلاف ایک جرم قرار دیا گیا۔

پھر دسمبر ۱۹۴۸ء میں نسل کشی کے انسداد اور سزا دہی کے لئے ایک قرارداد پاس کی گئی اور ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ء کو اس کا نفاذ ہوا۔ اس میں نسل کشی کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا کہ حسب ذیل افعال میں سے کوئی فعل اس غرض سے کرنا کہ کسی قومی' نسلی یا اخلاقی (Ethical) گروہ (Group) یا اس کے ایک حصے کو فنا کر

---

[1] خود یہ ایک دلچسپ موضوع مطالعہ ہے کہ مغرب کے افکار کہاں تک اسلامی تعلیمات کے اثرات کا ثمرہ تھے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر الیاس احمد مرحوم کی کتاب (The Social Contract and the Islamic State) مطبوعہ اردو پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد (۱۹۴۴ء) کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ مرتب۔

دیا جائے۔

۱۔ ایسے کسی گروہ کے افراد کو قتل کرنا۔

۲۔ ان کو شدید نوعیت کا جسمانی یا ذہنی ضرر پہنچانا۔

۳۔ اس گروہ پر بالارادہ زندگی کے ایسے احوال کو مسلط کرنا جو اس کی جسمانی بقاء کے لئے کلاً یا جزاً تباہ کن ہوں۔

۴۔ اس گروہ میں سلسلہ تولید کو روکنے کے لئے جبری اقدامات کرنا۔

۵۔ جبری طور پر اس گروہ کی اولادوں کو کسی دوسرے گروہ کی طرف منتقل کرنا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جو "عالمی منشور حقوق انسانی" پاس کیا گیا تھا' اس کے دیباچے میں من جملہ دوسرے عزائم کے ایک یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ:

"بنیادی انسانی حقوق میں' فرد انسانی کی عزت و اہمیت میں مردوں اور عورتوں کے مساویانہ حقوق میں اعتقاد کو موثر بنانے کے لئے۔"

نیز اس میں اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ:

"انسانی حقوق کا احترام قائم کرنے اور نسل و صنف یا زبان و مذہب کا امتیاز کئے بغیر تمام انسانوں کو بنیادی آزادیاں دلوانے کے کام میں بین الاقوامی تعاون کا حصول۔"

اسی طرح دفعہ ۵۵ میں اقوام متحدہ کا یہ منشور کہتا ہے:

"مجلس اقوام متحدہ انسانی حقوق اور سب کے لئے اساسی آزادیوں کے عالم گیر احترام اور ان کی نگہداشت میں اضافہ کرے گی۔"

اس پورے منشور کے کسی جز سے کوئی اختلاف کسی بھی قوم کے نمائندوں نے نہیں کیا۔ اختلاف نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ صرف عام اصولوں کا اعلان و اظہار تھا۔ کسی نوعیت کی پابندی کسی پر بھی عائد نہ ہوتی تھی۔ یہ کوئی معاہدہ نہیں ہے جس کی بناء پر دستخط کرنے والی تمام حکومتیں اس کی پابندی پر مجبور ہوں اور بین الاقوامی

قانون کے مطابق ان پر قانونی وجوب عائد ہوتا ہو۔ اس میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ ایک معیار ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بھی بعض ملکوں نے اس کے حق میں یا اس کے خلاف ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔[1]

اب دیکھ لیجئے کہ اس منشور کے عین سائے میں انسانیت کے بالکل ابتدائی حقوق کا قتل عام دنیا میں ہو رہا ہے اور خود مہذب ترین اور سرکردہ ممالک کے اپنے ہاں ہو رہا ہے جو اسے پاس کرنے والے تھے۔[2]

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول تو مغربی دنیا میں انسانی حقوق کا تصور ہی دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا۔ دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جا رہا ہے تو ان کے پیچھے کوئی سند (Authority) اور کوئی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے' بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے حقوق انسان کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلام کے لئے اعتقاد' اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔ پھر ان حقوق کو عملاً قائم کرنے کی بے مثل نظیریں بھی حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے چھوڑی ہیں۔

اب میں ان حقوق کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں جو اسلام نے انسان کو دیئے ہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ اس اجلاس میں ۴۸ ممالک نے ان حقوق کے حق میں ووٹ دیئے اور ۸ نے ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔ ووٹ سے احتراز کرنے والوں میں روس بھی شامل تھا۔ مرتب۔

[2] مہذب دنیا میں مہذب انسان اپنے ہی ابنائے نوع کے ساتھ کیا کر رہا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو (Fanaticisim Intolerance and Islam) از خورشید احمد۔ مرتب۔

۱۔ حرمت جان یا جینے کا حق

قرآن مجید میں دنیا کے سب سے پہلے واقعہ قتل کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا اولین سانحہ تھا جس میں ایک انسان نے دوسرے انسان کی جان لی۔ اس وقت پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی کہ انسان کو انسانی جان کا احترام سکھایا جائے اور اسے بتایا جائے کہ ہر انسان جینے کا حق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

من قتل نفسا م بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا
ط ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعا۔ (المائدہ : ۳۲)

"جس نے کسی متنفس کو' بغیر اس کے کہ اس نے قتل نفس کا ارتکاب کیا ہو' یا زمین میں فساد انگیزی کی ہو' قتل کر دیا' اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اسے زندہ رکھا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔"

اس آیت میں قرآن کریم نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانی دنیا کا قتل بتایا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ایک انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ "احیاء" کے معنی ہیں زندہ کرنا۔ دوسرے الفاظ میں اگر کسی شخص نے انسانی زندگی کو بچانے کے لئے کوشش کی اس نے انسان کو زندہ کرنے کا کام کیا۔ یہ کوشش اتنی بڑی نیکی ہے کہ اسے ساری انسانیت کے زندہ کرنے کے برابر ٹھہرایا گیا ہے۔ اس اصول سے صرف دو حالتیں مستثنٰی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو اور اسے قصاص کے طور پر قتل کیا جائے دوسری یہ کہ کوئی شخص زمین میں فساد برپا کرے تو اسے قتل کیا جائے۔ ان دو حالتوں کے ماسوا انسانی جان کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

---

[۱] مزید ملاحظہ ہو آیت لا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ (بنی اسرائیل : ۳۳)
"قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔"

انسانی جان کے تحفظ کا یہ اصول اللہ تعالیٰ نے تاریخ انسانی کے ابتدائی دور میں واضح کر دیا تھا۔ انسان کے بارے میں یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ تاریکی میں پیدا ہوا ہے اور اپنے ہم جنسوں کو قتل کرتے کرتے کسی مرحلہ پر اس نے یہ سوچا کہ انسان کو قتل نہیں کرنا چاہئے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی پر مبنی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع سے انسان کی رہنمائی کی ہے اور اس رہنمائی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اس نے انسان کو انسان کے حقوق سے آشنا کیا۔

۲۔ معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ

دوسری بات جو قرآن سے معلوم ہوتی ہے اور نبی اکرم ﷺ کے ارشادات سے واضح ہے' یہ ہے کہ عورت' بچے' بوڑھے' زخمی اور بیمار کے اوپر کسی حال میں بھی دست اندازی جائز نہیں ہے -------- خواہ وہ اپنی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا دشمن قوم سے ------ الا یہ کہ جنگ کی صورت میں یہ افراد خود برسر پیکار ہوں۔ ورنہ دوسری ہر صورت میں ان پر دست اندازی کی ممانعت ہے۔ یہ اصول اپنی قوم کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ یہی اصول برتا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس معاملہ میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں۔ خلفائے راشدین کا یہ حال تھا کہ وہ جب دشمنوں سے مقابلہ کے لئے فوجیں روانہ کرتے تھے تو وہ فوج کو یہ صاف ہدایات دیتے تھے کہ دشمن پر حملہ کی صورت میں کسی عورت' بچے' بوڑھے' زخمی اور بیمار پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

۳۔ تحفظ ناموس خواتین

ایک اور اصولی حق جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے اور حدیث میں بھی اس کی تفصیلات موجود ہیں' یہ ہے کہ عورت کی عصمت ہر حال میں واجب الاحترام ہے' یعنی جنگ کے اندر دشمنوں کی عورتوں سے بھی اگر سابقہ پیش آئے تو کسی

مسلمان سپاہی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالے۔ قرآن کی رو سے بدکاری مطلقاً" حرام ہے خواہ وہ کسی عورت سے کی جائے' قطع نظر اس سے کہ وہ عورت مسلمان ہو یا غیر مسلم' اپنی قوم کی ہو یا غیر قوم کی' دوست ملک کی ہو یا دشمن ملک کی۔

۴۔ معاشی تحفظ

ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ بھوکا آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے روٹی دی جائے۔ ننگا ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے کپڑا دیا جائے۔ زخمی اور بیمار آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے علاج کی سہولت فراہم کی جائے' قطع نظر اس سے کہ وہ بھوکا' ننگا یا زخمی یا مریض شخص دشمن ہو یا دوست۔ یہ عمومی (Universal) حقوق میں سے ہے' دشمن کے ساتھ بھی ہم یہی سلوک کریں گے۔ اگر دشمن قوم کا کوئی فرد ہمارے پاس آ جائے گا تو ہمارا فرض ہو گا کہ اسے بھوکا ننگا نہ رہنے دیں اور زخمی یا بیمار ہو تو اس کا علاج کرائیں۔[1]

۵۔ عدل و انصاف

قرآن کریم کا یہ اٹل اصول ہے کہ انسان کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا۔ اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔

(المائدہ: ۸)

---

[1] وفی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ (الذریات: ۱۹)

"اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محروم دونوں کا حق ہے۔"

نیز یہ آیت ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا۔ (الدھر: ۸)

"اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

"کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔
عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے۔"

اس آیت میں اسلام نے یہ اصول متعین کر دیا کہ انسان کے ساتھ ----- ایک فرد کے ساتھ بھی اور ایک قوم کے ساتھ بھی ---- بہر حال انصاف کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ اسلام کے نزدیک یہ قطعاً" درست نہیں ہے کہ دوستوں کے ساتھ تو ہم عدل و انصاف برتیں اور دشمنوں کے ساتھ اس اصول کو نظرانداز کر دیں۔

۶۔ نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون

ایک اور اصول جو قرآن معین کرتا ہے' یہ ہے کہ نیکی اور حق رسانی کے معاملے میں ہر ایک کے ساتھ تعاون کیا جائے اور برائی اور ظلم کے معاملہ میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ برائی خواہ بھائی کر رہا ہو تو بھی ہم اس کے ساتھ تعاون نہ کریں اور نیکی اگر دشمن بھی کر رہا ہو تو اس کی جانب دست تعاون بڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تعاونوا علی الابر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔

(المائدہ: ۲)

"جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں' ان میں سب سے تعاون کرو۔ اور جو گناہ کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔"

بر کے معنی صرف نیکی ہی نہیں' بلکہ عربی زبان میں یہ لفظ حق رسانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کو حقوق دلوانے میں اور تقویٰ اور پرہیزگاری میں ہم ہر ایک کی مدد کریں۔ قرآن کا یہ مستقل اور دائمی اصول ہے۔

(۷) مساوات کا حق

ایک اور اصول جسے قرآن کریم نے بڑے زور و شور کے ساتھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان یکساں ہیں۔ اگر کسی کو فضیلت حاصل ہے تو وہ اخلاق کے

اعتبار سے ہے۔ اس معاملے میں قرآن کا ارشاد ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثی وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۴۹ : ۱۳)

"اے لوگو' ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔"

اس میں پہلی بات یہ بتائی گئی کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے ہیں۔ یہ مختلف نسلیں' مختلف رنگ' مختلف زبانیں درحقیقت انسانی دنیا کے لئے کوئی معقول وجہ تقسیم نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ بتائی کہ ہم نے قوموں کی یہ تقسیم صرف تعارف کے لئے کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک برادری' ایک قوم اور ایک قبیلہ کو دوسرے پر کوئی فخر و فضیلت نہیں ہے کہ وہ اپنے حقوق تو بڑھا چڑھا کر رکھے اور دوسروں کے کم۔ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی یہ تفریقیں کی ہیں' شکلیں ایک دوسرے سے مختلف بنائی ہیں یا زبانیں ایک دوسرے سے الگ رکھی ہیں' تو یہ سب چیزیں فخر کے لئے نہیں ہیں بلکہ صرف اس لئے ہیں کہ باہم تمیز پیدا کر سکیں۔ اگر تمام انسان یکساں ہوتے تو تمیز نہ کی جا سکتی۔ اس لحاظ سے یہ تقسیم فطری ہے۔ لیکن دوسروں کے حقوق مارنے اور بے جا امتیاز برتنے کے لئے نہیں ہے۔ عزت و افتخار کی بنیاد اخلاقی حالت پر ہے۔ اس بات کو نبی اکرم ﷺ نے ایک دوسرے طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جو تقریر ارشاد فرمائی' اس میں فرمایا۔

لا فضل لعربی علیٰ اعجمی ولا لاعجمی علیٰ عربی ولا لاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر الا بالتقوی ولا فضل للانساب۔

"کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر' نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر ———— ماسوا

تقویٰ کے اور نسبی بنیادوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔"

یعنی فضیلت دیانت اور تقویٰ پر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص چاندی سے پیدا کیا گیا ہو اور کوئی پتھر سے اور کوئی مٹی سے۔ بلکہ سب انسان یکساں ہیں۔"[1]

۸۔ معصیت سے اجتناب کا حق

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی شخص کو معصیت کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ کسی پر یہ واجب یا اس کے لئے یہ جائز ہے کہ اس کو اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو وہ اطاعت کرے۔ قانون قرآن کی رو سے اگر کوئی افسر اپنے ماتحت کو ناجائز کاروائیوں کا حکم دیتا ہے یا کسی پر بے جا دست درازی کا حکم دیتا ہے تو ماتحت کے لئے اس معاملے میں اپنے افسر کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے **لاطاعتہ لمخلوق فی معصیتہ الخالق**۔ جن چیزوں کو خالق نے ناجائز ٹھہرایا ہے اور معصیت بتایا ہے کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ ان کے ارتکاب کا کسی کو حکم دے۔ نہ حکم دینے والے کے لئے معصیت کا حکم دینا جائز ہے اور نہ کسی دوسرے شخص کے لئے ایسے حکم کی تعمیل جائز ہے۔

۹۔ ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق

اسلام کا ایک عظیم الشان اصول یہ ہے کہ کسی ظالم کو اطاعت کا حق نہیں

---

[1] نظام فرعونی کو قرآن نے جن وجوہ سے باطل قرار دیا ہے ان میں سے ایک یہ تھی کہ۔

ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم۔ (القصص : ۴)

"بے شک فرعون ملک میں بڑا مغرور ہو گیا تھا اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا اور ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ .... الخ"

یعنی اسلام اس کا روادار نہیں کہ کسی معاشرہ میں انسان کو فوقانی اور تحتانی یا حکمران اور محکوم طبقوں میں بانٹا جائے۔

ہے۔ قرآن کریم میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام مقرر کیا اور فرمایا کہ انی جاعلک للناس اماما تو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے سوال کیا کہ ومن ذریتی (کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟) تو اللہ نے جواب میں ارشاد فرمایا لا ینال عھدی الظالمین[1] (میرا وعدہ ظالموں کے متعلق نہیں ہے) عہد کا لفظ یہاں اس معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ انگریزی زبان میں (Letter of Appointment) کا مفہوم ہے۔ اردو میں پروانہ امر کہیں گے۔

اس آیت میں اللہ نے صاف بتا دیا کہ ظالموں کو اللہ کی طرف سے کوئی ایسا پروانہ امر نہیں کہ وہ دوسرے سے اطاعت کا مطالبہ کریں۔[2] چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی ظالم اس امر کا مستحق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کا امام ہو۔ اگر ایسا شخص امام بن جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ اسے صرف برداشت کیا جائے۔[3]

---

[1] القرآن البقرہ: ۱۲۴)

[2] مزید یہ صریح آیات سامنے رہیں۔ ولا تطیعوا امر المسرفین۔ (الشعراء: ۱۵۱) اور حدود سے نکل جانے والوں کی اطاعت نہ کرو۔ (۲) ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا۔ (الکہف: ۲۸) اور ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔ (۳) واجتنبوا الطاغوت (النحل: ۳۶) اور طاغوت (خدا کے باغی) سے بچتے رہو۔ (۴) وتلک عاد قف جحدوا بایات ربہم وعصوا رسلہ واتبعوا امر کل جبار عنید۔ (ھود: ۵۹) یہ قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کا کہنا نہ مانا اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی تازہ ترین کتاب "خلافت و ملوکیت" یہ سلسلہ مضامین ترجمان القرآن (۶۵-۱۹۶۴ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ مرتب۔

۱۰۔ سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق

انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک بڑا حق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد حکومت میں حصہ دار ہیں۔ تمام افراد کے مشورے سے حکومت ہونی چاہئے۔ قرآن نے فرمایا۔ لیستخلفنہم فی الارض۔[1] (اللہ تعالیٰ ان کو ------ یعنی اہل ایمان کو ------- زمین میں خلافت دے گا) یہاں جمع کا لفظ استعمال کیا اور فرمایا کہ ہم بعض افراد کو نہیں بلکہ پوری قوم کو خلافت دیں گے۔ حکومت ایک فرد کی یا ایک خاندان کی یا ایک طبقے کی نہیں' بلکہ پوری ملت کی ہوگی اور تمام افراد کے مشورے سے وجود میں آئے گی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ و امرھم شوریٰ بینہم[2] یعنی یہ حکومت آپس کے مشورے سے چلے گی۔ اس معاملے میں حضرت عمرؓ کے صاف الفاظ موجود ہیں کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ان پر حکومت کرے۔ مسلمان راضی ہوں تو ان پر حکومت کی جا سکتی ہے اور راضی نہ ہوں تو نہیں کی جا سکتی۔ اس حکم کی رو سے اسلام ایک جمہوری و شورائی حکومت کا اصول قائم کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری بدقسمتی سے تاریخ کے ادوار میں ہمارے اوپر بادشاہیاں مسلط رہی ہیں۔ اسلام نے ہمیں ایسی بادشاہیوں کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ یہ ہماری اپنی حماقتوں کا نتیجہ ہیں۔

۱۱۔ آزادی کا تحفظ

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی انسان کی آزادی عدل کے بغیر سلب نہیں کی جا

---

[1] القرآن (النور: ۵۵)

[2] القرآن (الشوریٰ: ۳۸) نیز آیت وشاورھم فی الامر۔ (آل عمران: ۱۵۹) "اور اپنے کاموں میں ان (لوگوں) سے مشورہ کیا کرو۔"

سکتی۔ حضرت عمرؓ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ :۔ لا یوسر رجل فی الاسلام الا بحق۔[1] اس کی رو سے عدل کا وہ تصور قائم ہوتا ہے جسے موجودہ اصطلاح میں باضابطہ عدالتی کارروائی (Judicial Process of Law) کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی آزادی سلب کرنے کے لئے اس پر متعین الزام لگانا' کھلی عدالت میں اس پر مقدمہ چلانا اور اسے دفاع کا پورا پورا موقع دینا۔ اس کے بغیر کسی کارروائی پر عدل کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل معمولی عقل (Common Sense) کا تقاضا ہے کہ ملزم کو صفائی کا موقع دیئے بغیر انصاف نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایک شخص کو پکڑا جائے اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر بند کر دیا جائے۔ اسلامی حکومت اور عدلیہ کے لئے انصاف کے تقاضے پورے کرنا قرآن نے واجب ٹھہرایا ہے۔[2]

۱۲۔ تحفظ ملکیت

ایک بنیادی حق یہ ہے کہ قرآن واضح طور پر انفرادی ملکیت کا تصور دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ (البقرہ : ۱۸۸)

"تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ۔"

اگر قرآن و حدیث اور فقہ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مال کو کھانے کے کون کون سے طریقے باطل ہیں۔ اسلام نے ان طریقوں کو مبہم نہیں* رکھا ہے۔ اس اصول کی رو سے کسی آدمی سے ناجائز طریقے

---

[1] "اسلام میں کسی آدمی کو سوائے حق کے نہیں پکڑا جائے گا۔" بحوالہ موطا امام مالک۔

[2] آیت واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ (النساء : ۵۸)

"اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔"

سے کوئی مال حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کسی شخص کو یا کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قانون توڑ کر اور ان متعین شکلوں کے علاوہ جو خود اسلام نے واضح کر دی ہیں' کسی کی ملکیت پر دست درازی کرے۔

۱۳۔ عزت کا تحفظ

انسان کا یہ بھی بنیادی حق ہے کہ اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے۔ سورہ حجرات میں اس حق کی پوری تفصیل موجود ہے۔ مثلاً" ارشاد ہوتا ہے کہ

۱۔ لا یسخر قوم من قوم

"تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے۔"

۲۔ ولا تنابزوا بالالقاب۔

"اور تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو۔"

۳۔ ولا یغتب بعضکم بعضا۔ (الحجرات: ۱۱-۱۲)

"اور تم ایک دوسرے کی برائی پیٹھ پیچھے بیان نہ کرو۔"

یعنی جتنی شکلیں بھی انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے کی ہو سکتی ہیں۔ ان سے منع کر دیا گیا۔ وضاحت سے کہہ دیا کہ انسان خواہ موجود ہو خواہ موجود نہ ہو اس کا نہ مذاق اڑایا جا سکتا ہے' نہ برے القاب دیئے جا سکتے ہیں اور نہ اس کی برائی کی جا سکتی ہے۔ ہر شخص کا یہ قانونی حق ہے کہ کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے اور ہاتھ سے یا زبان سے اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔[۱]

۱۴۔ نجی زندگی کا تحفظ

اسلام کے بنیادی حقوق کی رو سے ہر آدمی کو (Privacy) یعنی نجی زندگی کو

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن۔ سورہ الحجرات۔ ترجمان القرآن۔ بابت جون ۱۹۶۶ء

محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس معاملے میں سورہ نور میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا۔[2] اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو' جب تک کہ ان سے اجازت نہ لے لو۔ سورہ حجرات میں فرما دیا گیا لا تجسسوا۔[3] (تجسس نہ کرو) نبی اکرم ﷺ کے ارشاد مبارک ہے کہ ایک آدمی کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے گھر سے دوسرے آدمی کے گھر میں جھانکے۔ ایک شخص کو پورا پورا آئینی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں دوسروں کے شور و شغب سے' دوسروں کی تاک جھانک سے اور دوسروں کی مداخلت سے محفوظ و مامون رہے۔ اس کی گھریلو بے تکلفی اور پردہ داری برقرار رہنی چاہئے۔ مزید برآں یہ کہ شخص کو دوسرے کا خط اوپر سے نگاہ ڈال کر دیکھنے کا حق بھی نہیں ہے۔ کجا کہ اسے پڑھا جائے۔ اسلام انسان کی پرائیویسی کا پورا پورا تحفظ کرتا ہے اور صاف ممانعت کرتا ہے کہ گھروں میں تاک جھانک نہ کی جائے اور کسی کی ڈاک نہ دیکھی جائے۔ الا یہ کہ کسی شخص کے متعلق معتبر ذریعہ سے یہ اطلاع مل جائے کہ وہ کوئی خطرناک کام کر رہا ہے۔ ورنہ خواہ مخواہ کسی کے حالات کا تجسس کرنا شریعت اسلامی میں جائز نہیں ہے۔

۱۵- ظلم کے خلاف احتجاج کا حق

اسلام کے بنیادی حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم ط (النساء : ۱۴۸)

"اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے' الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔"

---

[2] القرآن (النور : ۲۷) [3] القرآن (الحجرات : ۱۲)

یعنی مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ظالم کے خلاف آواز اٹھائے۔

۱۶۔ آزادی اظہار رائے

ایک اور اہم چیز جسے آج کے زمانہ میں آزادی اظہار (Freedom of Expression) کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے دوسری زبان میں بیان کرتا ہے۔ مگر دیکھیے مقابلتاً" قرآن کا کتنا بلند تصور ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ "امر بالمعروف"[۱] اور "نہی عن المنکر" نہ صرف انسان کا حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے۔ قرآن کی رو سے بھی اور حدیث کی ہدایات کے مطابق بھی۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ بھلائی کے لئے لوگوں سے کہے اور برائی سے روکے۔ اگر کوئی برائی ہو رہی ہو تو صرف یہی نہیں کہ بس اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ اس کے انسداد کی کوشش بھی فرض ہے۔ اور اگر اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاتی اور اس کے انسداد کی فکر نہیں کی جاتی تو الٹا گناہ ہو گا۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھے۔ اگر اس معاملے میں مسلمان کی آواز بند کی جائے تو اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے بھلائی کے فروغ سے روکا تو اس نے نہ صرف ایک بنیادی حق سلب کیا بلکہ ایک فرض کی ادائیگی سے روکا۔ معاشرے کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ انسان کو ہر حالت میں یہ حق حاصل رہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے تنزل کے اسباب بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ **کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ۔**[۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو آیت **کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔** (آل عمران : ۱۱۰) تم بہترین امت ہو جو انسانیت کی طرف بھیجے گئے ہو۔ نیکی کا حکم کرتے ہو' برائیوں سے روکتے ہو۔

[۲] القرآن (المائدہ : ۷۹)

(وہ برائیوں سے ایک دوسرے کو باز نہ رکھتے تھے) یعنی کسی قوم میں اگر یہ حالات پیدا ہو جائیں کہ برائی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہ ہو تو آخر کار رفتہ رفتہ برائی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے اور وہ پھلوں کے سڑے ہوئے ٹوکرے کے مانند ہو جاتی ہے جس کو اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس قوم کے عذاب الٰہی کے مستحق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

۱۷۔ ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق

اسلام نے "لا اکراہ فی الدین" (البقرہ: ۲۵۶) "دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔" کا اصول انسانیت کو دیا اور اس کے تحت ہر شخص کو آزادی عطا کی کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ قوت کا استعمال اسلام میں اگر ہے تو دو ضروریات کے لئے ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی ریاست کے وجود اور اس کے استقلال کی سلامتی کے لئے میدان جہاد میں دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ نظم و نسق اور امن و امان کے تحفظ کے لئے جرائم اور فتنوں کا سدباب کرنے کے لئے عدالتی اور انتظامی اقدامات کئے جائیں۔

ضمیر و اعتقاد کی آزادی ہی کا قیمتی حق تھا جسے حاصل کرنے کے لئے مکہ کے سیزدہ سالہ دور ابتلاء میں مسلمانوں نے ماریں کھا کھا کر کلمہ حق کہا اور بالآخر یہ حق ثابت ہو کے رہا۔ مسلمانوں نے یہ حق جس طرح اپنے لئے حاصل کیا تھا' اسی طرح دوسرے کے لئے بھی اس کا پورا پورا اعتراف کیا۔ اسلامی تاریخ اس بات سے خالی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو' یا کسی قوم کو مار مار کر کلمہ پڑھوایا ہو۔

۱۸۔ مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق

اسلام اس امر کا روادار نہیں کہ مختلف مذہبی گروہ ایک دوسرے کے خلاف وریدہ دہنی سے کام لیں اور ایک دوسرے کے پیشواؤں پر کیچڑ اچھالا کریں۔ قرآن

میں ہر شخص کے مذہبی معتقدات اور اس کے پیشوایان مذہب کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ ہدایت یہ ہے کہ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللّٰہ[1] (ان کو برا بھلا نہ کہو جنہیں یہ لوگ اللہ کے ماسوا معبود بنا کر پکارتے ہیں) یعنی مختلف مذاہب اور معتقدات پر دلیل سے گفتگو کرنا اور معقول طریق سے تنقید کرنا یا اظہار اختلاف کرنا تو آزادی اظہار کے حق میں شامل ہے' مگر دل آزاری کے لئے بدگوئی کرنا روا نہیں۔

۱۹۔ آزادی اجتماع کا حق

آزادی اظہار کے عین منطقی نتیجے کے طور پر آزادی اجتماع کا حق نمودار ہوتا ہے۔ جب اختلاف آرا کو انسانی زندگی کی ایک اٹل حقیقت کے طور پر قرآن نے بار بار پیش کیا ہے تو پر اس امر کی روک تھام کہاں ممکن ہے کہ ایک طرح کی رائے رکھنے والے لوگ آپس میں مربوط ہوں۔ ایک اصول اور نظریئے پر مجتمع ہونے والی ملت کے اندر بھی مختلف مدارس فکر ہو سکتے ہیں اور ان کے متوسلین بہرحال باہم دگر قریب تر ہوں گے۔ قرآن کہتا ہے:

> ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون غن المنکر۔ (آل عمران : ۱۰۴)
>
> "اور تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ضرور ہونا چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے' معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔"

عملی زندگی میں جب "خیر" "معروف" اور "منکر" کے تفصیلی تصورات میں فرق واقع ہوتا ہے تو ملت کی اصولی وحدت کے قائم رہتے ہوئے بھی اس کے اندر مختلف مدارس فکر تشکیل پاتے ہیں اور ---------- یہ بات معیار مطلوب سے

---

[1] القرآن (الانعام : ۱۰۸)

کتنی بھی فروتر ہو' گروہوں اور پارٹیوں کا ظہور ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں کلام میں بھی' فقہ و قانون میں بھی اور سیاسی نظریات میں بھی اختلاف آرا ہوا اور اس کے ساتھ مختلف گروہ وجود میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی دستور اور منشور حقوق کے لحاظ سے کیا مختلف اختلافی آرا رکھنے والوں کے لئے آزادی اجتماع کا حق ہے؟ یہ سوال سب سے پہلے حضرت علیؓ کے سامنے خوارج کے ظہور پر پیش آیا اور آنجنابؓ نے ان کے لئے آزادی اجتماع کے حق کو تسلیم کر لیا۔ انہوں نے خارجیوں سے فرمایا "جب تک تم تلوار اٹھا کر زبردستی اپنا نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو گے' تمہیں پوری آزادی حاصل رہے گی۔"

۲۰۔ عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت

اسلام میں آدمی صرف اپنے اعمال اور اپنے جرائم کے لئے جواب دہ ہے۔ دوسروں کے اعمال اور دوسروں کے جرائم میں اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے اصول یہ قرار دیا ہے کہ:

ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ (الانعام: ۱۶۴)

"اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے پر مکلف نہیں ہے۔"

اسلامی قانون میں اس کی گنجائش نہیں کہ کرے ڈاڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔

۲۱۔ شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی

اسلام میں ہر شخص کو یہ تحفظ حاصل ہے کہ تحقیق کے بغیر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ اس سلسلے میں قرآن کی واضح ہدایت ہے کہ کسی کے خلاف اطلاع ملنے پر تحقیقات کر لو تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کے خلاف لاعلمی میں

کوئی کارروائی کر بیٹھو۔[1] علاوہ بریں قرآن نے یہ ہدایت بھی دی ہے۔

اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔ (الحجرات: ۱۲)

"بہت سے گمانوں سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔"

اجمالاً" یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جو اسلام نے انسانوں کو عطا کئے ہیں۔ ان کا تصور بالکل واضح اور مکمل ہے جو انسانی زندگی کے آغاز ہی سے انسان کو بتا دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت بھی دنیا میں انسانی حقوق کا جو اعلان (Declaration of Human Rights) ہوا ہے اسے کسی قسم کی سند اور قوت نافذہ حاصل نہیں ہے۔ بس ایک بلند معیار پیش کر دیا گیا ہے۔ اس معیار پر عمل درآمد کی کوئی قوم پابند نہیں ہے۔ نہ اور کوئی ایسا موثر معاہدہ ہے جو ان حقوق کو ساری قوموں سے منوا سکے۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے پابند ہیں۔ خدا اور رسول ﷺ نے بنیادی حقوق کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ جو مملکت اسلامی ریاست بننا چاہے گی اسے یہ حقوق لازماً" دینے ہوں گے۔ مسلمانوں کو بھی یہ حقوق دیئے جائیں گے اور دوسری اقوام کو بھی۔ اس معاملہ میں کسی ایسے معاہدے کی حاجت نہیں ہو گی کہ فلاں قوم اگر ہمیں یہ حق دے گی تو ہم اسے دیں گے۔ بلکہ مسلمانوں کو بہرحال یہ حقوق دینے ہوں گے۔ دوستوں کو بھی اور دشمنوں کو بھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ان جائکم فاسق م بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نٰدمین۔ (الحجرات: ۶)

"اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لو۔ کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو۔ پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔"

باب ۱۳

غیر مسلموں کے حقوق

دستوری مسائل میں سب سے پیچیدہ مسئلہ اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ذہنی انتشار پھیل رہا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے حصول آزادی کے فوراً بعد اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی تھی اور اس کے تمام پہلوؤں کو واضح کر کے یہ بتایا تھا کہ اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق کیا ہیں؟ مولانا موصوف کا وہی مقالہ ان کی نظر ثانی کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مقالہ ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۴۸ء سے لیا جا رہا ہے۔ اس میں بھی ایک طرف غیر مسلموں کی دستوری پوزیشن کو واضح کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف اسلامی ریاست اور مسلم معاشرہ کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کی گئی ہے ------------ یہی وہ اصول ہیں جن کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کو غیر مسلموں سے معاملہ کرنا ہے۔

مرتب

غیر مسلموں کے حقوق

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق پر بحث کرنے سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اسلام کی حکومت دراصل ایک اصولی (Ideological) حکومت ہے اور اس کی نوعیت ایک قومی جمہوری (National Democratic) حکومت سے قطعاً مختلف ہے۔ دونوں قسم کی مختلف ریاستوں کے اس نوعی فرق کا مسئلہ زیر بحث پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کو حسب ذیل نکات سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے:

۱۔ اسلامی حکومت اپنے حدود میں رہنے والے لوگوں کو اس لحاظ سے تقسیم کرتی ہے کہ کون ان اصولوں کو مانتے ہیں جن پر اسلامی حکومت کی بنا رکھی گئی ہے اور کون انہیں نہیں مانتے، یعنی مسلم اور غیر مسلم۔

۱۔ قومی حکومت انہیں اس لحاظ سے تقسیم کرتی ہے کہ کون لوگ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو دراصل ریاست کی بنانے اور چلانے والی ہے اور کون لوگ اس سے تعلق نہیں رکھتے، آج کل کی اصطلاح میں اس کے لئے اکثریت اور اقلیت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

۲۔ اسلامی حکومت کو چلانا دراصل ان لوگوں کا کام ہوتا ہے جو اس کے اصولوں کو مانتے ہوں۔ وہ اپنے

۲۔ قومی حکومت اپنی رہنمائی و کارفرمائی کے لئے صرف اپنے افراد قوم ہی پر اعتماد کرتی ہے اور دوسری

انتظام میں غیر مسلموں کی خدمات تو ضرور استعمال کر سکتی ہے۔ مگر رہنمائی و کار فرمائی کے مناصب انہیں نہیں دے سکتی۔

قلیل التعداد قومیں جو اس کے شہریوں میں شامل ہوں، اس اعتماد کی مستحق نہیں ہوتیں۔ یہ بات چاہے صاف صاف کہی نہ جاتی ہو، مگر عملاً ہوتا اسی طرح ہے۔ اور اگر اقلیت کے کسی فرد کو کبھی کوئی کلیدی منصب دیا بھی جاتا ہے تو یہ محض ایک نمائشی حرکت ہوتی ہے پالیسیوں کی تشکیل میں فی الحقیقت اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

۳۔ اسلامی حکومت عین اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے اس بات پر مجبور ہے کہ مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان واضح امتیاز قائم کرے اور صاف صاف بتا دے کہ وہ غیر مسلموں کو کیا حقوق دے سکتی ہے اور کیا نہیں دے سکتی۔

۳۔ قومی حکومت کے لئے یہ منافقانہ چال بازی آسان ہے کہ وہ ملک کے تمام باشندوں کو نظریئے کے اعتبار سے ایک قوم قرار دے کر کاغذ پر سب کو مساوی حقوق دے دے، مگر عملاً اکثریت اور اقلیت کا پورا امتیاز قائم رکھے اور زمین پر اقلیتوں کو کسی قسم کے حقوق نہ دے۔

۴۔ اسلامی حکومت کو اپنے نظام میں غیر مسلم عناصر کی موجودگی سے جو پیچیدگی پیش آتی ہے اسے وہ اس طرح حل کرتی ہے کہ انہیں متعین

۴۔ قومی حکومت کو اپنے نظام میں غیر قومی عناصر کی شمولیت سے جو پیچیدگی پیش آتی ہے اسے حل کرنے کے لئے وہ تین مختلف تدبیریں اختیار کرتی ہے

حقوق کا ذمہ (Guarantee) دے کر مطمئن کر دیتی ہے' اپنے اصولی نظام کے حل و عقد میں ان کی مداخلت روک دیتی ہے اور ان کے لئے ہر وقت یہ دروازہ کھلا رکھتی ہے کہ اگر اسلام کے اصول انہیں پسند آ جائیں تو وہ انہیں قبول کر کے حکمراں جماعت میں شامل ہو جائیں۔

ایک یہ کہ ان کی انفرادیت کو بتدریج مٹا کر اپنے اندر جذب کر لے۔ دوسرے یہ کہ ان کی ہستی کو محو کرنے کے لئے قتل و غارت اور اخراج کے ظالمانہ طریقے اختیار کرے۔ تیسرے یہ کہ ان کو اپنے اندر اچھوت بنا کر رکھ دے۔ یہ تینوں تدبیریں دنیا کی قومی جمہوری ریاستوں میں بکثرت اختیار کی گئی ہیں' اب تک کی جا رہی ہیں اور آج ہندوستان میں خود مسلمانوں کو ان کا تلخ تجربہ ہو رہا ہے۔

۵- اسلامی حکومت ذمی غیر مسلموں کو وہ تمام حقوق دینے پر مجبور ہے جو شریعت نے ان کے لئے مقرر کئے ہیں۔ ان حقوق کو سلب کرنے یا ان میں کمی کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ البتہ مسلمانوں کو یہ اختیار ضرور حاصل ہے کہ وہ ان حقوق کے علاوہ کچھ مزید حقوق انہیں عطا کر دیں' بشرطیکہ یہ اضافہ اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتا ہو۔

۵- قومی جمہوری حکومت میں اقلیتوں کو جو حقوق بھی دیئے جاتے ہیں وہ اکثریت کے عطا کردہ ہوتے ہیں اور اکثریت جس طرح انہیں عطا کرنے کا حق رکھتی ہے اسی طرح وہ ان میں کمی بیشی کرنے اور بالکل سلب کر لینے کا بھی حق رکھتی ہے۔ پس درحقیقت اس نظام میں اقلیتیں سراسر اکثریت کے رحم پر جیتی ہیں اور ان کے لئے ابتدائی انسانی حقوق

تک کی کوئی پائیدار ضمانت نہیں ہوتی۔

یہ بنیادی اختلافات ہیں جو ذمیوں کے ساتھ اسلام کے سلوک اور اقلیتوں کے ساتھ قومی جمہوریتوں کے سلوک ایک دوسرے سے بالکل ممتاز کر دیتے ہیں۔ جب تک انہیں پیش نظر نہ رکھا جائے' انسان خلط مبحث سے نہیں بچ سکتا اور نہ اس غلط فہمی سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ موجودہ زمانے کی قومی جمہوریتیں تو اپنے دستوروں میں اقلیتوں کو بالکل مساویانہ حقوق دیتی ہیں مگر اسلام اس معاملے میں تنگ نظری سے کام لیتا ہے۔

ان ضروری توضیحات کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ا۔ غیر مسلم رعایا کی اقسام

اسلامی قانون اپنی غیر مسلم رعایا کو تین اقسام پر تقسیم کرتا ہے:

ایک وہ جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعے سے اسلامی حکومت کے تحت آئے ہوں۔

دوسرے وہ جو لڑنے کے بعد شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں۔

تیسرے وہ جو جنگ اور صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں۔

یہ تینوں اگرچہ ذمیوں کے عام حقوق میں یکساں شریک ہیں' لیکن پہلے دونوں گروہوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ اس لئے اہل الذمہ کے حقوق کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ہم ان مخصوص گروہوں کے جدا جدا احکام بیان کریں گے۔

معاہدین۔

جو لوگ جنگ کے بغیر یا دوران جنگ میں اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں اور حکومت اسلامی سے مخصوص شرائط طے کرلیں ان کے لیے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائط صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے طے ہوئی ہوں۔ دشمن کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے چند فیاضانہ شرائط طے کرلینا اور پھر جب وہ پوری طرح قابو میں آجائے تو اس کے ساتھ مختلف برتاؤ کرنا آج کل کی مہذب قوموں کے سیاسی معمولات میں سے ہے' مگر اسلام اس کو ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط طے ہو جائیں (خواہ وہ مرغوب ہوں یا نہ ہوں) تو اس کے بعد ان شرائط سے یک سر مو تجاوز نہ کیا جائے' بلالحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتباری حیثیت اور طاقت و قوت (Relative Position) میں کتنا ہی فرق آ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

لعلکم تقاتلون قوما فتظهرون علیهم فیتقونکم باموالهم دون انفسهم وابنائهم (وفی روایته فیصالحونکم علی صلح) فلا تصیبوا منهم فوق ذالک فانه لا یصلح لکم[1]

اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آجاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لیے تم کو خراج دینا منظور کرلے (ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے صلح نامہ طے کرلے) تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لیے ناجائز ہو گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

---

[1] ابوداؤد' کتاب الجہاد۔

"الا من ظلم معاهدا" او انتقصه او کلفه فوق طاقته او اخذ منه شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجه یوم القیامته"[۲]

خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا' یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا' اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔

ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ قاعدہ کلیہ مستنبط ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کے ساتھ صلح نامہ میں جو شرائط طے ہو جائیں ان میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ نہ ان پر خراج بڑھایا جا سکتا ہے' نہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جا سکتا ہے' نہ ان کی عمارتیں چھینی جا سکتی ہیں' نہ ان پر سخت فوج داری قوانین نافذ کیے جا سکتے ہیں' نہ ان کے مذہب میں دخل دیا جا سکتا ہے' نہ ان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جا سکتا ہے جو ظلم یا انتقاص' یا تکلیف مالایطاق' یا اخذ بغیر طیب نفس کی حدود میں آتا ہو۔ انہی احکام کی بنا پر فقہائے اسلام نے صلحاً" فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدون نہیں کئے ہیں اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل شرائط صلح کے مطابق ہو گا۔ امام ابویوسف" لکھتے ہیں :۔

یوخذ منھم ماصولحوا علیه ویوفی لھم ولا یزاد علیھم[۱]

ان سے وہی لیا جائے گا جس پر ان کی ساتھ صلح ہوئی ہے' ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کی جائیں گی' اور ان پر کچھ اضافہ نہ کیا جائے گا۔

---

[۲] ابوداؤد' کتاب الجہاد۔

[۱] کتاب الخراج صفحہ ۳۵۔

مفتوحین

دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں اور جنہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں ان کے استحکامات کو توڑ کر ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہو چکی ہوں۔ اس قسم کے مفتوحین کو جب ذمی بنایا جاتا ہے تو ان کو چند خاص حقوق دیئے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیلات فقہی کتابوں میں موجود ہیں۔ ذیل میں ان احکام کا خلاصہ دیا جاتا ہے جن سے ذمیوں کی اس جماعت کی آئینی حیثیت واضح ہوتی ہے۔

۱۔ جب امام ان سے جزیہ قبول کرلے تو وہ ہمیشہ کے لیے عقد ذمہ قائم ہو جائے گا' اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہو گا' کیونکہ قبول جزیہ کے ساتھ ہی عصمت نفس و مال ثابت ہو جاتی ہے۔[۲] اس کے بعد امام کو یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انہیں غلام بنالیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبیدہؓ کو صاف لکھا تھا کہ:۔

فاذا اخذت منهم الجزية فلا شئی لک عليهم ولا سبيل۔[۳]

جب تم ان سے جزیہ قبول کر لو تو پھر تم کو ان پر دست درازی کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

۲۔ عقد ذمہ قائم ہو جانے کے بعد اپنی زمینوں کے مالک وہی ہوں گے۔ ان کی ملکیت ان کے ورثاء کو منتقل ہو گی' اور ان کو اپنے املاک میں بیع' ہبہ' رہن وغیرہ کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اسلامی حکومت کو انہیں بے دخل کرنے کا حق نہ ہو گا۔[۱]

۲۔ بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۱۔

۳۔ کتاب الخراج ص ۸۲۔

۱۔ فتح القدیر ج ۴ ص ۳۵۹۔

۳- جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ جو مال دار ہیں ان سے زیادہ جو متوسط الحال ہیں ان سے کم' اور جو غریب ہیں ان سے بہت کم لیا جائے گا۔ اور جو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رکھتے' یا جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کی بخشش پر ہے' ان کو جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اگرچہ جزیہ کے لئے کوئی خاص رقم مقرر نہیں ہے' لیکن اس کی تعیین میں یہ امر مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کی جائے جس کا ادا کرنا ان کے لیے آسان ہو۔ حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ' متوسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔[۲]

۴- جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جائے گا جو اہل قتال (Combatants) ہیں۔ غیر اہل قتال' مثلاً" بچے' عورتیں' دیوانے' اندھے' اپاہج' عبادت گاہوں کے خادم' راہب' سنیاسی' ازکار رفتہ بوڑھے' ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصہ تک ممتد ہو جائے' اور لونڈی' غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔[۳]

۵- بزور شمشیر فتح ہونے والے شہر کے معابد پر مسلمانوں کو قبضہ کر لینے کا حق ہے۔ لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور بہ طریق احسان ان کو علیٰ حالہ قائم رہنے دینا اولیٰ اور افضل ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جتنے ممالک فتح ہوئے ان میں کوئی معبد نہ توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کی گیا۔ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں :-

---

[۲]- کتاب الخراج ص ۳۶۔

[۳]- بدائع ج ۷۔ ص ۱۱۱۔ ۱۱۳' فتح القدیر ج ۴ ص ۳۷۲۔ ۳۷۳' کتاب الخراج ص ۷۳۔

تُرکت علیٰ حالھا ولم تھدم ولم یتعرض لھا[1]

ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا' نہ مسمار کیا گیا اور نہ ان سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔

قدیم معابد کو مسمار کرنا بہر حال ناجائز ہے۔[2]

۲۔ ذمیوں کے عام حقوق

اب ہم ذمیوں کے وہ حقوق بیان کریں گے جن میں تینوں اقسام کے اہل الذمہ شریک ہیں۔

حفاظت جان

ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کرے گا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائے گا جس طرح مسلمان کو قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ نبی ﷺ کے زمانے میں ایک مسلمان نے ایک ذمہ کو قتل کیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور فرمایا کہ :

انا احق من وفی بذمتہ[1]

اپنے ذمہ کو وفا کرانے کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ اس پر آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے حوالہ کیا

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۳۔

[2] بدائع جلد ۷ ص ۱۱۴۔

[1] عنایہ شرح ہدایہ ج ۸ ص ۲۵۶' دار قطنی نے یہی حدیث ابن عمرؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور اس میں "انا اکرم من وفی بذمتہ" آیا ہے۔

جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارثوں کو دے دیا گیا اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ [۲]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خود عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کا فتویٰ دے دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے ہرمزان اور ابو لولو کی بیٹی کو اس شبہ میں قتل کر دیا تھا کہ شاید وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک مسلمان ایک ذمی کے قتل میں ماخوذ ہوا۔ ثبوت مکمل ہونے کے بعد آپ نے قصاص کا حکم دے دیا۔ مقتول کے بھائی نے آ کر عرض کیا "میں نے خون معاف کیا۔" مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا:

لعلهم فزعوك او هددوك

شاید ان لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے۔

اس نے جواب دیا کہ "نہیں۔ مجھے خون بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آ جائے گا۔" تب آپ نے قاتل کو رہا کیا اور فرمایا کہ:

من كان له ذمتنا فدمه كدمنا وديته كديتنا۔ [۱]

جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كاموالنا ودماؤهم كدمائنا۔

انہوں نے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں۔

---

[۲] برہان شرح مواہب الرحمن ج ۳ ص ۲۸۷۔

[۱] برہان جلد ۲، ص ۲۸۲

اسی بناء پر فقہاء نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ اگر مسلمان کسی ذمی کو بلا ارادہ قتل کرے تو اسکی دیت بھی وہی ہو گی جو مسلمان کو خطاء" قتل کرنے سے لازم آتی ہے۔[1]

فوجداری قانون

تعزیرات کا قانون ذمی اور مسلمانوں کے لئے یکساں ہے اور اس میں دونوں کا درجہ مساوی ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذمی کو بھی دی جائے گی۔ ذمی کا مال مسلمان چرا لے یا مسلمان کا مال ذمی چرا لے' دونوں صورتوں میں سارق کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ذمی کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگائے یا مسلمان ایسا کرے' دونوں صورتوں میں ایک ہی حد قذف جاری ہو گی۔ اسی طرح زنا کی سزا بھی ذمی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے۔ البتہ شراب کے معاملہ میں ذمیوں کے لئے استثناء ہے۔[2]

دیوانی قانون

دیوانی قانون بھی ذمی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے اور دونوں کے درمیان کامل مساوات ہے۔ حضرت علی ؓ کے ارشاد اموالھم کاموالنا کے معنی ہی یہی ہیں کہ ان کے مال کی ویسی ہی حفاظت کی جائے گی جیسی مسلمان کے مال کی ہوتی ہے اور دیوانی حقوق ہمارے اور ان کے برابر ہوں گے۔ اس مساوات

---

[1] در مختار' ج ۳ ص ۲۰۳

[2] کتاب الخراج ص ۲۰۸-۲۰۹۔ المبسوط ج ۹ ص ۵۷-۵۸۔ امام مالک ؒ کے نزدیک ذمی کے لئے شراب کی طرح زنا کے معاملہ میں بھی استثناء ہے۔ وہ حضرت علی ؓ اور حضرت عمر ؓ کے اس فیصلہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ذمی اگر زنا کرے تو اس کا معاملہ اس کے اہل ملت پر چھوڑ دیا جائے (یعنی اس کے پرسنل لاء کے مطابق عمل کیا جائے)۔

کا طبعی لازمہ یہ ہے کہ دیوانی قانون کی رو سے جتنی پابندیاں مسلمان پر عائد ہوتی ہیں وہی سب ذمی پر بھی عائد ہوں۔

تجارت کے جو طریقے ہمارے لئے ممنوع ہیں' وہی ان کے لئے بھی ہیں۔ سود جس طرح ہمارے لئے حرام ہے اسی طرح ان کے لئے بھی ہے۔ البتہ ذمیوں کے لئے صرف شراب اور سور کا استثناء ہے۔ وہ شراب بنانے' پینے اور بیچنے کا حق رکھتے ہیں اور انہیں سور پالنے' کھانے اور فروخت کرنے کے بھی حقوق حاصل ہیں۔[1] اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی شراب یا اس کے سور کو تلف کر دے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔ درالمختار میں ہے:

ویضمن المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه۔[2]

مسلمان اس کی شراب اور کے سور کی قیمت ادا کرے گا اگر وہ اسے تلف کر دے۔

تحفظ عزت

ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا۔ اس کو گالی دینا' مارنا' پیٹنا' یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں یہ افعال ناجائز ہیں۔ درالمختار میں ہے:

ویجب کف الاذیٰ عنه و تحرم غیبته کالمسلم۔[3]

اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔

---

[1] المبسوط ج ۱۳' ص ۳۷-۳۸

[2] درالمختار ج ۳ ص ۲۷۳

[3] درالمختار جلد ۳ ص ۲۷۴-۲۷۳

ذمہ کی پائداری

عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی لزوم رکھتا ہے' یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر اسے توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قائم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں۔ بدائع میں ہے :-

واما صفة العقد فهو لازم فی حقنا لا یملک المسلمون نقضه بحال من الاحوال واما فی حقهم فغیر لازم۔[1]

عقد ذمہ ہمارے حق میں تو لازم ہے' یعنی ایک مرتبہ ذمی بنا لینے کے بعد ہم اس ذمہ کو کسی حال میں توڑ نہیں سکتے۔ لیکن ان کے لیے یہ لازم نہیں ہے۔ (یعنی اگر وہ ہمارے ذمہ سے خارج ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں)۔

ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے' اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا۔ حتیٰ کہ جزیہ بند کر دینا' مسلمان کو قتل کرنا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا یا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرنا بھی اس کے حق میں ناقض ذمہ نہیں ہے۔ ان افعال پر اسے مجرم کی حیثیت سے سزا دی جائے گی' لیکن باغی قرار دے کر ذمہ سے خارج نہیں کر دیا جائے گا۔ البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جن میں ایک ذمی خارج از ذمہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ دارالاسلام کو چھوڑ کر دشمنوں سے جا ملے۔ دوسرے یہ کہ حکومت اسلامی کے خلاف صریح بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرے۔[2]

---

[1] درالمختار ج ۷ ص ۱۱۲

[2] بدائع ج ۷ ص ۱۱۳۔ فتح القدیر ج ۴ ص ۳۸۱-۸۲

شخصی معاملات

ذمیوں کے شخصی معاملات ان کی اپنی ملت کے قانون (Personal law) کے مطابق طے کیے جائیں گے۔ اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے لیے شخصی معاملات میں جو کچھ ناجائز ہے' وہ اگر ان کے مذہبی و قومی قانون میں جائز ہو تو اسلامی عدالت ان کے قانون ہی کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ مثلاً بغیر گواہوں کے نکاح' یا بلا مہر کے نکاح' یا زمانہ عدت کے اندر نکاح ثانی' یا محرمات کے ساتھ نکاح اگر وہ جائز رکھتے ہوں تو ان کے لیے یہ سب افعال جائز رکھے جائیں گے۔ خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے تمام ادوار میں اسلامی حکومتوں کا اسی پر عمل رہا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس معاملہ میں حضرت حسن بصری سے فتوے طلب کیا تھا کہ :۔

ما بال الخلفاء الراشدين تركوا اهل الذمة وماهم عليه من نكاح المحارم واقتناء الخمور والخنازير؟

کیا بات ہے کہ خلفائے راشدین نے ذمیوں کو محرمات کے ساتھ نکاح اور شراب اور سور کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا؟

جواب میں حضرت حسنؒ نے لکھا :۔

انما بذلوا الجزية ليتركوا وما يعتقدون وانما انت متبع ولا مبتدع والسلام

'انھوں نے جزیہ دینا اسی لیے تو قبول کیا ہے کہ انھیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام پچھلے طریقہ کی پیروی کرنا ہے نہ کہ کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا۔

البتہ اگر کسی مقدمہ میں فریقین خود اسلامی عدالت سے درخواست کریں کہ شریعت اسلام کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جائے' تو عدالت ان پر شریعت نافذ کرے گی۔ نیز اگر شخصی قانون سے تعلق رکھنے والے کسی معاملہ میں ایک فریق

مسلمان ہو تو پھر فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔ مثلاً" کوئی عیسائی عورت کسی مسلمان کے نکاح میں تھی اور اس کا شوہر مرگیا۔ تو اس عورت کو شریعت کے مطابق پوری عدت وفات گزارنی ہو گی۔ عدت کے اندر وہ نکاح کرے گی تو ایسا نکاح باطل ہو گا۔[1]

مذہبی مراسم

مذہبی مراسم اور قومی شعائر کو پبلک میں اعلان و اظہار کے ساتھ ادا کرنے کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اہل الذمہ خود اپنی بستیوں میں تو ان کو پوری آزادی کے ساتھ کر سکیں گے۔ البتہ خالص اسلامی آبادیوں میں حکومت اسلامی کو اختیار ہو گا کہ انہیں اس کی آزادی دے یا ان پر کسی قسم کی پابندیاں عاید کر دے۔[2] بدائع میں ہے :۔

لا یمنعون من اظہار شیئی مما ذکرنا من بیع الخمر والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریة او موضع لیس من امصار المسلمین ولوکان فیه عدد کثیر من اهل السلام وانما یکره ذالک فی امصار المسلمین وهی التی یقام فیها الجمع والاعاد والحد ود ..... واما اظهار فسق یعتقدون حرمة کالزنا وسائر الفواحش التی حرام فی دینهم فانهم یمنعون من ذالک سواء کانوا فی امصار المسلمین

---

[1] المبسوط ج ۵ ص ۳۸۔۴۱۔

[2] خالص اسلامی آبادیوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاح شرع میں "امصار المسلمین" کہلاتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق صرف ان مقامات پر ہوتا ہے جن کی زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو' اور جن کو مسلمانوں نے اظہار شعائر اسلام کے لیے مخصوص کر لیا ہو۔

لو فی امصارھم۔[1]

جو بستیاں امصار المسلمین میں سے نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب و خنزیر بیچنے اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائے گا خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو۔ البتہ یہ افعال امصار مسلمین میں ناپسندیدہ ہیں' یعنی ان شہروں میں جنہیں جمعہ و عیدین اور اقامت حدود کے لیے مخصوص کیا گیا ہو ..... رہا وہ فسق جس کی حرمت کے خود وہ بھی قائل ہیں مثلاً" زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں بھی حرام ہیں' تو اس کے علانیہ ارتکاب سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا خواہ وہ امصار مسلمین میں ہوں یا خود اپنے امصار میں۔

لیکن امصار مسلمین میں بھی ان کو صرف صلیبوں اور مورتیوں کے جلوس نکالنے اور علانیہ ناقوس بجاتے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ورنہ اپنے قدیم معابد کے اندر رہ کر وہ تمام شعائر کا اظہار کر سکتے ہیں۔ حکومت اسلامیہ اس میں دخل نہ دے گی۔[2]

عبادت گاہیں

امصار مسلمین میں ذمیوں کے جو قدیم معابد ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ ٹوٹ جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ بنا لینے کا حق ہے۔ لیکن نئے معابد بنانے کا حق نہیں ہے۔[3] رہے وہ مقامات جو امصار مسلمین نہیں ہیں تو

---

[1] بدائع ج ۷ ص ۱۱۳

[2] شرح السیر الکبیر ج ۳ ص ۲۵۱۔

[3] بدائع جلد ۷ ص ۱۱۴۔ شرح السیر الکبیر ج ۳ ص ۲۵۱۔

ان میں ذمیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔ اسی طرح جو مقامات اب "مصر" نہ رہے ہوں، یعنی امام نے ان کو ترک کر کے وہاں اقامت جمع و اعیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا ہو، ان میں بھی ذمیوں کو نئے معابد کی تعمیر اور اپنے شعائر کے اظہار کا حق حاصل ہے۔[1]

ابن عباسؓ کا فتویٰ یہ ہے :۔

اما مصر مصرته العرب فليس لهم ان يحدثوا فيه بناء بيعة ولا كنيسة ولا يضربوا فيه بنا قوس ولا يظهروا فيه خمراً ولا يتخذوا فيه خنزيراً وكل مصر كانت العجم مصرته ففتحه الله على العرب فنزلوا على حكمهم فللعجم ما في عهدهم وعلى العرب ان يوفوا لهم بذالك۔[2]

جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے ان میں ذمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابد اور کنائس تعمیر کریں یا ناقوس بجائیں یا علانیہ شراب اور سور کا گوشت بیچیں۔ باقی رہے وہ شہر جو عجمیوں کے آباد کیے ہوئے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح کیا اور انہوں نے مسلمانوں کے حکم کی اطاعت قبول کر لی تو عجم کے لیے وہی حقوق ہیں جو ان کے معاہدہ میں طے ہو جائیں اور مسلمانوں پر ان کا ادا کرنا لازم ہے۔

جزیہ و خراج کی تحصیل میں رعایات

جزیہ و خراج کے معاملہ میں ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے۔ ان کے ساتھ

---

[1] بدائع جلد ۷ ص ۱۱۴۔ شرح السیر الکبیر ج ۳ ص ۲۵۷۔

[2] کتاب الخراج ص ۸۸۔

نرمی اور رفق کی تاکید کی گئی ہے اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے اٹھانے کی ان میں قدرت نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ لا یکلفوا فوق طاقتھم جتنا مال دینا ان کی طاقت سے باہر ہو اس کے ادا کرنے کی انھیں تکلیف نہ دی جائے۔[1]

جزیہ کے عوض ان کی املاک کا نیلام نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عامل کو فرمان بھیجا تھا کہ لا تبیعن لھم فی خراجھم حمارا ولا بقرۃ ولا کسوۃ شیئا ولا صیفا، خراج میں ان کا گدھا' ان کی گائے' ان کے کپڑے نہ بیچنا۔[2] اور ایک موقع پر اپنے عامل کو بھیجتے وقت حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

ان کے جاڑے گرمی کے کپڑے اور ان کے کھانے کا سامان اور ان کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں' خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا' نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لیے کوڑے مارنا' نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا' نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا۔ کیونکہ ہم جو ان کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف کیا تو اللہ میرے بجائے تم کو پکڑے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کی خبر پہنچی تو میں تمہیں معزول کر دوں گا۔[3]

جزیہ کی تحصیل میں ان پر ہر قسم کی سختی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہؓ کو جو فرمان لکھا تھا اس میں منجملہ اور احکام کے ایک یہ بھی تھا کہ:۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۸' ۸۲۔

[2] فتح البیان ج ۴ ص ۹۳۔

[3] کتاب الخراج ص ۹۔

وامنع المسلمين من ظلمهم والاضراربہم والکل اموالہم الا بحلہا [1]

مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے' اور انہیں ستانے اور ناجائز طریقہ سے ان کے مال کھانے سے منع کرو۔

شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے عاملؐ جزیہ وصول کرنے کے لیے ذمیوں کو سزا دے رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ان کو تکلیف نہ دو' اگر تم انہیں عذاب دو گے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے گا۔ لاتعذب الناس فان الذین یعذبون الناس فی الدنیا یعذبہم اللہ یوم القیامۃ [2]

ہشام بن حکم نے ایک سرکاری افسر کو دیکھا کہ وہ ایک قبطی کو جزیہ وصول کرنے کے لیے دھوپ میں کھڑا کر رہا ہے۔ اس پر انہوں نے ملامت کی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:

ان اللہ عزوجل یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا [3]

اللہ عزوجل ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔

فقہاء اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انہیں تادیباً" قید بے مشقت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ امام ابویوسفؒ لکھتے ہیں ولکن یرفق بہم ویحبسون حتی یودوا ما علیہم [4]

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۲۔

[2] کتاب الخراج ص ۷۱۔

[3] ابوداؤد کتاب الخراج باب الفی والامارہ۔

[4] کتاب الخراج ص ۷۰۔

جو ذمی محتاج اور فقیر ہو جائیں، انھیں صرف جزیہ سے معاف ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کے لیے اسلامی خزانے سے وظائف بھی مقرر کیے جائیں گے۔
حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ کو جو امان نامہ لکھ کر دیا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں :-

وجعلت لہم ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابتہ آفۃ من الآفات او کان غنیا فافتقر وصار اہل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ وعیل من بیت مال المسلمین ہو وعیالہ۔[1]

میں ان کے لیے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو شخص بڑھاپے کے سبب ازکار رفتہ ہو جائے یا اس پر کوئی آفت نازل ہو جائے' یا وہ پہلے مال دار تھا پھر فقیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اس کو صدقہ و خیرات دینے لگے' تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے اور اسے اور اس کے بال بچوں کو مسلمانوں کے بیت المال سے مدد دی جائے۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک ضعیف العمر آدمی کو بھیک مانگتے دیکھا اور اس سے اس ذلیل حرکت کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے لیے بھیک مانگتا ہوں۔ اس پر آپ نے اس کا جزیہ معاف کر دیا اور اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا :-

"خدا کی قسم یہ ہرگز انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں۔"[2]

دمشق کے سفر میں بھی حضرت عمرؓ نے اپنے معذور ذمیوں کے لیے امدادی وظائف مقرر کرنے کے احکام جاری کیے تھے۔[3]

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۵۔

[2] کتاب الخراج ص ۷۲۔ فتح القدیر ج ۲ ص ۳۷۳۔

[3] فتوح البلدان للبلاذری طبع یورپ ص ۱۲۹۔

اگر کوئی ذمی مرجائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو تو وہ اس کے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے وارثوں پر اس کا بار ڈالا جائیگا۔ امام ابویوسفؒ لکھتے ہیں :۔

ان فجبت علیه الجزیة فمات قبل ان توخذ منه او اخذ بعضها وبقی البعض لم یوخذ بذالک ورثة ولم توخذ من ترکته۔[1]

اگر کسی ذمی پر جزیہ واجب ہو اور وہ اس کو ادا کرنے سے پہلے مرگیا تو اس کے ورثاء سے وہ وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے ترکہ سے لیا جائے گا۔

تجارتی ٹیکس

مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموال تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائے گا۔ جب کہ انف کا راس المال ۲۰۰ درہم تک پہنچ جائے یا وہ ۲۰ مثقال سونے کے مالک ہو جائیں۔[2]

اس میں شک نہیں ہے کہ فقہاء نے ذمی تاجر پر تجارتی محصول ۵ فی صدی لگایا تھا اور مسلمان تاجر پر ۲/۱-۲ فی صدی' لیکن یہ فعل کسی نص پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد پر مبنی تھا اور دراصل وقتی مصالح اس کے مقتضی تھے۔ اس زمانہ میں مسلمان زیادہ تر ملک کی حفاظت میں مشغول تھے اور تمام تجارت ذمیوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اسی لیے مسلمان تاجروں کی ہمت افزائی اور ان کی تجارت کے تحفظ کے لیے ان پر ٹیکس کم کر دیا گیا۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۷۰۔ المبسوط ج ۱۰ ص ۸۱۔

[2] کتاب الخراج ص ۷۰۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ آج بھی ٹیکس عائد کرنے کے لیے یہی نصاب رکھا جائے۔ یہ نصاب اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے تھا۔

فوجی خدمت سے استثناء

ذمی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اصول پر جو ریاست قائم ہو اس کی حفاظت کے لیے وہی لوگ لڑ سکتے ہیں اور انہی کو اس کے لیے لڑنا چاہیے جو اس اصول کو حق مانتے ہوں۔ پھر لڑائی میں اپنے اصول اور حدود کی پابندی بھی وہی کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ اگر ریاست کی حفاظت کے لیے لڑیں گے تو محض کرایہ کے سپاہیوں (Mercenaries) کی حیثیت سے لڑیں گے اور اسلام کے مقرر کیے ہوئے اخلاقی حدود کی پابندی نہ کر سکیں گے۔ اسی لیے اسلام نے ذمیوں کو فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر کے ان پر صرف یہ فرض عاید کیا ہے کہ وہ ملکی حفاظت کے مصارف میں اپنا حصہ ادا کر دیں۔ جزیہ کی اصل حیثیت یہی ہے۔ وہ نہ صرف اطاعت کا نشان ہے، بلکہ فوجی خدمت سے استثناء کا بدل اور ملکی حفاظت کا معاوضہ بھی ہے۔ چنانچہ جزیہ صرف قابل جنگ مردوں ہی پر لگایا جاتا ہے، اور اگر مسلمان کسی وقت ذمیوں کی حفاظت سے قاصر ہوں تو جزیہ واپس کر دیا جاتا ہے۔[1]

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو مبسوط ج ۱۰ ص ۷۹-۷۸ ہدایہ کتاب السیر فصل فی کیفیتہ قسمتہ الغنائم وباب الجزیہ۔ فتح القدیر ج ۴ ص ۲۸-۳۲۷ و ص ۷۰-۳۶۹۔

اگر کسی بیرونی حملہ کے موقع پر ملک کے غیر مسلم باشندے مدافعت کے لیے اپنی خدمات بطور خود پیش کریں تو ہم ان کی اس پیشکش کو قبول کر سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں ان کا جزیہ ساقط کرنا ہو گا۔ یہاں یہ تصریح کر دینا بھی فائدے سے خالی نہ ہو گا کہ جزیہ کے نام سے غیر مسلموں کو جو وحشت ہوتی ہے وہ محض اس پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے جو

جنگ یرموک کے موقع پر جب رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک زبردست فوج جمع کی اور مسلمانوں کو شام کے تمام مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر ایک مرکز پر اپنی طاقت سمیٹنی پڑی تو حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ و خراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے انہیں واپس کر دو اور ان سے کہو کہ "اب ہم تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں' اس لیے ہم نے جو مال تمہاری حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے واپس کرتے ہیں۔[1] اس حکم کے مطابق تمام امراء فوج نے جمع شدہ رقوم واپس کر دیں۔ بلاذری اس موقع پر غیر مسلم رعایا کے جذبات کا حال لکھتا ہے کہ جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ "تمہاری حکومت اور انصاف پسندی ہم کو اس ظلم و ستم سے زیادہ محبوب ہے جس میں ہم مبتلا تھے۔ اب ہم ہرقل کے عامل کو اپنے شہر میں ہرگز گھسنے نہ دیں گے تاوقتیکہ لڑ کر مغلوب نہ ہو جائیں۔"[2]

بقیہ حاشیہ

ایک مدت سے اسلام کے مخالفین کرتے رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں اس توحش کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جزیہ دراصل اس تحفظ کا معاوضہ ہے جو غیر مسلموں کو اسلامی حکومت کے تحت میسر آتا ہے۔ یہ معاوضہ صرف صاحب استطاعت اور بالغ مردوں سے لیا جاتا ہے' اسے اگر اسلام قبول نہ کرنے کا جرمانہ قرار دیا جائے تو پھر اس زکوٰۃ کو کیا کہا جائے گا جو ہر صاحب استطاعت مسلمان مرد ہی سے نہیں بلکہ عورت سے بھی لی جاتی ہے اور جس کی شرح جزیہ کی شرح سے بہت زیادہ ہے۔ کیا وہ اسلام قبول کرنے کا جرمانہ ہے؟

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۱۔

[2] فتوح البلدان طبع یورپ صفحہ ۱۳۷۔

۳۔ فقہاء اسلام کی حمایت

یہ ہیں اس قانون کی تفصیلات جو صدر اول میں غیر مسلم رعایا کے حقوق و فرائض سے متعلق بنایا گیا تھا۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے بعد بادشاہی دور میں جب کبھی ذمیوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی تو وہ فقہاء اسلام ہی کا گروہ تھا جو آگے بڑھ کر ان کی حمایت کے لیے کھڑا ہو گیا اور متفق ہو کر ان کا پشت پناہ بنا۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ولید بن عبدالملک اموی نے دمشق کے کنیسہ یوحنا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر لیا تھا۔ جب حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور عیسائیوں نے ان سے اس ظلم کی شکایت کی تو انہوں نے اپنے عامل کو لکھا کہ مسجد کا جتنا حصہ گرجا کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اسے منہدم کر کے عیسائیوں کے حوالہ کر دو۔[1]

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرص کے ذمی باشندوں کو جلاوطن کر کے شام میں آباد کیا۔ فقہائے اسلام اور عام مسلمان اس پر سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اس کو گناہ عظیم سمجھا۔ پھر جب ولید بن یزید نے انہیں دوبارہ قبرص میں لے جا کر آباد کر دیا تو اس کی عام طور پر تحسین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ اسماعیل بن عیاش کا بیان ہے کہ:۔

مستنظع ذالک المسلمون واستعظمه الفقهاء فلما ولی یزید بن ولید بن عبد الملک ردهم الیٰ قبرص فاستحسن المسلمون ذالک من فعله وراوه عدلاً۔[2]

مسلمانوں نے اس کی اس حرکت سے بیزاری ظاہر کی اور فقہاء نے

---

[1] فتوح البلدان مطبوعہ یورپ ص ۱۳۲

[2] فتوح البلدان ص ۱۵۶۔

اس کو گناہ سمجھا۔ پھر جب یزید بن ولید خلیفہ ہوا اور اس نے ان کو قبرص کی طرف پھر لوٹا دیا تو مسلمانوں نے اس کو پسند کیا اور اسے عدل و انصاف سمجھا۔

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جبل لبنان کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے بغاوت کر دی۔ اس پر صالح بن علی بن عبداللہ نے ان کی سرکوبی کے لیے ایک فوج بھیجی اور اس نے ان کے ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں میں سے ایک جماعت کو جلاوطن کر دیا اور ایک جماعت کو وہیں آباد رہنے دیا۔ امام اوزاعی اس زمانے میں زندہ تھے۔ انھوں نے صالح کو اس ظلم پر سخت تنبیہ کی اور ایک طویل خط لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"جبل لبنان کے اہل ذمہ کی جلاوطنی کا حال تم کو معلوم ہے۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے بغاوت کرنے والوں کے ساتھ کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر باوجود اس کے تم نے کچھ کو قتل کیا اور کچھ لوگوں کو ان کی بستیوں کی طرف واپس بھیج دیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ عام لوگوں کو بعض خاص لوگوں کے جرم کی سزا کیوں کر دی جا سکتی ہے اور کس بنا پر ان کے گھروں اور ان کی جائدادوں سے انھیں بے دخل کیا جا سکتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ اور یہ ایک واجب التعمیل حکم ہے۔ تمھارے لیے بہترین نصیحت یہ ہے کہ تم رسول اللہ کے اس ارشاد کو یاد رکھو کہ "جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کرے گا اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا اس کے خلاف میں خود مدعی بنوں گا۔"[1]

یہ اور ایسی ہی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] فتح البلدان ص ۱۶۹۔

کہ علماء اسلام نے ہمیشہ اہل ذمہ کے حقوق کی حمایت کی ہے اور کبھی کسی امیر یا بادشاہ نے ان پر جبر و ظلم کیا بھی ہے تو جو لوگ اس عہد میں اسلامی قانون کے پاسبان رہے ہیں وہ کبھی اس پر ملامت کرنے سے باز نہیں رہے۔

۴۔ زائد حقوق جو غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں

یہاں تک ہم نے اہل الذمہ کے ان حقوق کا ذکر کیا ہے جو شریعت میں ان کے لیے مقرر ہیں اور جنہیں لازماً" ہر اسلامی دستور میں شامل ہونا چاہیے۔

اب ہم مختصر طور پر بتائیں گے کہ موجودہ زمانہ میں ایک اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کو اصول اسلام کے مطابق مزید کیا حقوق دے سکتی ہے۔

رئیس مملکت کا منصب

سب سے پہلے رئیس مملکت کے سوال کو لیجیے۔ اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت ہے اس لیے وہ ان فریب کاریوں سے کام نہیں لے سکتی جو بے دین قومی جمہوریتیں اقلیتوں کی رائے دہی کے معاملہ میں برتتی ہیں۔ اسلام میں رئیس حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ اصول اسلام کے مطابق ریاست کا نظام چلائے' لہٰذا جو لوگ سرے سے اصول اسلام کو مانتے ہی نہ ہوں وہ رئیس مملکت کا منصب بہرحال نہیں سنبھال سکتے۔

مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ

اس کے بعد ہمارے سامنے مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ کا مسئلہ آتا ہے۔ جہاں تک ٹھیٹھ اسلامی نظریہ کا تعلق ہے' اس کی رو سے تو مجلس شوریٰ میں بھی غیر مسلموں کی نمائندگی صحیح نہیں ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے حالات میں اس کے لیے گنجائش نکالی جا سکتی ہے بشرطیکہ ملک کے دستور میں اس بات کی واضح اور صریح ضمانت موجود ہو کہ۔

(ا) پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی کرنے کی مجاز نہ ہوگی اور ہر فیصلہ جو اس حد سے متجاوز ہو قانونی سند حاصل کرنے سے محروم رہے گا۔

(ب) ملک کے قانون کا اولین ماخذ قرآن و سنت ہوں گے۔

(ج) قوانین کی آخری توثیق کا اختیار جس شخص کو حاصل ہو گا وہ لازماً مسلمان ہو گا۔

ایک شکل یہ بھی اختیار کی جا سکتی ہے کہ غیر مسلموں کو ملک کی پارلیمنٹ میں شامل کرنے کے بجائے ان کے لئے ایک الگ نمائندہ مجلس یا اسمبلی بنا دی جائے تا کہ وہ اپنی اجتماعی ضروریات بھی اس کے ذریعہ سے پوری کریں' اور ملکی انتظام کے معاملہ میں بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکیں۔ اس مجلس کی رکنیت اور رائے دہی غیر مسلموں کے لیے مخصوص ہو اور اس میں ان کو اظہار رائے کی پوری آزادی دی جائے۔ اس مجلس کے ذریعہ سے:۔

۱۔ وہ اپنے شخصی معاملات کی حد تک قوانین تجویز کرنے اور سابق قوانین میں اصلاح و ترمیم کرنے کے مجاز ہوں گے' اور اس طرح کی تمام تجاویز رئیس حکومت کی منظوری سے قانون بن سکیں گی۔

۲۔ وہ حکومت کے نظم و نسق اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کے متعلق اپنی شکایات' اعتراضات' مشورے اور تجاویز پوری آزادی کے ساتھ پیش کر سکیں گے اور حکومت انصاف کے ساتھ ان پر غور کرے گی۔

۳۔ وہ اپنے گروہ کے معاملات اور عام ملکی معاملات کے متعلق سوالات بھی کر سکیں گے' اور حکومت کا ایک نمائندہ ان کے جوابات دینے کے لئے موجود رہے گا۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے کسی صورت کو بھی حالات و ضروریات کے لحاظ سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک بلدیات اور مقامی مجالس (Local Bodies) کا تعلق ہے ان میں غیر مسلموں کو نمائندگی اور رائے دہی کے پورے حقوق دیئے جاسکتے ہیں۔

آزادی تحریر و تقریر وغیرہ

غیر مسلموں کو اس ریاست میں تحریر و تقریر اور رائے و ضمیر اور اجتماع کی وہی آزادی حاصل ہوگی جو خود مسلمانوں کو حاصل ہوگی' اور اس معاملہ میں جو قانونی پابندیاں مسلمانوں کے لیے ہوں گی وہی ان کے لئے بھی ہوں گی۔

قانون کی حدود میں رہتے ہوئے وہ حکومت پر' اس کے حکام پر اور خود رئیس حکومت پر آزادانہ تنقید کرسکیں گے۔

قانون کی حدود کے اندر غیر مسلموں کو بھی مذہبی بحث و مباحثہ کی ویسی ہی آزادی ہوگی جیسی مسلمانوں کو ہے۔

وہ اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے میں بھی پوری طرح آزاد ہوں گے اور اگر ایک غیر اسلامی مذہب کا پیرو کسی دوسرے غیر اسلامی مذہب کو قبول کرلے تو حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ البتہ کوئی مسلمان اسلامی ریاست کے حدود میں رہتے ہوئے اپنا دین بدلنے کا مجاز نہ ہوگا۔ لیکن ارتداد کی صورت میں مؤاخذہ جو کچھ بھی ہوگا خود مرتد سے ہوگا نہ کہ اس غیر مسلم سے جس کا اثر قبول کرکے وہ مرتد ہوا ہے۔

انہیں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی عقیدہ یا عمل اختیار کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا' اور اپنے ضمیر کے مطابق وہ ایسے سب کام کرنے کے مجاز ہوں گے جو قانون ملکی سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔

تعلیم

انہیں نظام تعلیم تو وہی قبول کرنا ہوگا جو ریاست پورے ملک کے لیے بنائے گی' لیکن جہاں تک اسلام کی مذہبی تعلیم کا تعلق ہے' اس کے پڑھنے پر وہ مجبور نہ

کیے جائیں گے۔ انھیں پورا حق ہو گا کہ ملکی درس گاہوں میں' یا خود اپنی مخصوص درسگاہوں میں' اپنے مذہب کی تعلیم کا مستقل انتظام کریں۔

ملازمتیں

" چند محفوظ مناصب کے سوا وہ تمام ملازمتوں میں داخل ہونے کے حق دار ہوں گے اور اس معاملہ میں ان کے ساتھ کوئی تعصب نہ برتا جائے گا۔ مسلمان اور غیر مسلم' دونوں کے لیے اہلیت کا ایک ہی معیار ہو گا اور اہل آدمیوں کو بلا امتیاز انتخاب کیا جائے گا۔

محفوظ مناصب سے مراد ایسے مناصب ہیں جو اسلام کے اصولی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مناصب کی فہرست کافی غور و خوض کے بعد ماہرین کی ایک جماعت بنا سکتی ہے۔ ہم ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن خدمات کا تعلق پالیسیوں کی تشکیل اور محکموں کی رہنمائی سے ہے وہ سب کلیدی اہمیت رکھنے والی خدمات ہیں' اور ایک اصولی نظام میں ایسی خدمات صرف انہی لوگوں کو دی جا سکتی ہیں جو اس کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ ان خدمات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی تمام نظم و نسق میں بڑے سے بڑے عہدوں پر بھی اہل الذمہ اپنی اہلیت کے لحاظ سے مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً" کوئی چیز ان میں سے کسی شخص کے اکاؤنٹنٹ جنرل' یا چیف انجینئر یا پوسٹ ماسٹر جنرل بنائے جانے میں مانع نہیں ہے۔

اسی طرح فوج میں بھی صرف جنگی خدمات محفوظ ملازمتوں میں شمار ہوں گی۔ باقی دوسرے فوجی شعبے جن کا تعلق براہ راست حرب و ضرب سے نہیں ہے' ذمیوں کے لیے کھلے ہوں گے۔

معاشی کاروبار اور پیشے

صنعت و حرفت' تجارت' زراعت اور دوسرے تمام پیشوں کے دروازے غیر

مسلموں کے لیے بالکل کھلے رہیں گے۔ ان میں مسلمانوں کو ایسی کوئی رعایت حاصل نہ ہوگی جو غیر مسلموں کو نہ حاصل ہو' اور غیر مسلموں پر کوئی ایسی پابندی عائد نہ کی جاسکے گی جو مسلمانوں کے لیے نہ ہو۔ ہر شہری کو' خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم' معاشی میدان میں جدوجہد کا مساویانہ حق ہو گا۔

غیر مسلموں کے لیے تحفظ کی واحد صورت

آخر میں اس امر کی توضیح بھی ضروری ہے کہ ایک اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں کو جو حقوق بھی دے گی بلا اس لحاظ کے دے گی کہ کوئی ہمسایہ غیر مسلم حکومت اپنی مسلمان رعایا کو کیا حقوق دیتی ہے' بلکہ کچھ دیتی بھی ہے یا نہیں۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ مسلمان کافروں کو دیکھ دیکھ کر اپنا لائحہ عمل بنائے' وہ انصاف کریں تو یہ بھی کرے' اور وہ ظلم کرنے لگیں تو یہ بھی ظلم پر اتر آئے۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قطعی اور واضح اصول کے پیرو ہیں اور ہمیں بہرحال اپنے حدود اختیار میں اپنے اصولوں پر ہی عمل کرنا ہے۔ جو ہم دیں گے نیک نیتی کے ساتھ دیں گے' صرف کاغذ ہی پر نہیں بلکہ زمین پر بھی دیں گے۔ اور اپنی لی ہوئی ذمہ داریوں کو انصاف اور سچائی کے ساتھ ادا کریں گے۔

اس کے بعد یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں رہتی کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے لیے تحفظ' امن اور خوش حالی کی اس سے بڑھ کر' بلکہ درحقیقت اس کے سوا کوئی قابل اعتماد ضمانت نہیں ہو سکتی کہ یہاں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ صرف اسی صورت میں ظلم اور جوابی ظلم کا وہ شیطانی چکر ٹوٹ سکتا ہے جو بدقسمتی سے برعظیم ہند میں چل رہا ہے۔ صرف اسی صورت میں پاکستان بھی انصاف کا گھر بن سکتا ہے اور انڈین یونین کو بھی انصاف کا راستہ نظر آسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ غیر مسلم ایک مدت سے اسلام کی غلط تعبیریں سنتے اور دیکھتے چلے آ رہے ہیں' اس لیے وہ اسلامی حکومت کا نام سن کر گھبراتے ہیں' اور ان میں سے بعض لوگ یہ شور مچانے لگتے ہیں کہ یہاں بھی انڈین یونین کی طرح بے دین جمہوریت قائم ہونی

چاہئے۔ مگر ہم کو تعجب ہے کہ وہ خود ہی اصرار کر کے یہاں اس چیز کا تجربہ کرنا
چاہتے ہیں جس کا مزہ آج انڈین یونین کے مسلمان چکھ رہے ہیں۔ کیا واقعی وہ کوئی
خوشگوار حالت ہے جس کی تمنا کی جا سکتی ہو؟ کیا اس کے بجائے ایک ایسے نظام کا
تجربہ کرنا زیادہ بہتر نہ ہو گا جس کی بنیاد خدا ترسی اور دیانت اور مستقل اصولوں کی
پیروی پر ہو۔

باب ۱۴

اسلام اور عدل اجتماعی

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل اجتماعی اور کفالت عامہ کا نظام قائم کرے اور اپنے حدود میں رہنے والے ہر شخص کے لیے باعزت زندگی گزارنے کی سہولتیں فراہم کریں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس موضوع پر حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں منعقد کی جانے والی موتمر عالم اسلامی کے اجتماع میں ایک مقالہ پڑھا تھا جسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ مقالہ اسلامی ریاست کی معاشی اور تمدنی پالیسی پر روشنی ڈالتا ہے۔

مرتب

اسلام اور عدل اجتماعی

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اس کے عجیب کرشموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عریاں فساد اور بے نقاب فتنے کی طرف کم ہی راغب ہوتا ہے اور اس بناء پر شیطان اکثر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے فتنہ وفساد کو کسی نہ کسی طرح صلاح وخیر کا دھوکہ دینے والا لباس پہنا کر اس کے سامنے لائے۔ جنت میں آدم علیہ السلام کو یہ کہہ کر شیطان ہرگز دھوکا نہ دے سکتا تھا کہ میں تم سے خدا کی نافرمانی کرانا چاہتا ہوں تاکہ تم جنت سے نکال دیئے جاؤ۔ بلکہ اس نے یہ کہہ کر انہیں دھوکا دیا کہ ھل ادلک علیٰ شجرۃ الخلد وملک لا یبلیٰ [1] (کیا میں تمہیں وہ درخت بتاؤں جو حیات ابدی اور لازوال بادشاہی کا درخت ہے) یہی انسان کی فطرت آج تک بھی چل رہی ہے۔ آج بھی جتنی غلطیوں اور حماقتوں میں شیطان اس کو مبتلا کر رہا ہے وہ سب کسی نہ کسی پر فریب نعرے اور کسی نہ کسی لباس زور کے سہارے مقبول ہو رہی ہیں۔

دور جدید کے چند فریب

انہی دھوکوں میں سے ایک بہت بڑا دھوکا وہ ہے جو موجودہ زمانے میں اجتماعی عدل (Social Justice) کے نام سے بنی نوع انسان کو دیا جا رہا ہے۔ شیطان پہلے ایک مدت تک دنیا کو حریت فرد (Individual Liberty) اور فراخدلی (Liberalism) کے نام سے دھوکا دیتا رہا اور اس کی بنیاد پر اس نے اٹھارہویں

---

[1] سورہ طٰہٰ = ۱۲۰

صدی میں سرمایہ داری اور لادینی جمہوریت کا ایک نظام قائم کرایا۔ ایک وقت اس نظام کے غلبے کا یہ حال تھا کہ دنیا میں اسے انسانی ترقی کا حرف آخر سمجھا جاتا تھا اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہلانا چاہتا ہو مجبور تھا کہ اسی انفرادی آزادی اور فراخدلی کا نعرہ لگائے۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حیات انسانی کے لیے اگر کوئی نظام ہے تو بس وہ یہی سرمایہ داری نظام اور یہی لادینی جمہوریت ہے جو مغرب میں قائم ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے وہ وقت بھی آگیا جب ساری دنیا یہ محسوس کرنے لگی کہ اس شیطانی نظام نے زمین کو ظلم و جور سے بھر دیا ہے۔ اس کے بعد ابلیس لعین کے لیے ممکن نہ رہا کہ اس نعرے سے مزید کچھ مدت تک نوع انسانی کو دھوکا دے سکے۔

پھر کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہی شیطان ایک دوسرا فریب اجتماعی عدل اور اشتراکیت کے نام سے بنا لایا اور اب اس جھوٹ کے لباس میں وہ ایک دوسرا نظام قائم کروا رہا ہے۔ یہ نیا نظام اس وقت تک دنیا کے متعدد ملکوں کو ایک ایسے ظلم عظیم سے لبریز کر چکا ہے جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ مگر اس کے فریب کا یہ زور ہے کہ بہت سے دوسرے ملک اسے ترقی کا حرف آخر سمجھ کر قبول کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ابھی اس فریب کا پردہ پوری طرح چاک نہیں ہوا ہے۔

مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں ایک دائمی وابدی ہدایت موجود ہے جو انہیں شیطانی وساوس پر متنبہ کرنے اور زندگی کے تمام معاملات میں ہدایت کی روشنی دکھانے کے لیے ابد تک کافی ہے' مگر یہ مساکین اپنے دین سے جاہل اور استعمار کی تہذیبی و فکری تاخت سے بری طرح مغلوب ہیں۔ اس لیے ہر وہ نعرہ جو دنیا کی غالب قوموں کے کیمپ سے بلند ہوتا ہے' اس کی صدائے بازگشت فوراً ہی یہاں سے بلند ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں انقلاب فرانس کے اٹھائے ہوئے افکار کا زور تھا' مسلمان ملکوں میں ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنا فرض سمجھتا تھا کہ انہی افکار کا موقع بے موقع اظہار کرے اور

انہی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالے۔ اس کے بغیر وہ سمجھتا تھا کہ اس کی کوئی عزت قائم نہ ہو گی اور وہ رجعت پسند سمجھ لیا جائے گا۔ یہ دور جب گزر گیا تو ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی سمت قبلہ بھی تبدیل ہونے لگی اور نیا دور آتے ہی اجتماعی عدل اور اشتراکیت کے نعرے بلند کرنے والے ہمارے درمیان پیدا ہونے لگے۔ یہاں تک بھی بات قابل صبر تھی۔ لیکن غضب یہ ہے کہ ایک گروہ ہمارے اندر ایسا بھی اٹھتا رہا ہے جو اپنے قبلے کی ہر تبدیلی کے ساتھ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اپنا قبلہ تبدیل کرے۔ گویا اسلام کے بغیر یہ بیچارے جی نہیں سکتے۔ اس کا ان کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ جس کی پیروی کر کے یہ ترقی کرنا چاہتے ہیں اس کی پیروی سے اسلام بھی مشرف ہو جائے اور "دین رجعی" ہونے کے الزام سے بچ جائے۔ اسی بناء پر پہلے کوشش کی جاتی تھی کہ حریت فرد اور فراخ دلی اور سرمایہ داری اور بے دین جمہوریت کے مغربی تصورات کو عین اسلامی ثابت کیا جائے' اور اسی بناء پر اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں بھی اشتراکی تصور کی عدالت اجتماعیہ موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی غلامی اور ان کی جاہلیت کی طغیانی ذلت کی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے۔

عدالت اجتماعیہ کی حقیقت

میں اس مختصر مقالے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عدالت اجتماعیہ درحقیقت نام کس چیز کا ہے اور اس کے قیام کی صحیح صورت کیا ہے۔ اگرچہ اس امر کی امید بہت کم ہے کہ جو لوگ اشتراکیت کو عدالت اجتماعیہ کے قیام کی واحد صورت سمجھ کر اسے نافذ کرنے پر تلے ہوئے ہیں وہ اپنی غلطی مان لیں گے اور اس سے رجوع کر لیں گے' کیونکہ جاہل جب تک محض جاہل رہتا ہے اس کی اصلاح کے بہت کچھ امکانات باقی رہتے ہیں' مگر جب وہ حاکم ہو جاتا ہے تو ماعلمت لکم من الٰہ غیری۔[1]

---

[1] القصص : ۳۸ "مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا۔"

کا زعم اسے کسی سمجھانے والے کی بات سمجھنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ لیکن عامتہ الناس خدا کے فضل سے ہر وقت اس قابل رہتے ہیں کہ معقول طریقے سے بات سمجھا کر انہیں شیطان کے فریبوں پر متنبہ کیا جا سکے۔ اور یہی عامتہ الناس ہیں جنہیں فریب دے کر گمراہ اور گمراہ کن لوگ اپنی ضلالتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ اس لیے میرے اس مقالے کی غرض دراصل عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو کھول کر بیان کر دینا ہے۔

اسلام ہی میں عدالت اجتماعیہ

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو میں اپنے مسلمان بھائیوں کو سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو لوگ "اسلام میں بھی عدالت اجتماعیہ موجود ہے" کا نعرہ بلند کرتے ہیں وہ بالکل ایک غلط بات کہتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام ہی میں عدالت اجتماعیہ ہے۔ اسلام وہ دین حق ہے جو خالق کائنات اور رب کائنات نے انسان کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور یہ طے کرنا کہ ان کے لیے کیا چیز عدل ہے اور کیا عدل نہیں ہے' انسانوں کے خالق و رب ہی کا کام ہے۔ دوسرا کوئی نہ اس کا مجاز ہے کہ عدل و ظلم کا معیار تجویز کرے' اور نہ دوسرے کسی میں یہ اہلیت پائی جاتی ہے کہ حقیقی عدل قائم کر سکے۔ انسان اپنا آپ مالک اور حاکم نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے معیار عدل خود تجویز کر لینے کا مجاز ہو۔ کائنات میں اس کی حیثیت خدا کے مملوک اور رعیت کی ہے' اس لئے معیار عدل تجویز کرنا اس کا اپنا نہیں بلکہ اس کے مالک اور فرماں روا کا کام ہے۔ پھر انسان' خواہ' کتنے ہی بلند مرتبے کا ہو' اور خواہ ایک انسان نہیں بہت سے بلند مرتبہ انسان مل کر بھی اپنا ذہن استعمال کر لیں۔ بہرحال انسانی علم کی محدودیت اور عقل انسانی کی کوتاہی و نارسائی اور انسانی عقل پر خواہشات و تعصبات کی دست برد سے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان خود اپنے لیے کوئی ایسا نظام بنا سکے جو درحقیقت عدل پر مبنی ہو۔ انسان کے بنائے

ہوئے نظام میں ابتدا" بظاہر کیسا ہی عدل نظر آئے' بہت جلدی عملی تجربہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ فی الحقیقت اس میں عدل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہر انسانی نظام کچھ مدت تک چلنے کے بعد ناقص ثابت ہو جاتا ہے اور انسان اس سے بیزار ہو کر ایک دوسرے احمقانہ تجربے کی طرف پیش قدمی کرنے لگتا ہے۔ حقیقی عدل صرف اسی نظام میں ہو سکتا ہے جو ایک عالم الغیب والشہادہ اور سبوح و قدوس ہستی نے بنایا ہے۔

عدل ہی اسلام کا مقصود

دوسری بات جو آغاز ہی میں سمجھ لینی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص "اسلام میں عدل ہے" کہتا ہے وہ حقیقت سے کم تر بات کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل ہی اسلام کا مقصود ہے اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ عدل قائم کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معهم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ج وانزلنا الحدید فیه باس شدید و منافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسله بالغیب ان اللہ قوی عزیز۔ (الحدید ـ ۲۵)

"ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ انسان انصاف پر قائم ہو' اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت طاقت اور لوگوں کے لیے فوائد ہیں' تاکہ اللہ یہ معلوم کرے کہ کون بے دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً" اللہ قوی اور زبردست ہے۔"

یہ دو باتیں ہیں جن سے اگر ایک مسلمان غافل نہ ہو تو وہ کبھی عدلت اجتماعیہ کی تلاش میں اللہ اور اس کے رسولؐ کو چھوڑ کر کسی دوسرے ماخذ کی طرف توجہ کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ جس لیے اس عدل کی ضرورت کا احساس ہو گا اسی لیے اسے معلوم ہو جائیگا کہ عدل اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کسی کے پاس نہ

ہے' اور نہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جان لے گا کہ عدل قائم کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ کرنا نہیں ہے کہ اسلام' پورا کا پورا اسلام' بلاکم و کاست اسلام' قائم کر دیا جائے۔ عدل' اسلام سے الگ کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ اسلام خود عدل ہے۔ اس کا قائم ہونا اور عدل کا قائم ہو جانا ایک ہی چیز ہے۔

عدل اجتماعی کیا ہے؟

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ عدل اجتماعی در حقیقت ہے کس چیز کا نام اور اس کے قیام کی صحیح صورت کیا ہے؟

انسانی شخصیت کی نشوونما

ہر انسانی معاشرہ ہزاروں' لاکھوں اور کروڑوں افراد سے مل کر بنتا ہے۔ اس مرکب کا ہر فرد ذی روح' ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ ہر فرد اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے جسے پھلنے پھولنے اور نشو و نما پانے کے لیے مواقع درکار ہیں۔ ہر فرد کا اپنا ایک ذاتی ذوق ہے۔ اس کے اپنے نفس کی کچھ رغبات و خواہشات ہیں۔ اس کے اپنے جسم و روح کی کچھ ضروریات ہیں۔ ان افراد کی حیثیت کسی مشین کے بے روح پرزوں کی سی نہیں ہے کہ اصل چیز مشین ہو اور یہ پرزے اس مشین ہی کے لیے مطلوب ہوں' اور بجائے خود پرزوں کی کوئی شخصیت نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس انسانی معاشرہ جیتے جاگتے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ افراد اس مجموعے کے لیے نہیں ہیں بلکہ مجموعہ ان افراد کے لئے ہے' اور افراد جمع ہو کر یہ مجموعہ بناتے ہی اس غرض کے لیے ہیں کہ ایک دوسرے کی مدد سے انہیں اپنی ضروریات حاصل کرنے اور اپنے نفس و جسم کے مطالبات اور تقاضے پورے کرنے کے مواقع ملیں۔

انفرادی جوابدہی

پھر یہ تمام افراد فرداً" فرداً" خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ہر ایک کو اس دنیا

میں ایک خاص مدت امتحان (جو ہر فرد کے لیے الگ مقرر ہے) گزارنے کے بعد اپنے خدا کے حضور جا کر حساب دینا ہے کہ جو قوتیں اور صلاحیتیں اسے دنیا میں دی گئی تھیں ان سے کام لے کر اور جو ذرائع اسے عطا کیے گئے تھے ان پر کام کر کے وہ اپنی کیا شخصیت بنا کر لایا ہے۔ خدا کے سامنے انسان کی یہ جواب دہی اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ وہاں کنبے اور قبیلے اور قومیں کھڑی ہو کر حساب نہیں دیں گی' بلکہ دنیا کے تمام رشتوں سے کاٹ کر اللہ تعالیٰ ہر ہر انسان کو الگ الگ اپنی عدالت میں حاضر کرے گا اور فرداً" فرداً" اس سے پوچھے گا کہ تو کیا کر کے آیا ہے اور کیا بن کر آیا ہے۔

انفرادی آزادی

یہ دونوں امور ------ یعنی دنیا میں انسانی شخصیت کا نشو و نماء اور آخرت میں انسان کی جواب دہی ------ اسی بات کے طالب ہیں کہ دنیا میں فرد کو حریت حاصل ہو۔ اگر کسی معاشرے میں فرد کو اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی تشکیل کے مواقع حاصل نہ ہوں تو اس کے اندر انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے' اس کا دم گھٹنے لگتا ہے' اس کی قوتیں اور قابلیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور اپنے آپ کو محصور و محبوس پا کر انسان جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر آخرت میں ان محبوس و محصور افراد کے قصوروں کی بیشتر ذمہ داریاں ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جانے والی ہیں جو اس قسم کے اجتماعی نظام کو بنانے اور چلانے کے ذمہ دار ہوں۔ ان سے صرف ان کے انفرادی اعمال ہی کا محاسبہ نہ ہو گا بلکہ اس بات کا محاسبہ بھی ہو گا کہ انہوں نے ایک جابرانہ نظام قائم کر کے دوسرے بے شمار انسانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اور اپنی مرضی کے مطابق ناقص شخصیتیں بننے پر مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی مومن بالآخر یہ بھاری بوجھ اٹھا کر خدا کے سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر خدا سے ڈرنے والا انسان ہے تو لازماً" وہ افراد کو زیادہ سے زیادہ حریت دینے کی طرف مائل ہو گا تاکہ ہر فرد جو کچھ بھی بنے اپنی ذمہ داری پر بنے'

اس کے ایک غلط شخصیت بننے کی ذمہ داری اجتماعی نظام چلانے والے پر عائد نہ ہو جائے۔

اجتماعی ادارے اور ان کا اقتدار

یہ معاملہ تو ہے انفرادی آزادی کا۔ دوسری طرف معاشرے کو دیکھیے جو کنبوں، قبیلوں، قوموں اور پوری انسانیت کی شکل میں علی الترتیب قائم ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء ایک مرد اور ایک عورت اور ان کی اولاد سے ہوتی ہے جس سے خاندان بنتا ہے۔ ان خاندانوں سے قبیلے اور برادریاں بنتی ہیں، ان سے ایک قوم وجود میں آتی ہے، اور قوم اپنے اجتماعی ارادوں کی تنفیذ کے لیے ایک ریاست کا نظام بناتی ہے۔ ان مختلف شکلوں میں یہ اجتماعی ادارے اصلاً جس غرض کے لیے مطلوب ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی حفاظت اور ان کی مدد سے فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے وہ مواقع نصیب ہو سکیں جو وہ تنہا اپنے بل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس بنیادی مقصد کا حصول اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے ہر ایک ادارے کو افراد پر، اور بڑے ادارے کو چھوٹے اداروں پر اقتدار حاصل ہو تاکہ وہ افراد کی ایسی آزادی کو روک سکیں جو دوسروں پر دست درازی کی حد تک پہنچتی ہو، اور افراد سے وہ خدمت لے سکیں جو بحیثیت مجموعی تمام افراد معاشرہ کی فلاح و ترقی کے لیے مطلوب ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عدالت اجتماعیہ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور انفرادیت واجتماعیت کے متضاد تقاضے ایک گتھی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طرف انسانی فلاح اس بات کی متقضی ہے کہ فرد کو معاشرے میں آزادی حاصل ہو تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکے۔ اور اسی طرح خاندان، قبیلے، برادریاں، اور مختلف گروہ بھی اپنے سے بڑے دائرے کے اندر اس آزادی سے متمتع ہوں جو ان کے اپنے دائرہ عمل میں انہیں حاصل ہونی ضروری ہے۔ مگر دوسری طرف انسانی فلاح ہی اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ افراد پر خاندان کا، خاندانوں پر قبیلوں اور برادریوں کا، اور

تمام افراد اور چھوٹے اداروں پر ریاست کا اقتدار ہو' تاکہ کوئی اپنی حد سے تجاوز کر کے دوسروں پر ظلم و تعدی نہ کر سکے۔ اور یہی مسئلہ آگے چل کر پوری انسانیت کے لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف ہر قوم اور ریاست کی آزادی و خود مختاری کا برقرار رہنا بھی ضروری ہے' اور دوسری طرف کسی بالاتر قوت ضابطہ کا ہونا بھی ضروری ہے کہ یہ قومیں اور ریاستیں حد سے تجاوز نہ کر سکیں۔

اب عدالت اجتماعیہ درحقیقت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ افراد' خاندانوں' قبیلوں' برادریوں اور قوموں میں سے ہر ایک کو مناسب آزادی بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ظلم و عدوان کو روکنے کے لیے مختلف اجتماعی اداروں کو افراد پر اور ایک دوسرے پر اقتدار بھی حاصل رہے' اور مختلف افراد مجتمعات سے وہ خدمت بھی لی جا سکے جو اجتماعی فلاح کے لیے درکار ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کی خامیاں

اس حقیقت کو جو شخص اچھی طرح سمجھ لے گا وہ پہلی ہی نظر میں یہ جان لے گا کہ جس طرح حریت فرد' فراخ دلی' سرمایہ داری اور بے دین جمہوریت کا وہ نظام اجتماعی عدل کے منافی تھا جو انقلاب فرانس کے نتیجے میں قائم ہوا تھا' ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اشتراکیت بھی اس کے قطعی منافی ہے جو کارل مارکس اور انجلز کے نظریات کی پیروی میں اختیار کی جا رہی ہے۔ پہلے نظام کا قصور یہ تھا کہ اس نے فرد کو حد مناسب سے زیادہ آزادی دے کر خاندان' قبیلے' برادری' معاشرے اور قوم پر تعدی کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی اور اس سے اجتماعی فلاح کی خدمت لینے کے لیے معاشرے کی قوت ضابطہ کو بہت ڈھیلا کر دیا۔ اور اس دوسرے نظام کا قصور یہ ہے کہ یہ ریاست کو حد سے زیادہ طاقت ور بنا کر افراد' خاندانوں' قبیلوں اور برادریوں کی آزادی قریب قریب بالکل سلب کر لیتا ہے' اور افراد سے مجتمع کی خدمت لینے کے لیے ریاست کو اتنا زیادہ اقتدار دے دیتا ہے کہ افراد ذی روح انسانوں کے بجائے ایک مشین کے بے روح پرزوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

بالکل جھوٹ کہتا ہے جو کہتا ہے کہ اس طریقے سے عدالت اجتماعیہ قائم ہو سکتی ہے۔

اشتراکیت ظلم اجتماعی کی بدترین شکل

درحقیقت یہ ظلم اجتماعی کی وہ بدترین صورت ہے جو کبھی کسی نمرود' کسی فرعون اور کسی چنگیز خان کے دور میں بھی نہ رہی تھی۔ آخر اس چیز کو کون صاحب عقل اجتماعی عدل سے تعبیر کر سکتا ہے کہ ایک شخص یا چند اشخاص بیٹھ کر اپنا ایک اجتماعی فلسفہ تصنیف کرلیں' پھر حکومت کے غیر محدود اختیارات سے کام لے کر اس فلسفے کو زبردستی ایک پورے ملک کے رہنے والے کروڑوں افراد پر زبردستی مسلط کر دیں۔ لوگوں کے اموال ضبط کریں' زمینوں پر قبضہ کریں' کارخانوں کو قومی ملکیت بنائیں اور پورے ملک کو ایک ایسے جیل خانے میں تبدیل کر دیں جس میں تنقید' فریاد' شکایت' استغاثے اور عدالتی انصاف کا ہر دروازہ لوگوں کے لیے مسدود ہو۔ ملک کے اندر کوئی جماعت نہ ہو' کوئی تنظیم نہ ہو' کوئی پلیٹ فارم نہ ہو جس پر لوگ زبان کھول سکیں' کوئی پریس نہ ہو جس میں لوگ اظہار خیال کر سکیں ' اور کوئی عدالت نہ ہو جس کا دروازہ انصاف کے لیے کھٹکھٹا سکیں۔ جاسوسی کا نظام اتنے بڑے پیمانے پر پھیلا دیا جائے کہ ہر ایک آدمی دوسرے آدمی سے ڈرنے لگے کہ کہیں یہ جاسوس نہ ہو' حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی ایک آدمی زبان کھولتے ہوئے پہلے چاروں طرف دیکھ لے کہ کوئی کان اس کی بات سننے اور کوئی زبان اسے حکومت تک پہنچانے کے لیے کہیں پاس ہی موجود نہ ہو۔ پھر جمہوریت کا فریب دینے کے لیے انتخابات کروائے جائیں' مگر پوری کوشش کی جائے کہ اس فلسفے کی تصنیف کرنے والوں سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص ان انتخابات میں حصہ نہ لے سکے' اور نہ کوئی ایسا شخص ان میں دخیل ہو سکے جو خود اپنی کوئی رائے بھی رکھتا ہو اور اپنا ضمیر فروخت کرنے والا بھی نہ ہو۔

بالفرض اس طریقے سے اگر معاشی دولت کی مساوی تقسیم ہو بھی سکے ---- درآنحالیکہ آج تک کوئی اشتراکی نظام ایسا نہیں کر سکا ہے ---- تب

بھی کیا عدل محض معاشی مساوات کا نام ہے؟ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ اس نظام کے حاکموں اور محکوموں کے درمیان بھی معاشی مساوات ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس نظام کا ڈکٹیٹر اور اس کے اندر رہنے والا ایک کسان کیا اپنے معیار زندگی میں مساوی ہیں؟ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ اگر ان سب کے درمیان واقعی پوری معاشی مساوات قائم بھی ہو جائے تو کیا اس کا نام اجتماعی عدل ہو گا؟ کیا عدل یہی ہے کہ ڈکٹیٹر اور اس کے ساتھیوں نے جو فلسفہ گھڑا ہے اس کو تو وہ پولیس اور فوج اور جاسوسی نظام کی طاقت سے بالجبر ساری قوم پر مسلط کر دینے میں بھی آزاد ہو۔ اور قوم کا کوئی فرد اس کے فلسفے پر۔ یا اس کی تنفیذ کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزوی عمل پر محض زبان سے ایک لفظ نکالنے تک میں آزاد نہ ہو؟ کیا یہ عدل ہے کہ ڈکٹیٹر اور اس کے چند مٹھی بھر حامی اپنے فلسفے کی ترویج کے لیے تمام ملک کے ذرائع و وسائل استعمال کرنے اور ہر قسم کی تنظیمات بنانے کے حق دار ہوں مگر ان سے مختلف رائے رکھنے والے دو آدمی بھی مل کر کوئی تنظیم نہ کر سکیں، کسی مجمع کو خطاب نہ کر سکیں، اور کسی پریس میں ایک لفظ بھی شائع نہ کرا سکیں؟ کیا یہ عدل ہے کہ تمام زمینداروں اور کارخانہ داروں کو بے دخل کر کے پورے ملک میں صرف ایک ہی زمیندار اور کارخانہ دار رہ جائے جس کا نام حکومت ہو، اور وہ حکومت چند گنے چنے آدمیوں کے ہاتھ میں ہو، اور وہ آدمی ایسی تمام تدابیر اختیار کر لیں جن سے پوری قوم بالکل بے بس ہو جائے اور حکومت کے اختیارات کا ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلا جانا قطعی ناممکن ہو جائے؟ انسان اگر محض پیٹ کا نام نہیں ہے، اور انسانی زندگی اگر صرف معاش تک محدود نہیں ہے، تو محض معاشی مساوات کو عدل کیسے کہا جا سکتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ظلم و جور قائم کر کے، اور انسانیت کے ہر رخ کو دبا کر صرف معاشی دولت کی تقسیم میں لوگوں کو برابر بھی کر دیا جائے، اور خود ڈکٹیٹر اور اس کے اذناب بھی اپنے معیار زندگی میں لوگوں کے برابر ہو کر رہیں، تب بھی اس ظلم عظیم کے ذریعہ سے یہ مساوات

قائم کرنا اجتماعی عدل قرار نہیں پا سکتا بلکہ یہ' جیسا کہ ابھی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں' وہ بد ترین اجتماعی ظلم ہے جس سے تاریخ انسانی کبھی اس سے پہلے آشنا نہ ہوئی تھی۔

اسلام میں عدل کا تصور

اب میں اختصار کے ساتھ آپ کو بتاؤں گا کہ اسلام میں جس چیز کا نام عدل ہے وہ کیا ہے۔ اسلام میں اس امر کو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص' یا انسانوں کا کوئی گروہ انسانی زندگی میں عدل کا کوئی فلسفہ اور اس کے قیام کا کوئی طریقہ بیٹھ کر خود گھڑ لے اور اسے بالجبر لوگوں پر مسلط کر دے اور کسی بولنے والی زبان کو حرکت نہ کرنے دے۔ یہ مقام ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو تو کیا' خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حاصل نہ تھا۔ اسلام میں کسی ڈکٹیٹر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ صرف خدا ہی کا یہ مقام ہے کہ انسان اس کے حکم کے آگے بے چون چرا سر جھکا دیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس کے حکم کے تابع تھے اور ان کے حکم کی اطاعت صرف اس لیے فرض تھی کہ وہ خدا کی طرف سے حکم دیتے تھے نہ کہ معاذ اللہ اپنے نفس سے گھڑ کر کوئی فلسفہ لے آتے تھے۔ رسولؐ اور خلفائے رسول کے نظام حکم میں صرف شریعت ایسی تنقید سے بالا تر تھی۔ اس کے بعد ہر شخص کو ہر وقت ہر معاملے میں زبان کھولنے کا پورا حق حاصل تھا۔

آزادی فرد کے حدود

اسلام میں اللہ تعالیٰ نے خود وہ حدود قائم کر دیے ہیں جن میں افراد کی آزادی کو محدود ہونا چاہیے۔ اس نے خود متعین کر دیا ہے کہ ایک فرد مسلم کے لیے کون کون سے افعال حرام ہیں جن سے اس کو بچنا چاہیے اور کیا کچھ اس پر فرض ہے جسے اس کو ادا کرنا چاہیے۔ کیا حقوق اس کے دوسروں پر ہیں اور کیا حقوق دوسروں کے اس پر ہیں۔ کن ذرائع سے ایک مال کی ملکیت کا اس کی طرف نقل

ہونا جائز ہے اور کون سے ذرائع ایسے ہیں جن سے حاصل ہونے والے مال کی ملکیت جائز نہیں ہے۔ افراد کی بھلائی کے لیے مجتمع پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور مجتمع کی بھلائی کے لیے افراد پر' خاندانوں اور برادریوں پر اور پوری قوم پر کیا پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں اور کیا خدمات لازم کی جاسکتی ہیں۔ یہ تمام امور کتاب و سنت کے اس مستقل دستور میں ثبت ہیں جس پر کوئی نظرثانی کرنے والا نہیں ہے اور جس میں کسی کو کمی و بیشی کر دینے کا حق نہیں ہے۔ اس دستور کی رو سے ایک شخص کی انفرادی آزادیوں پر جو پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں ان سے تجاوز کرنے کا تو وہ حق نہیں رکھتا لیکن ان حدود کے اندر جو آزادی اس کو حاصل ہے اسے سلب کر لینے کا بھی کسی کو حق نہیں ہے۔ کسب اموال کے جن ذرائع اور صرف مال کے جن طریقوں کو حرام کر دیا گیا ہے ان کے وہ قریب نہیں پھٹک سکتا اور پھٹکے تو اسلامی قانون اسے مستوجب سزا سمجھتا ہے' لیکن جو ذرائع حلال ٹھیرائے گئے ہیں ان سے حاصل ہونے والی ملکیت پر اس کے حقوق بالکل محفوظ ہیں اور اس میں تصرف کے جو طریقے جائز کیے گئے ہیں ان سے کوئی اس کو محروم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مجتمع کی فلاح کے لیے جو فرائض افراد پر عاید کر دیے گئے ہیں۔ ان کے ادا کرنے پر تو وہ مجبور ہے' لیکن اس سے زائد کوئی بار جبراً" اس پر عاید نہیں کیا جا سکتا' الا یہ کہ وہ خود رضاکارانہ ایسا کرے۔ اور یہی حال مجتمع اور ریاست کا بھی ہے کہ افراد کے جو حقوق اس پر عاید کیے گئے ہیں انہیں ادا کرنا اس پر اتنا ہی لازم ہے جتنا افراد سے اپنے حقوق وصول کرنے کے اسے اختیارات ہیں۔ اس مستقل دستور کو اگر عملاً نافذ کر دیا جائے تو ایسا مکمل عدل اجتماعی قائم ہوتا ہے جس کے بعد کوئی شے مطلوب باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ دستور جب تک موجود ہے اس وقت تک کوئی شخص خواہ کتنی ہی کوشش کرے' مسلمانوں کو ہرگز اس دھوکے میں نہیں ڈال سکتا کہ جو اشتراکیت اس نے کسی جگہ سے مستعار لے لی ہے وہی عین اسلام ہے۔

اسلام کے اس دستور میں فرد اور مجتمع کے درمیان ایسا توازن قائم کیا گیا ہے

کہ نہ فرد کو وہ آزادی دی گئی ہے جس سے وہ مجتمع کے مفاد کو نقصان پہنچا سکے اور نہ مجتمع کو یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ فرد سے اس کی وہ آزادی سلب کر سکے جو اس کی شخصیت کے نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

انتقال دولت کے شرائط

اسلام ایک فرد کی طرف دولت کے انتقال کی صرف تین صورتیں معین کر دیتا ہے۔ وراثت' ہبہ' کسب' وراثت صرف وہ معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک سے اس کے وارث کو شرعی قاعدے کے مطابق پہنچے۔ ہبہ یا عطیہ صرف وہ معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک نے شرعی حدود کے اندر دیا ہو۔ اور اگر یہ عطیہ کسی حکومت کی طرف سے ہو تو وہ اسی صورت میں جائز ہے جب کہ وہ کسی صحیح خدمت کے صلے میں یا مجتمع کے مفاد کے لیے املاک حکومت میں سے معروف طریقے پر دیا گیا ہو۔ نیز اس طرح کا عطیہ دینے کی حق دار بھی وہ حکومت ہے جو شرعی دستور کے مطابق شوریٰ کے طریقے پر چلائی جا رہی ہو اور جس سے محاسبہ کرنے کی قوم کو آزادی حاصل ہو۔ رہا کسب تو اسلام میں صرف وہ کسب جائز ہے جو کسی حرام طریقے سے نہ ہو۔ سرقہ' غصب' ناپ تول میں کمی بیشی' خیانت' رشوت' غبن' قحبہ گری' احتکار[1] سود' جوا' دھوکے کا سودا' مسکرات کی صنعت و تجارت اور اشاعت فاحشہ کرنے والے کاروبار کے ذریعہ سے کسب اسلام میں حرام ہے۔ ان حدود کی پابندی کرتے ہوئے جو دولت بھی کسی کو ملے وہ اس کی جائز ملک ہے' قطع نظر اس سے کہ وہ کم ہو یا زیادہ۔ ایسی ملکیت کے لیے نہ کمی کی کوئی حد مقرر کی جا سکتی ہے نہ زیادتی کی۔ نہ اس کا کم ہونا اس بات کو جائز کر دیتا ہے کہ دوسروں سے چھین کر اس میں اضافہ کیا جائے' اور نہ اس کا زیادہ ہونا اس امر کے لیے کوئی دلیل

---

[1] قیمتیں چڑھانے کے لئے ضروریات زندگی کو روک رکھنا۔

ہے کہ اسے زبردستی کم کیا جائے۔ البتہ جو دولت ان جائز حدود سے تجاوز کر کے حاصل ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ سوال اٹھانے کا مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ من این لک ھذا (یہ تجھے کہاں سے ملا)۔ اس دولت کے بارے میں پہلے قانونی تحقیق ہونی چاہیے' پھر اگر ثابت ہو جائے کہ وہ جائز ذرائع سے حاصل نہیں ہوئی ہے تو اسے ضبط کرنے کا اسلامی حکومت کو پورا حق پہنچتا ہے۔

صرف دولت پر پابندیاں

جائز طریقے پر حاصل ہونے والی دولت پر تصرف کے بارے میں بھی فرد کو بالکل کھلی چھوٹ نہیں دے دی گئی ہے بلکہ اس پر کچھ قانونی پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں تاکہ کوئی فرد اپنی ملکیت میں کسی ایسے طریقے پر تصرف نہ کر سکے جو معاشرے کے لیے نقصان دہ ہو' یا جس میں خود اس فرد کے دین و اخلاق کا نقصان ہو۔ اسلام میں کوئی شخص اپنی دولت کو فسق و فجور میں صرف نہیں کر سکتا۔ شراب نوشی اور قمار بازی کا دروازہ اس کے لیے بند ہے۔ زنا کا دروازہ بھی اس کے لیے بند ہے۔ وہ آزاد انسانوں کو پکڑ کر انہیں لونڈی غلام بنانے اور ان کی بیع و شریٰ کرنے کا بھی کسی کو حق نہیں دیتا کہ دولت مند لوگ اپنے گھروں کو خریدی ہوئی لونڈیوں سے بھر لیں۔ اسراف اور حد سے زیادہ ترفہ اور تنعم پر بھی وہ حدود عاید کرتا ہے اور وہ اسے بھی جائز نہیں رکھتا کہ تم خود عیش کرو اور تمہارا ہمسایہ رات کو بھوکا سوئے۔ اسلام صرف مشروع اور معروف طریقے پر ہی دولت سے متمتع ہونے کا آدمی کو حق دیتا ہے اور اگر ضرورت سے زائد دولت کو مزید دولت کمانے کے لیے کوئی شخص استعمال کرنا چاہے تو وہ کسب مال کے صرف حلال طریقے ہی اختیار کر سکتا ہے۔ ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا جو شریعت نے کسب پر عائد کر دی ہیں۔

معاشرتی خدمت

پھر اسلام معاشرے کی خدمت کے لیے ہر اس فرد پر جس کے پاس نصاب ہے

زائد مال جمع ہو زکوٰۃ عائد کرتا ہے۔ نیز وہ اموال تجارت پر' زمین کی پیداوار پر' مواشی پر' اور بعض دوسرے اموال پر بھی ایک خاص شرح سے زکوٰۃ مقرر کرتا ہے۔ آپ دنیا کے کسی ملک کو لے لیجئے اور حساب لگا کر دیکھ لیجئے کہ اگر شرعی طریقے کے مطابق وہاں باقاعدہ زکوٰۃ وصول کی جائے اور اسے قرآن کے مقرر کیے ہوئے مصارف میں باقاعدہ تقسیم کیا جائے تو کیا چند سال کے اندر وہاں ایک شخص بھی حاجات زندگی سے محروم رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد جو دولت کسی ایک فرد کے پاس مرتکز ہو گئی ہو' اسلام اس کے مرتے ہی اس دولت کو وراثت میں تقسیم کر دیتا ہے تاکہ یہ ارتکاز ایک دائمی اور مستقل ارتکاز بن کر نہ رہ جائے۔

استیصال ظلم

اس کے علاوہ اسلام اگرچہ اس کو پسند کرتا ہے کہ مالک زمین اور مزارع' یا کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان خود باہمی رضامندی سے معروف طریقے پر معاملات طے ہوں' اور قانون کی مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن جہاں کہیں ان معاملات میں ظلم ہو رہا ہو وہاں اسلامی حکومت مداخلت کرنے کا پورا حق رکھتی ہے اور قانون کے ذریعہ سے انصاف کے حدود قائم کر سکتی ہے۔

مصالح عامہ کے لیے قومی ملکیت کے حدود

اسلام اس امر کو حرام نہیں کرتا کہ کسی صنعت یا کسی تجارت کو حکومت اپنے انتظام میں چلائے۔ اگر کوئی صنعت یا تجارت ایسی ہو جس کی اجتماعی مصالح کے لیے ضرورت تو ہو مگر افراد اس کو چلانے کے لیے تیار نہ ہوں' یا افراد کے انتظام میں اس کا چلنا اجتماعی مفاد کے خلاف ہو تو اسے حکومت کے انتظام میں چلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی صنعت یا تجارت کچھ افراد کے ہاتھوں میں ایسے طریقوں سے چل رہی ہو جو اجتماعی مفاد کے لیے نقصان دہ ہو تو حکومت ان افراد کو معاوضہ دے کر وہ کاروبار اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے اور کسی دوسرے مناسب طریقے سے اس کے چلانے کا انتظام کر سکتی ہے۔ ان تدابیر کے اختیار کرنے میں کوئی مانع شرعی نہیں

ہے۔ لیکن اسلام اس بات کو ایک اصول کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا کہ دولت کی پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کی ملک میں ہوں اور حکومت ہی ملک کی واحد صناع و تاجر اور مالک اراضی ہو۔

بیت المال میں تصرف کے شرائط

بیت المال کے بارے میں اسلام کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ اللہ اور مسلمانوں کا مال ہے اور کسی شخص کو اس پر مالکانہ تصرف کا حق نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تمام امور کی طرح بیت المال کا انتظام بھی قوم یا اس کے آزاد نمائندوں کے مشورے سے ہونا چاہئے۔ جس شخص سے بھی کچھ لیا جائے' اور جس مصرف میں بھی مال صرف کیا جائے وہ جائز شرعی طریقے پر ہونا چاہیے اور مسلمانوں کو اس پر محاسبے کا پورا حق ہے۔

ایک سوال

اس کلام کو ختم کرتے ہوئے میں ہر سوچنے والے انسان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر عدالت اجتماعیہ صرف معاشی عدل ہی کا نام ہے تو کیا یہ معاشی عدل جو اسلام قائم کرتا ہے' ہمارے لیے کافی نہیں ہے؟ کیا اس کے بعد کوئی ضرورت ایسی باقی رہ جاتی ہے جس کی خاطر تمام افراد کی آزادیاں سلب کرنا' لوگوں کے اموال ضبط کرنا' اور ایک پوری قوم کو چند آدمیوں کا غلام بنا دینا ہی ناگزیر ہو؟ آخر اس میں کیا چیز مانع ہے کہ ہم مسلمان اپنے ملکوں میں اسلامی دستور کے مطابق خالص شرعی حکومتیں قائم کریں اور ان میں خدا کی پوری شریعت کو بلاکم وکاست نافذ کردیں۔ جس روز بھی ہم ایسا کریں گے' صرف یہی نہیں کہ ہمیں اشتراکیت سے کسب فیض کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی' بلکہ خود اشتراکیت زدہ ممالک کے لوگ ہمارے نظام زندگی کو دیکھ کر یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ جس روشنی کے بغیر وہ تاریکی میں بھٹک رہے تھے وہ ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

باب ۱۵

اسلامی ریاست کے رہنما اصول

(قرآن کی روشنی میں)

- ❑ حکومت کا مقصد
- ❑ اسلامی حکومت کا مزاج
- ❑ شورائیت
- ❑ عدل و احسان
- ❑ قیادت اور اہل منصب کے انتخاب کے اصول
- ❑ دفاع اور اصول جنگ و صلح
- ❑ معاشرتی' سیاسی اور تعلیمی پالیسی کے عمومی اصول
- ❑ شہریت اور خارجہ پالیسی

اس حصہ کا آخری مضمون اسلامی ریاست کے رہنما اصول ہے۔ یہ مضمون مولانا مودودی صاحبؒ کے ان حواشی سے مرتب کیا گیا ہے جو موصوف نے اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن میں سپرد قلم فرمائے ہیں' مولانا کی یہ تفسیر دور حاضر کے اسلامی لٹریچر کا شاہکار ہے۔ ہم حصہ اول میں اس تفسیر کے حواشی سے اسلام کے سیاسی تصورات کو پیش کر چکے ہیں اور اب اسلامی ریاست کے نظام کار اور اس کی پالیسی کے رہنما اصول بیان کیے جا رہے ہیں۔ اس میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ وہ اصول آ گئے ہیں جن کی رہنمائی میں اسلامی ریاست اپنی سیاسی' معاشی' تعلیمی اور معاشرتی پالیسی تشکیل کرے گی' ان میں سے ہر اصول اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اگر ان پر عمل کیا جائے تو بہترین معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے ----- اور یہی اسلام چاہتا ہے تاکہ اس زمین پر انسان اس طرح زندگی گزارے کہ یہاں بھی امن و چین قائم ہو اور آخرت کی زندگی میں بھی وہ سرخرو ہو۔ آیات کا ترجمہ اور ان کی تشریح مولانا محترم کے قلم سے ہیں اور مرتب نے سلسلہ کلام کو جوڑنے کے لیے درمیان میں اپنی طرف سے حسب ضرورت چند جملوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب اپنے موضوع پر یہ مضمون ایک جامع چیز ہے اور اپنی موجودہ شکل میں پہلی بار زیور طباعت سے آراستہ ہو رہا ہے۔

مرتب

اسلامی ریاست کے رہنما اصول

(۱)

حکومت کا مقصد

قرآن کی نگاہ میں حکومت کا مقصد نیکی' انصاف اور قانون الہی کا قیام ہے۔

(الف) الذین ان مکنہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونہوا عن المنکر ط وللہ عاقبۃ الامور (الحج ۔ ۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوۃ دیں گے' معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے --- اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔"

یعنی اللہ کے مددگار اور اس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دنیا میں انہیں حکومت و فرماں روائی بخشی جائے تو ان کا ذاتی کردار فسق و فجور اور کبر و غرور کی بجائے اقامت صلوۃ سے ہو' ان کی دولت عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے بجائے ایتائے زکوۃ میں صرف ہو' ان کی حکومت نیکی کو دبانے کے بجائے اسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے' اور ان کی طاقت بدیوں کو پھیلانے

کے بجائے ان کے دبانے میں استعمال ہو۔ اس ایک فقرے میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کی خصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی سمجھنا چاہے تو اسی ایک فقرے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی حکومت فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔[1]

اس امت کا شرف و امتیاز ہی یہ ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لیے حق' خیر اور معروف کی داعی بنائی گئی ہے اور اسے انفرادی اور اجتماعی طور پر اس کام کو انجام دینا ہے۔

(ب) وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ (البقرہ - ۱۴۳)

"اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

یہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے "اسی طرح" کا اشارہ دونوں طرف ہے' اللہ کی رہنمائی کی اس طرف بھی' جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اس مرتبے پر پہنچے کہ امت وسط قرار دیئے گئے' اور تحویل قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں' حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمت قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور امت محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

"امت وسط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا اس سے مراد ایک ایسا

---

[1] تفہیم القرآن جلد سوئم صفحہ ۲۳۴۔

اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو' جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو' جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں "امت وسط" اس لیے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔" تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوع انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی۔ اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھایا۔ اس کے بعد رسولؐ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہو گا اور یہ شہادت دینی ہو گی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسولؐ نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لیے خدا ترسی' راست روی' عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے' اسی طرح اس امت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے' راست روی یہ ہے' عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو

خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے' اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمے داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت جو تیرے رسولؐ کے ذریعے ہم تک پہنچی تھی تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے تو ہم بہت بری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر وہاں ہمیں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فتنے اور فساد خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں ان سب کے لیے ائمہ شر اور شیاطین انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا' تو تم کہاں مر گئے تھے؟[1]

(ج) **كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله۔** (آل عمران: ۱۱۰)

"اب دنیا میں تو بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ وہی مضمون ہے جو سورہ بقرہ کے سترہویں رکوع میں بیان ہو چکا ہے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے تبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اخلاق و عمل کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامت عادلہ کے لیے ضروری ہیں یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ اور اللہ وحدہٗ

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول صفحات ۱۱۹۔ ۱۲۰۔

لاشریک کو اعتقاداً" و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرتا۔ لہٰذا اب یہ کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے اور تمہیں لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور غلطیوں سے بچو جو تمہارے پیش رو کر چکے ہیں۔[1]

(د) لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علٰی لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذالک بما عصوا وکانوا یعتدون ○ کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ماکانوا یفعلون (المائدہ۔ ۷۸، ۷۹)

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ برا طرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔"

ہر قوم کا بگاڑ ابتداً" چند افراد سے شروع ہوتا ہے اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہوتا ہے تو رائے عام ان بگڑے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیت مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملہ میں تساہل شروع کر دیتی ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کے بجائے انہیں سوسائٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی پوری قوم میں پھیل کر رہتی ہے۔ یہی چیز تھی جو آخر کار بنی اسرائیل کے بگاڑ کا موجب ہوئی۔[2]

(ہ) وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون (المائدہ۔ ۳۵)

"...اس کی راہ میں جدوجہد کرو، شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے۔"

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۷۹۔

[2] تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

اصل میں لفظ جاھدوا استعمال فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم محض "جدوجہد" سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجاہدہ کا لفظ مقابلہ کا مقتضی ہے اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہیں' جو تم کو خدا کی مرضی پر چلنے سے روکتی اور اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں' جو تم کو پوری طرح خدا کا بندہ بن کر نہیں رہنے دیتیں اور تمہیں اپنا یا کسی غیر اللہ کا بندہ بننے پر مجبور کرتی ہیں' ان کے خلاف اپنی تمام امکانی طاقتوں سے کشمکش اور جدوجہد کرو۔ اسی جدوجہد پر تمہاری فلاح و کامیابی کا اور خدا سے تمہارے تقرب کا دارومدار ہے۔

اس طرح یہ آیت بندہ مومن کو ہر محاذ پر چومکھی لڑائی لڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ایک طرف ابلیس لعین اور اس کا شیطانی لشکر ہے' دوسری طرف آدمی کا اپنا نفس اور اس کی سرکش خواہشات ہیں' تیسری طرف خدا سے پھرے ہوئے بہت سے انسان ہیں جن کے ساتھ آدمی ہر قسم کے معاشرتی' تمدنی اور معاشی تعلقات میں بندھا ہوا ہے' چوتھی طرف وہ غلط مذہبی' تمدنی اور سیاسی نظام ہیں جو خدا سے بغاوت پر قائم ہوئے ہیں' اور بندگی حق کے بجائے بندگی باطل پر انسان کو مجبور کرتے ہیں' ان سب کے حربے مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ آدمی کو خدا کے بجائے اپنا مطیع بنائیں بخلاف اس کے آدمی کی ترقی کا اور تقرب خداوندی کے مقام تک اس کے عروج کا انحصار بالکلیہ اس پر ہے کہ وہ سراسر خدا کا مطیع اور باطن سے لے کر ظاہر تک خالصتہ" اس کا بندہ بن جائے۔ لہذا اپنے مقصود تک اس کا پہنچنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام مانع و مزاحم قوتوں کے خلاف بیک وقت جنگ آزما ہو' ہر وقت' ہر حال میں ان سے کشمکش کرتا رہے اور ان ساری رکاوٹوں کو پامال کرتا ہوا خدا کی راہ میں بڑھتا چلا جائے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول صفحات ۴۶۶ - ۴۶۷۔

(۲)

اسلامی حکومت کا مزاج

اسلامی حکومت کا ایک مخصوص مزاج ہے۔ یہ حکومت ایک داعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ حکومت اپنے دائرہ اختیار میں دین کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور دنیا کی باقی تمام اقوام کے سامنے اسلام کے پیغام کو پیش کرتی ہے۔ اس حکومت کی حیثیت ایک مبلغ اور معلم کی ہے اور اس کا سارا کام محبت، اخوت، مشاورت، رحم اور ہمدردی کی بنیادوں پر انجام پاتا ہے اور یہی اس کا مخصوص مزاج ہے۔

(الف) ولوشاء اللّٰہ ماأشرکوا ط وماجعلناک علیہم حفیظا ج ط وما انت علیہم بوکیل ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللّٰہ فیسبوا اللّٰہ عدوا بغیر علم ط (الانعام: ۱۰۷۔ ۱۰۸)

"اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔"

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی مبلغ بنایا گیا ہے، کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کرو اور اظہار حق کا حق ادا

کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری و جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقہ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمت الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا۔ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے اس کے اجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس طرف دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو جس انجام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مصر ہیں اس کی طرف جانے کے لیے انہیں چھوڑ دو۔

یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو دی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک کی نوبت پہنچ جائے' کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب

لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔[1]

(ب) فبما رحمة من الله لنت لهم ج ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم في الامر فاذا عزمت فتوكل على الله ط ان الله يحب المتوكلين ○ (آل عمران: ۱۵۹)

(اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کردو' ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو' البتہ جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔

(ج) ولاتجادلوا اهل الكتاب الا بالتي هي احسن ق الا الذين ظلموا منهم (العنکبوت: ۴۶)

"اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے ----- سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں۔"

یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ' مہذب و شائستہ زبان میں' اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہئے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہئے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہ راست پر لائے اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہئے جس کا مقصد اپنے مدمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہئے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول صفحات ۵۷۰ - ۵۷۱۔

ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر موقع کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے مگر یہ اہل کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تبلیغ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے مثلاً":-

"دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصائح کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔"
(النحل۔ ۱۲۵)

"بھلائی اور برائی یکساں نہیں ہیں (مخالفین کے حملوں کی) مدافعت ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی' وہ ایسا ہو گیا جیسے گرم جوش دوست ہے۔" (حم سجدہ۔ ۳۴)

"تم بدی کو اچھے ہی طریقہ سے دفع کرو ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمہارے خلاف) بناتے ہیں۔" (المومنون۔ ۹۶)

"درگزر کی روش اختیار کرو' بھلائی کی تلقین کرو اور جاہلوں کے منہ نہ لگو اور اگر (ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے) شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔" (الاعراف۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰)

یعنی جو لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف رویہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اور ہر طرح کے لوگوں کے مقابلے میں نرم و شیریں ہی نہ بنے رہنا چاہیے کہ دنیا داعی حق کی شرافت کو کمزوری اور مسکنت سمجھ بیٹھے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو شائستگی' شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی و مسکینی نہیں سکھاتا کہ

وہ ہر ظالم کے لیے نرم چارہ بن کر رہیں۔ [1]

(د) ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا۔

(القصص۔ ۴)

"واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔"

یعنی اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر کے حقوق دیئے جائیں' بلکہ اس نے تمدن و سیاست کا یہ طرز اختیار کیا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے' کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمراں گروہ ٹھیرایا جائے اور کسی کو محکوم بنا کر دبایا اور پیسا اور لوٹا جائے۔

یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذمی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حقوق و اختیارات ہر حیثیت سے یکساں نہیں رکھتی یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ اس فرق و امتیاز کی بنیاد فرعونی تفریق کے برعکس نسل' رنگ' زبان' یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے بلکہ اصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق میں ہے۔ اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اصولی حکومت میں حکمراں جماعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اصولوں کا منکر ہو جائے۔ آخر اس تفریق میں اور اس فرعونی طرز تفریق میں کیا وجہ مشابہت ہے جس کی بنا پر محکوم گروہ کا کوئی فرد کبھی حکمران گروہ

---

[1] تفہیم القرآن جلد سوئم صفحات ۷۰۸۔ ۷۰۹۔

میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس میں محکوم گروہ کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکنار بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے' حتیٰ کہ زندہ رہنے کا حق بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ جس میں محکوموں کے لیے کسی حق کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی' تمام فوائد و منافع اور حسنات و درجات صرف حکمراں قوم کے لیے مختص ہوتے ہیں' اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمراں قوم میں پیدا ہو جائے۔"[1]

(۵) یایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا کثیرا و نساء۔

(النساء:۱)

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔"

چونکہ آگے چل کر انسانوں کے باہمی حقوق بیان کرنے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ خاندانی نظام کی بہتری و استواری کے لیے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں' اس لئے تمہید اس طرح اٹھائی گئی کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تاکید کی اور دوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی کہ تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔

"تم کو ایک جان سے پیدا کیا" ۔۔۔۔۔ یعنی نوع انسانی کی تخلیق ابتدا" ایک فرد سے کی دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا جس سے دنیا میں نسل انسانی پھیلی۔

"اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا" ۔۔۔۔۔ اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم

---

[1] تفہیم القرآن۔ جلد سوم۔ صفحات ۶۱۳ ۔ ۶۱۴

میں نہیں ہے عام طور پر جو بات اہل تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائیبل میں بھی بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے لہذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔[1]

(و) لا اکراہ فی الدین۔ (البقرہ: ۲۵۶)

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔"

یہاں دین سے مراد اللہ کے متعلق وہ عقیدہ ہے جو اوپر آیت الکرسی میں بیان ہوا ہے اور وہ پورا نظام زندگی ہے جو اس عقیدے پر بنتا ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اسلام" کا یہ اعتقادی اور اخلاقی و عملی نظام کسی پر زبردستی نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ یہ ایسی چیز ہی نہیں ہے' جو کسی کے سر جبرا" منڈی جا سکے۔[2]

اوپر کی آیات اور ان کی تشریح سے اسلامی حکومت کے مخصوص مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد ریاست ہے جو قوت قاہرہ کو بھی ہمدردی' رحم اور مودت کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ جبر جس کا مزاج نہیں۔ تشدد جس کے نظام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہی وہ ریاست ہے جو انسانیت کیلئے رحمت بنتی ہے۔ شورائیت بھی اس کے اس مخصوص مزاج ہی کا ایک تقاضا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول ص صفحات ۳۱۹ ۔ ۳۲۰۔

[2] تفہیم القرآن جلد اول ۔ صفحہ ۱۹۶۔

(۳)

شورائیت

ارشاد ربانی ہے :۔

وامرھم شوریٰ بینھم۔ (الشوریٰ۔ ۳۸)

"اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔"

اس چیز کو یہاں اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے اور سورہ آل عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بنا پر مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اس کے وجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اس میں ان سب کی رائے لی جائے۔ اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتمد علیہ نمائندوں کو شریک مشورہ کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں۔ اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے اور نہ وہ متکبر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقل کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جراتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو' ان سب کو' یا ان کے اپنے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریک مشورہ کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے' اور اگر نادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمہ داری نہ آ پڑے۔

یہ تین وجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے' مشورہ اس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بداخلاقی ہے' جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انہیں بھی

شریک مشورہ کیا جائے' خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبہ کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے' ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریک مشورہ ہونا ممکن نہ ہو تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کو چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحب رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابل اعتماد سمجھتی ہو اور وہ اسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایمان دار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا' نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم پر مسلط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے' اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے نہیں بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے ملوث ہو اور اس خواہش کے ساتھ امرھم شوریٰ بینھم کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا اور خلق دونوں کو دھوکہ دینے میں کوئی باک نہ ہو حالانکہ نہ خدا دھوکہ کھا سکتا ہے اور نہ ہی خلق اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علانیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

امرھم شوریٰ بینھم کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفادات سے تعلق رکھتے ہیں انھیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اس بات سے پوری طرح

باخبر رکھے جائیں کہ ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور انہیں امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں' احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اوران کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بے ایمانی ہے جسے کوئی شخص بھی امرھم شوریٰ بینھم کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبراور تخویف سے حاصل کی ہوئی' یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی' یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے' بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیئے جاسکتے جو دباؤ ڈال کر' یا مال سے خرید کر' یا جھوٹ یا مکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں اور اس طرح کے اظہار رائے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو' جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی نہ کہ امرھم شوریٰ بینھم کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے یا جسے

ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو' اسے تسلیم کیا جائے کیوں کہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اصول شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہے بلکہ لازماً" اس دین کی حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے۔ اور اس اصل الاصول کی پابند ہے کہ "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔" اور تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔" اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس پر عمل درآمد کس طریقے سے کیا جائے تاکہ اس کا منشا ٹھیک طور سے پورا ہو' لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلے کریں۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد چہارم۔ سورۃ الشوریٰ ترجمان القرآن جلد ۳۔ عدد ۱ صفحہ ۲۹ تا ۳۳۔

(۴)

عدل و احسان

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتای ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی۔ (النحل۔ ۹۰)

اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔"

اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔

پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افراد معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے مثلاً" حقوق شہریت میں مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلاف عدل ہے مثلاً" والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی مساوات' اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمات

ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی' معاشرتی' معاشی' قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔

دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ' فیاضانہ معاملہ' ہمدردانہ رویہ' رواداری' خوش خلقی' درگزر' باہمی مراعات' ایک دوسرے کا پاس و لحاظ' دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا' یہ انصاف سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے' عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا حق کیا ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہو گی' مگر محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشو نما دینے والی قدریں ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے صلہ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو' اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے' بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم

کرے۔ شریعت الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے' پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے خوش حال افراد پر پہلا حق ان کے اپنے غریب رشتہ داروں کا ہے پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس امر کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حق دار اس کے والدین' اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں' پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں' اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں' اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں۔ اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔۔۔۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (Unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوشحالی' معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت' اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی۔ اوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشاء ہے جس کا اطلاق تمام بے ہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے

ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو' فحش ہے۔ مثلاً" بخل' زنا' برہنگی وعریانی' عمل قوم لوط' محرمات سے نکاح کرنا' چوری' شراب نوشی' بھیک مانگنا' گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے' مثلاً" جھوٹا پروپیگنڈا' تہمت تراشی' پوشیدہ جرائم کی تشہیر' بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے و ڈرامے' اور فلم؛ عریاں تصاویر؛ عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا' علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور نازو ادا کی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں' اور تمام شرائع الہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا' خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوئم۔ صفحات ۵۶۴-۵۶۷۔

(۵)

قیادت اور اہل منصب کے انتخاب کے اصول

اسلامی حکومت میں قیادت کے انتخاب کا اصول بھی دوسری حکومتوں سے بہت مختلف ہے۔ یہاں اصل چیز اہلیت ' امانت ' دیانت ' تقویٰ ' اور حسن سلوک ہے۔

(الف) ان اللّٰہ یامرکم ان تودوا الامنت الی اھلھا لا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ط ان اللّٰہ نعما یعظکم بہ ط ان اللّٰہ کان سمیعاً بصیرا ○ (النساء : ۵۸)

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

یعنی تم ان برائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں ' یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے رتبے (Positions of Trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیئے جو نااہل ' کم ظرف ' بداخلاق ' بددیانت ' اور بدکار تھے ' نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں۔ یعنی جن میں بار امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ

انصاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تکلف ایمان نگل جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔ انصاف کے گلے پر چھری پھیرنے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجربہ اس زمانہ میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے محمد ﷺ اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بتوں کو پوج رہے تھے۔ بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے' سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبہ کے گرد مادر زاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام نہاد اہل کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلہ میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی' بہرحال بات جب کہو' انصاف کی کہو' اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔[1]

(ب) ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون○ (الشعراء: ۱۵۱ - ۱۵۲)

"ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔"

یعنی اپنے ان امراء و رؤسا اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظام زندگی چل رہا ہے' یہ مسرف لوگ ہیں' اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شتر بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور

---

[1] - تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحات ۳۶۲ - ۳۶۳۔

مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو' کسی ذاتی فائدے کے لیے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اٹھا ہوں ---------- یہ تھا وہ مختصر منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا' اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی' تمدنی و اخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔[1]

(ج) ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هونه وكان امره فرطا۔ (الکھف: ۲۸)

"کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔"

یعنی اس کی بات نہ مانو' اس کے آگے نہ جھکو' اس کا منشاء پورا نہ کرو' اور اس کے کہے پر نہ چلو۔ یہاں اطاعت کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

کان امرہ فرطا کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ "جو حق کو پیچھے چھوڑ کر اور اخلاقی حدود کو توڑ کر بگٹٹ چلنے والا ہے۔" دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے جو شخص خدا کو بھول کر اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے اس کے ہر کام میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حدود نا آشنا ہو کر رہ جاتا ہے ایسے آدمی کی اطاعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت کرنے والا خود بھی حدود نا آشنا ہو جائے اور جس جس وادی میں مطاع بھٹکے اسی میں مطیع بھی بھٹکتا چلا جائے۔[2]

---

[1] تفہیم القرآن جلد سوئم۔ صفحہ ۵۲۴۔

[2] تفہیم القرآن جلد سوئم۔ صفحہ ۲۳۔

(٦)

دفاع اور اصول جنگ و صلح

اسلامی حکومت کی پالیسی کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ وہ ہر اعتبار سے مضبوط ہو۔ عسکری اعتبار سے بھی اور معاشی اعتبار سے بھی۔ جو عظیم ذمہ داری اسے ادا کرنی ہے وہ دفاعی قوت کی تیاری کے بغیر ادا نہیں ہو سکتی۔

(الف) واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدواللہ وعدوکم واخرین من دونہم لاتعلمونہم ج اللہ یعلمہم ط

(الانفال : ٦٠)

"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو۔ تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کردو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔"

اس سے مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامان جنگ اور ایک مستقل فوج (Standing Army) ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کاروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار اور اسلحہ اور سامان رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثناء میں کہ یہ تیاری مکمل ہو، دشمن اپنا کام کر جائے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوئم۔ صفحہ ۱۵۵-۱۵۶۔

(ب) انما جزؤا الذین یحاربون اللّٰہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیہم وارجلہم من خلاف او ینفوا من الارض ذالک لہم خزی فی الدنیا ولہم فی الاخرۃ عذاب عظیم ○

(المائدہ : ۳۳)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔"

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی لیے اس نے اپنا رسولؐ بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اس چیز کو جو زمین پر ہے امن بخشے' جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمال مطلوب کو پہنچ سکے' جس کے تحت زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا' قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے ہو' دراصل خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے "بادشاہ کے خلاف لڑائی" (Waging War Against The King) کا

مجرم قرار دیا گیا' چاہے اس کی کاروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دست رس سے کتنا ہی دور ہو۔

اس آیت میں مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔[1]

(ج) قاتلوا الذین لا یومنون باللّٰہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ماحرم اللّٰہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید و ھم صغرون۔

(التوبہ: ۲۹)

"جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے' اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

یہاں ان لوگوں سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے جو اس شریعت کو اپنا قانون زندگی نہیں بناتے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے سے نازل کی ہے۔

لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری اور بالادستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحہ ۴۶۵۔

فرماں روائی اور امامت کے اختیارات متبعین دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت، تابع و مطیع بن کر رہیں۔

جزیہ بدل ہے اس امان اور اس حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابع امر بننے پر راضی ہیں "ہاتھ سے جزیہ دینے" کا مفہوم سیدھی طرح مطیعانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں، بلکہ وہ اہل ایمان بڑے ہوں جو خلافت الٰہی کا فرض انجام دے رہے ہوں۔

ابتداء" یہ حکم یہود و نصاریٰ کے متعلق دیا گیا تھا لیکن آگے چل کر خود نبی ﷺ نے مجوس سے جزیہ لے کر انہیں ذمی بنایا۔ اس کے بعد صحابہ کرام نے بالاتفاق بیرون عرب کی تمام قوموں پر اس حکم کو عام کر دیا۔

یہ جزیہ وہ چیز ہے جس کے لیے بڑی بڑی معذرتیں انیسویں صدی عیسوی کے دور ذلت میں مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور اس دور کی یادگار کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جو صفائی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا کا دین اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ اسے خدا کے باغیوں کے سامنے معذرت پیش کرنے کی کوئی حاجت ہو۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یا دوسروں کی نکالی ہوئی غلط راہ پر چلتے ہیں وہ حد سے حد بس اتنی ہی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود جو غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں، لیکن انہیں اس کا قطعاً" کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرماں روائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہو گی، فساد رونما ہو گا اور اہل ایمان کا فرض ہو گا کہ ان کو اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ جزیہ آخر کس چیز کی قیمت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس آزادی کی قیمت ہے جو انہیں اسلامی اقتدار کے تحت اپنی گمراہیوں پر قائم رہنے کے لیے دینی پڑتی ہے اور اس قیمت کو

اس صالح نظام حکومت کے نظم و نسق پر صرف ہونا چاہیے جو انھیں اس آزادی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جزیہ ادا کرتے وقت ہر سال ذمیوں میں یہ احساس تازہ ہوتا رہے گا کہ خدا کی راہ میں زکوٰۃ دینے کے شرف سے محرومی اور اس کے بجائے گمراہیوں پر قائم رہنے کی قیمت ادا کرنا کتنی بڑی بدقسمتی ہے جس میں وہ مبتلا ہیں۔[1]

(د) الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیہم ج فاعلموا ان اللہ غفور رحیم۔ (المائدہ: ۳۴)

مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ ۔۔۔۔۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

یعنی اگر وہ سعی فساد سے باز آ گئے ہوں اور صالح نظام کو درہم برہم کرنے یا الٹنے کی کوشش چھوڑ چکے ہوں اور ان کا بعد کا طرز عمل ثابت کر رہا ہو کہ وہ امن پسند مطیع قانون اور نیک چلن انسان بن چکے ہیں اور اس کے بعد ان کے سابق جرائم کا پتہ چلے تو ان سزاؤں میں سے کوئی سزا ان کو نہ دی جائے گی جو اوپر بیان ہوئی ہیں البتہ آدمیوں کے حقوق پر کوئی دست درازی اگر انہوں نے کی تھی تو اس کی ذمہ داری ان پر سے ساقط نہ ہوگی مثلاً" اگر کسی انسان کو انہوں نے قتل کیا تھا یا کسی کا مال لیا تھا یا کوئی اور جرم انسانی جان و مال کے خلاف کیا تھا تو اسی جرم کے بارے میں فوج داری مقدمہ ان پر قائم کیا جائے گا لیکن بغاوت اور غداری اور خدا اور رسولؐ کے خلاف محاربہ کا کوئی مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔[2]

۱۔ تفہیم القرآن جلد دوئم۔ صفحہ ۱۸۸۔

۲۔ تفہیم القرآن جلد اول۔ صفحہ ۴۶۶۔

(۷)

معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی پالیسی کے عمومی اصول

(الف) وقضٰی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا ط اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلٰھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھم وقل لھما قولا کریما ○ واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیٰنی صغیرا ○ ربکم اعلم بما فی نفوسکم ط ان تکونوا صٰلحین فانہ کان للاوابین غفورا ○ وات ذالقربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیٰطین ط وکان الشیطٰن لربہ کفورا ○ واما تعرضن عنھم ابتغاء رحمۃ من ربک ترجوھا فقل لھم قولا میسورا ○ ولا تجعل یدک مغلولۃ الیٰ عنقک ولاتبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا ○ ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر ط انہ کان بعبادہ خبیرا م بصیرا ○ ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق ط نحن نرزقھم وایاکم ط ان قتلھم کان خطا کبیرا ○ ولا تقربوا الزنٰی انہ کان فاحشۃ ط وساء سبیلا ○ ولاتقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ط ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطٰنا فلا یسرف فی القتل ط انہ کان منصورا ○ ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتٰی یبلغ اشدہ واوفوا بالعھد ج ان العھد کان مسؤلا ○ واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم ط ذالک خیر واحسن تاویلا

○ ولا تقف مالیس لک بہ علم ط ان السمع البصر والفؤا کل اولئک کان عنہ مسؤلا ○ ولا تمش فی الارض مرحا ج انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا ○ کل ذالک کان سیئہ عند ربک مکروھا ○ ذالک مما اوحیٰ الیک ربک من الحکمۃ ط

(بنی اسرائیل: ۲۳۔۳۹)

"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ: (۱) تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو' مگر صرف اس کی۔ (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک' یا دونوں' بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو' نہ انہیں جھڑک کر جواب دو' بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو' اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو' اور دعا کرو کہ "پروردگار' ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔" تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔ (۳) رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق (۴) فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ (۵) اگر ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں' مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو' اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو' تو انہیں نرم جواب دے دو (۶) نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے

اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ (۷) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔ (۸) زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔ (۹) قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔ پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے' اس کی مدد کی جائے گی (۱۰) مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے' یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ (۱۱) عہد کی پابندی کرو' بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہو گی۔ (۱۲) پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو' اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے (۱۳) کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً" آنکھ' کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔ (۱۴) زمین میں اکڑ کر نہ چلو' تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ ان احکام میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔"

یہاں وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کیے جا رہے ہیں جن پر اسلام پوری انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا منشور ہے جسے مکی دور کے خاتمے اور آنے والے' مدنی دور کے نقطۂ آغاز پر پیش کیا گیا' تاکہ دنیا بھر کو معلوم ہو جائے کہ اس نئے اسلامی معاشرے اور ریاست کی بنیاد کن فکری' اخلاقی' تمدنی' معاشی اور قانونی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اس موقع پر سورہ انعام رکوع ۱۹ اور اس کے حواشی پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہو گا۔

۱۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش اور پوجا نہ کرو' بلکہ یہ بھی ہے کہ بندگی اور غلامی اور بے چون و چرا اطاعت بھی صرف اسی کی کرو' اس کے حکم کو حکم اور اسی کے قانون کو قانون مانو اور اس کے سوا کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔ یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ' اور صرف انفرادی طرز عمل کے لیے ایک ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ اس پورے نظام اخلاق و تمدن و سیاست کا سنگ بنیاد بھی ہے جو مدینہ طیبہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قائم کیا۔ اس کی عمارت اسی نظریے پر اٹھائی گئی تھی کہ اللہ جل شانہ' ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے اور اسی کی شریعت ملک کا قانون ہے۔

۲۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطیع' خدمت گزار اور ادب شناس ہونا چاہئے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیے جو اولاد کو والدین سے بے نیاز بنانے والا نہ ہو' بلکہ ان کا احسان مند اور ان کے احترام کا پابند بنائے' اور بڑھاپے میں اسی طرح ان کی خدمت کرنا سکھائے جس طرح بچپن میں وہ اس کی پرورش اور نازبرداری کر چکے ہیں۔ یہ آیت بھی صرف ایک اخلاقی سفارش نہیں ہے بلکہ اسی کی بنیاد پر بعد میں والدین کے وہ شرعی حقوق و اختیارات مقرر کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آداب تہذیب میں والدین کے ادب اور اطاعت اور ان کے حقوق کی نگہداشت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ان چیزوں نے ہمیشہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام اور تعلیمی پالیسی کے ذریعہ سے خاندان کے ادارے کو مضبوط اور محفوظ کرنے کی کوشش کرے گی' نہ کہ اسے کمزور بنانے کی۔

۳۔۵۔ ان تین دفعات کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور اپنی دولت کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص نہ رکھے' بلکہ اپنی ضروریات اعتدال کے ساتھ پوری

کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں' اپنے ہمسایوں اور دوسرے حاجت مند لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے۔ اجتماعی زندگی میں تعاون' ہمدردی اور حق شناسی و حق رسانی کی روح جاری و ساری ہو۔ ہر رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا معاون' اور ہر مستطیع انسان اپنے پاس کے محتاج انسان کا مددگار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے' اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص ان سب انسانوں کے حقوق اپنی ذات پر اور اپنے مال پر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہو' ان کی خدمت کرے تو یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ ان کا حق ادا کر رہا ہے' نہ یہ کہ احسان کا بوجھ ان پر لاد رہا ہے۔ اگر کسی کی خدمت سے معذور ہو تو اس سے معافی مانگے اور خدا سے فضل طلب کرے تاکہ وہ بندگان خدا کی خدمت کرنے کے قابل ہو۔

منشور اسلامی کی یہ دفعات بھی صرف انفرادی اخلاق کی تعلیم ہی نہ تھیں' بلکہ آگے چل کر مدینہ طیبہ کے معاشرے اور ریاست میں انہی کی بنیاد پر صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کے احکام دیئے گئے' وصیت اور وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے' یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا' ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کی جائے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی نظام عملاً ایسا بنایا گیا کہ پورے اجتماعی ماحول میں فیاضی' ہمدردی اور تعاون کی روح جاری و ساری ہو گئی' حتیٰ کہ لوگ آپ ہی آپ قانونی حقوق کے ماسوا ان اخلاقی حقوق کو بھی سمجھنے اور ادا کرنے لگے جنہیں نہ قانون کے زور سے مانگا جا سکتا ہے' نہ دلوایا جا سکتا ہے۔

۶۔ ہاتھ باندھنا استعارہ ہے بخل کے لیے' اور اسے کھلا چھوڑ دینے سے مراد ہے فضول خرچی۔ دفعہ ۴ کے ساتھ دفعہ ۶ کے اس فقرے کو ملا کر پڑھنے سے منشا صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ وہ نہ بخیل بن کر دولت کی گردش کو روکیں اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت کو ضائع

کریں۔ اس کے برعکس ان کے اندر توازن کی ایسی صحیح حس موجود ہونی چاہیے کہ وہ بجا خرچ سے باز بھی نہ رہیں اور بے جا خرچ کی خرابیوں میں مبتلا بھی نہ ہوں۔ فخر اور ریا اور نمائش کے خرچ' عیاشی اور فسق و فجور کے خرچ' اور تمام ایسے خرچ جو انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف ہونے کے بجائے دولت کو غلط راستوں میں بہا دیں' دراصل خدا کی نعمت کا کفران ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنی دولت کو خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

یہ دفعات بھی محض اخلاقی تعلیم اور انفرادی ہدایات تک محدود نہیں ہیں بلکہ صاف اشارہ اس بات کی طرف کر رہی ہیں کہ ایک صالح معاشرے کو اخلاقی تربیت' اجتماعی دباؤ اور قانونی پابندیوں کے ذریعے سے بے جا صرف مال کی روک تھام کرنی چاہیے۔ چنانچہ آگے چل کر مدینہ طیبہ کی ریاست میں ان دونوں دفعات کے منشا کی صحیح ترجمانی مختلف عملی طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو ازروئے قانون حرام کیا گیا۔ دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بے جا صرف مال کی روک تھام کی گئی۔ تیسری طرف معاشرتی اصلاح کے ذریعہ سے ان بہت سی رسموں کا خاتمہ کیا گیا۔ جن میں فضول خرچیاں کی جاتی تھیں۔ پھر حکومت کو یہ اختیارات دیئے گئے کہ اسراف کی نمایاں صورتوں کو اپنے انتظامی احکام کے ذریعہ سے روک دے۔ اسی طرح زکوۃ و صدقات کے احکام سے بخل کا زور بھی توڑا گیا اور اس امر کے امکانات باقی نہ رہنے دیے گئے کہ لوگ زراندوزی کر کے دولت کی گردش کو روک دیں۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک ایسی رائے عام پیدا کی گئی جو فیاضی اور فضول خرچی کا فرق ٹھیک ٹھیک جانتی تھی اور بخل اور اعتدال میں خوب تمیز کرتی تھی۔ اس رائے عامہ نے بخیلوں کو ذلیل کیا۔ اعتدال پسندوں کو معزز بنایا' فضول خرچوں کو ملامت کی اور فیاض لوگوں کو پوری سوسائٹی کا گل سرسبد قرار دیا۔ اس وقت کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا یہ اثر آج تک مسلم معاشرے میں موجود ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہیں کنجوسوں اور

زراندوزوں کو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں' اور سخی انسان آج بھی ان کی نگاہ میں معزز و محترم ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بات بھی سمجھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی بخشش میں کم و بیش کا جو فرق رکھا ہے انسان اس کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتا' لہٰذا تقسیم رزق کے فطری نظام میں انسان کو اپنی مصنوعی تدبیروں سے دخل انداز نہ ہونا چاہیے۔ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا' یا اس نامساوات کو فطرت کی حدود سے بڑھا کر بے انصافی کی حد تک پہنچا دینا' دونوں ہی یکساں غلط ہیں۔ ایک صحیح معاشی نظام وہی ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے طریق تقسیم رزق سے قریب تر ہو۔

اس فقرے میں قانون فطرت کے جس قاعدے کی طرف رہنمائی کی گئی تھی اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخیل سرے سے کوئی راہ نہ پا سکا کہ رزق اور وسائل رزق میں تفاوت اور تفاضل بجائے خود کوئی برائی ہے جسے مٹانا اور ایک بے طبقات سوسائٹی پیدا کرنا کسی درجے میں بھی مطلوب ہو۔ اس کے برعکس مدینہ طیبہ میں انسانی تمدن کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جو راہ عمل اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ فطرۃ اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت پر برقرار رکھا جائے اور اوپر کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق سوسائٹی کے اخلاق و اطوار اور قوانین عمل کی اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ معاش کا فرق و تفاوت کسی ظلم و بے انصافی کا موجب بننے کے بجائے ان بے شمار اخلاقی' روحانی اور تمدنی فوائد و برکات کا ذریعہ بن جائے جن کی خاطر ہی دراصل خالق کائنات نے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت رکھا ہے۔

۷۔ فقرہ نمبر ۷ ان معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتا ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبط ولادت کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے میں قتل اطفال اور اسقاط حمل کا محرک ہوا کرتا تھا' اور آج وہ

ایک تیسری تدبیر یعنی منع حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن منشور اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر ان تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی رو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائش نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے' بلکہ اس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے' بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے' اتنے ہی بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نزول قرآن کے دور سے لے کر آج تک کسی دور میں بھی مسلمانوں کے اندر نسل کشی کا کوئی عام میلان پیدا نہیں ہونے پایا۔

۸۔ "زنا کے قریب نہ پھٹکو۔" اس حکم کے مخاطب افراد بھی ہیں' اور معاشرہ بحیثیت مجموعی بھی۔ افراد کے لیے اس حکم کے معنی یہ ہیں کہ وہ محض فعل زنا ہی سے بچنے پر اکتفا نہ کریں' بلکہ زنا کے مقدمات اور اس کے ان ابتدائی محرکات سے بھی دور رہیں جو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔ رہا معاشرہ' تو اس حکم کی رو سے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں زنا اور محرکات زنا' اور اسباب زنا کا سدباب کرے اور اس غرض کے لیے قانون سے' تعلیم و تربیت سے' اجتماعی ماحول کی اصلاح سے' معاشرتی زندگی کی مناسب تشکیل سے اور دوسری تمام موثر تدابیر سے کام لے۔

یہ دفعہ آخر کار اسلامی نظام زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی۔ اس کے منشا کے مطابق زنا اور تہمت زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا' پردے کے احکام جاری کیے گئے' فواحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا' شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر (جو زنا کے قریب ترین رشتہ دار ہیں) بندشیں لگائی گئیں' اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنایا گیا جس سے نکاح آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کی جڑ کٹ گئی۔

۹۔ قتل نفس سے مراد صرف دوسرے انسان کا قتل ہی نہیں' بلکہ خود اپنے آپ کو قتل کرنا بھی ہے۔ اسی لیے کہ نفس' جس کو اللہ نے ذی حرمت ٹھیرایا ہے' اس کی تعریف میں دوسرے نفوس کی طرح انسان کا اپنا نفس بھی داخل ہے۔ لہٰذا جتنا بڑا جرم اور گناہ قتل انسان ہے' اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی بھی ہے۔ آدمی کی بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی جان کا مالک' اور اپنی اس ملکیت کو باختیار خود تلف کر دینے کا مجاز سمجھتا ہے' حالانکہ یہ جان اللہ کی ملکیت ہے' اور ہم اس کے اتلاف تو درکنار' اس کے کسی بے جا استعمال کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ تعالیٰ جس طرح بھی ہمارا امتحان لے' اسی طرح ہمیں آخر وقت تک امتحان دیتے رہنا چاہیے' خواہ حالات امتحان اچھے ہوں یا برے۔ اللہ کے دیے ہوئے وقت کو قصداً ختم کر کے امتحان گاہ سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے' کجا کہ یہ فرار بھی ایک ایسے جرم عظیم کے ذریعہ سے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام قرار دیا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی دنیا کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور ذلتوں اور رسوائیوں سے بچ کر عظیم تر اور ابدی تکلیف و رسوائی کی طرف بھاگتا ہے۔

اسلامی قانون نے قتل بالحق کو صرف پانچ صورتوں میں محدود کر دیا ہے: ایک قتل عمد کے مجرم سے قصاص۔ دوسرے دین حق کے راستے میں مزاحمت کرنے والے سے جنگ۔ تیسرے اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا۔

چوتھے شادی شدہ مرد یا عورت کو ارتکاب زنا کی سزا۔ پانچویں ارتداد کی سزا۔ صرف یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں انسانی جان کی حرمت مرتفع ہو جاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

"اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔" اس سے اسلامی قانون کا یہ اصول نکلتا ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مدعی حکومت نہیں۔ بلکہ اولیائے مقتول ہیں' اور وہ قاتل کو معاف کرنے اور قصاص کے بجائے خون بہا لینے پر راضی ہو سکتے ہیں۔

قتل میں حد سے گزرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ سب ممنوع ہیں۔ مثلاً" جوش انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا' یا مجرم کو عذاب دے دے کے مارنا' یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالنا' یا خون بہا لینے کے بعد پھر اسے قتل کرنا وغیرہ۔

چونکہ اس وقت تک اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی اس لیے اس بات کو نہیں کھولا گیا کہ اس کی مدد کون کرے گا۔ بعد میں جب اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو یہ طے کر دیا گیا کہ اس کی مدد کرنا اور اس کے قبیلے یا اس کے حلیفوں کا کام نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اس کے نظام عدالت کا کام ہے۔ کوئی شخص یا گروہ بطور خود قتل کا انتقام لینے کا مجاز نہیں ہے بلکہ یہ منصب اسلامی حکومت کا ہے کہ حصول انصاف کے لیے اس سے مدد مانگی جائے۔

۱۰۔ یہ بھی محض ایک اخلاقی ہدایت نہ تھی بلکہ آگے چل کر جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے انتظامی اور قانونی' دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں جن کی تفصیل ہم کو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ اسلامی ریاست اپنے ان تمام شہریوں کے مفاد کی محافظ ہے جو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انا ولی من لا ولی لہ (میں ہر اس شخص کا سرپرست ہوں جس

کا کوئی سرپرست نہ ہو) اسی طرف اشارہ کرتا ہے' اور یہ اسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔

۱۱۔ یہ بھی صرف انفرادی اخلاقیات ہی کی ایک دفعہ نہ تھی بلکہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اسی کو پوری قوم کی داخلی و خارجی سیاست کا سنگ بنیاد ٹھیرایا گیا۔

۱۲۔ یہ ہدایت بھی صرف افراد کے باہمی معاملات تک محدود نہ رہی' بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ بات حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی کہ وہ منڈیوں اور بازاروں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کر دے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیوں کا سدباب کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

۱۳۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کے بجائے "علم" کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشا کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں' قانون میں' سیاست اور انتظام ملکی میں' علوم و فنون اور نظام تعلیم میں' غرض ہر شعبہ حیات میں کی گئی اور ان بے شمار خرابیوں سے فکر و عمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرنے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول طے کر دیا گیا کہ محض شبہے پر کسی کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے۔ تفتیش جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں یہ پالیسی متعین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے اور نہ مجرد شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظام تعلیم میں بھی ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن و تخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی

ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقاید میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی اور ایمان لانے والوں کو یہ سکھایا گیا کہ صرف اس چیز کو مانیں جو خدا اور رسولؐ کے دیے ہوئے علم کی رو سے ثابت ہو۔

۱۳۔ اس فقرے میں ہدایت کی گئی کہ جباروں اور متکبروں کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت بھی انفرادی طرز عمل اور قومی رویے' دونوں پر یکساں حاوی ہے۔ اور یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ مدینہ طیبہ میں جو حکومت اس منشور پر قائم ہوئی اس کے فرماں رواؤں' گورنروں اور سپہ سالاروں کی زندگی میں جباری اور کبریائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ حتیٰ کہ عین حالت جنگ میں بھی کبھی ان کی زبان سے فخرو غرور کی کوئی بات نہ نکلی۔ ان کی نشست و برخاست' چال ڈھال' لباس' مکان' سواری اور عام برتاؤ میں انکسار و تواضع' بلکہ فقیری و درویشی کی شان پائی جاتی تھی' اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے اس وقت بھی اکڑ اور تبختر سے کبھی اپنا رعب بٹھانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

آخر میں ارشاد ہوا کہ ہر حکم میں جو چیز ممنوع ہے اس کا ارتکاب اللہ کو ناپسند ہے یا دوسرے الفاظ میں' جس حکم کی بھی نافرمانی کی جائے وہ ناپسندیدہ ہے۔[1]

(ب) ریاست کی تعلیمی پالیسی کے متعلق یہ ہدایت بھی قرآن دیتا ہے کہ:۔

وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ ط فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ (التوبہ: ۱۲۲)

"اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے' مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر

---

[1] تفہیم القرآن۔ ج ۲' ص ۶۰۸۔ ۶۱۷

اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔"

اس آیت کا منشا سمجھنے کے لیے رکوع ۱۲ کی وہ آیت پیش نظر رکھنی چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

"بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کی حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے۔"

وہاں صرف اتنی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا کہ دارالاسلام کی دیہاتی آبادی کا بیشتر حصہ مرض نفاق میں اس وجہ سے مبتلا ہے کہ یہ سارے کے سارے لوگ جہالت میں پڑے ہوئے ہیں، علم کے مرکز سے وابستہ نہ ہونے اور اہل علم کی صحبت میسر نہ آنے کی وجہ سے اللہ کے دین کی حدود ان کو معلوم نہیں ہیں۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ دیہاتی آبادیوں کو اس حالت میں پڑا نہ رہنے دیا جائے بلکہ ان کی جہالت کو دور کرنے اور ان کے اندر شعور اسلامی پیدا کرنے کا اب باقاعدہ انتظام ہونا چاہئے۔ اس غرض کے لیے یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ تمام دیہاتی عرب اپنے اپنے گھروں سے نکل نکل کر مدینے آ جائیں اور یہاں علم حاصل کریں۔ اس کے بجائے ہونا یہ چاہئے کہ ہر دیہاتی علاقے اور ہر بستی اور قبیلے سے چند آدمی نکل کر علم کے مرکزوں، مثلاً" مدینے اور مکے اور ایسے ہی دوسرے مقامات میں آئیں اور یہاں دین کی سمجھ پیدا کریں، پھر اپنی اپنی بستیوں میں واپس جائیں اور عامتہ الناس کے اندر بیداری پھیلانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو تحریک اسلامی کو مستحکم کرنے کے لیے ٹھیک موقع پر دی گئی۔ ابتدا میں جب کہ اسلام عرب میں بالکل نیا نیا تھا اور انتہائی شدید مخالفت کے ماحول میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، اس ہدایت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت اسلام قبول کرتا ہی وہ شخص تھا جو پوری طرح اسے سمجھ لیتا

تھا اور ہر پہلو سے اس کو جانچ پرکھ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ مگر جب یہ تحریک کامیابی کے مرحلوں میں داخل ہوئی اور زمین میں اس کا اقتدار قائم ہو گیا تو آبادیاں کی آبادیاں فوج در فوج اس میں شامل ہونے لگیں، جن کے اندر کم لوگ ایسے تھے جو اسلام کو اس کے تمام مقتضیات کے ساتھ سمجھ بوجھ کر اس پر ایمان لاتے تھے، ورنہ بیشتر لوگ محض وقت کے سیلاب میں غیر شعوری طور پر بہے چلے آ رہے تھے۔ نو مسلم آبادی کا یہ تیز رفتار پھیلاؤ بظاہر تو اسلام کے لیے سبب قوت تھا، کیوں کہ پیروان اسلام کی تعداد بڑھ رہی تھی، لیکن فی الحقیقت اسلامی نظام کے لیے ایسی آبادی کسی کام کی نہ تھی بلکہ الٹی نقصان دہ تھی جو شعور اسلامی سے خالی ہو اور اس نظام کے اخلاقی مطالبات پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ چنانچہ یہ نقصان غزوہ تبوک کی تیاری کے موقع پر کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس لیے عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کہ تحریک اسلامی کی یہ توسیع جس رفتار کے ساتھ ہو رہی ہے اسی کے مطابق اس کے استحکام کی تدبیر بھی ہونی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ ہر حصہ آبادی میں سے چند لوگوں کو لے کر تعلیم و تربیت دی جائے، پھر وہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر عوام کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلام کا شعور اور حدود اللہ کا علم پھیل جائے۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ تعلیم عمومی کے جس انتظام کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے اس کا اصل مقصد عامۃ الناس کو محض خواندہ بنانا اور ان میں کتاب خوانی کی نوعیت کا علم پھیلانا نہ تھا بلکہ واضح طور پر اس کا مقصد حقیقی یہ متعین کیا گیا تھا کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رویہ زندگی سے بچنے لگیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیا ہے اور ہر تعلیمی نظام کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام لوگوں میں نوشت و خواند اور کتاب خوانی اور دنیوی علوم کی واقفیت پھیلانا

نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام لوگوں میں ایسی تعلیم پھیلانا چاہتا ہے جو اوپر کے خط کشیدہ مقصد تک پہنچاتی ہو۔ ورنہ ایک ایک شخص اگر اپنے وقت کا آئن شتائن اور فرائڈ ہو جائے لیکن دین کے فہم سے عاری اور غیر مسلمانہ رویہ زندگی میں بھٹکا ہوا ہو تو اسلام ایسی تعلیم پر لعنت بھیجتا ہے۔

اس آیت میں لفظ لیتفقھوا فی الدین جو استعمال ہوا ہے اس سے بعد کے لوگوں میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کے زہریلے اثرات ایک مدت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم بلکہ ان کی مذہبی زندگی پر بھی بری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالے نے توتفقہ فی الدین کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا' اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا' اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کون سا طریق فکر اور کون سا طرز عمل روح دین کے مطابق ہے۔ لیکن آگے چل کر جو قانونی علم اصطلاحا" فقہ کے نام سے موسوم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (بمقابلہ روح) کا تفصیلی علم بن کر رہ گیا' لوگوں نے اشتراک لفظی کی بناء پر سمجھ لیا کہ یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکم الہٰی کے مطابق تعلیم کا منتہائے مقصود ہے۔ حالانکہ وہ کل مقصود نہیں بلکہ محض ایک جزو مقصود تھا۔ اس عظیم الشان غلط فہمی سے جو نقصانات دین اور پیروان دین کو پہنچے ان کا جائزہ لینے کے لئے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے' مگر یہاں ہم اس پر متنبہ کرنے کے لیے مختصرا" اتنا اشارہ کیے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو جس چیز نے روح دین سے خالی کر کے محض جسم دین اور شکل دین کی تشریح پر مرتکز کر دیا' اور بالآخر جس چیز کی بدولت مسلمانوں کی زندگی میں ایک نری بے جان ظاہرداری' دین داری کی آخری منزل بن کر رہ گئی' وہ بڑی حد تک یہی غلط فہمی ہے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۲۵۰ - ۲۵۲

(۸)

شہریت اور خارجہ پالیسی

(الف) ان الذین امنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین اووا نصروا اولئک بعضھم اولیاء بعض ط والذین آمنو ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شی حتیٰ یھاجروا ج وان استنصرو کم فی الدین فعلیکم النصر الا علیٰ قوم بینکم م وبینھم میثاق ط واللہ بما تعملون بصیر

(الانفال ـ ۷۲)

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی' وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔"

یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک اہم دفعہ ہے۔ اس میں یہ

اصول مقرر کیا گیا ہے کہ "ولایت" کا تعلق صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہو گا جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں' یا اگر باہر سے آئیں تو ہجرت کر کے آ جائیں۔ باقی رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حدود ارضی سے باہر ہوں' تو ان کے ساتھ مذہبی اخوت تو ضرور قائم رہے گی' لیکن "ولایت" کا تعلق نہ ہو گا۔ اور اسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلق ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کر کے نہ آئیں بلکہ دارالکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے دارالاسلام میں آئیں۔

"ولایت کا لفظ عربی زبان میں حمایت' نصرت مددگاری' پشتیبانی' دوستی' قرابت' سرپرستی' اور اس سے ملتے جلتے مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور اس آیت کے سیاق و سباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے' اور شہریوں کا اپنی ریاست سے' اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت "دستوری و سیاسی ولایت" کو ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے' اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے۔ اس عدم ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ اسی عدم ولایت کی بنا پر دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے' ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے' باہم شادہ بیاہ نہیں کر سکتے' اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دار لکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو۔ علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رو سے دولت اسلامیہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہوں۔ باہر کے مسلمانوں کے لیے کسی ذمہ داری کا بار اس کے سر نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ انا بری من کل

مسلم بین ظہرانی المشرکین۔ میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت و حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔" اس طرح اسلامی قانون نے اس جھگڑے کی جڑ کاٹ دی ہے جو بالعموم بین الاقوامی پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے۔ کیوں کہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض اقلیتوں کا ذمہ اپنے سر لے لیتی ہے تو اسکی وجہ سے ایسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لڑائیاں بھی نہیں سلجھا سکتیں۔

اوپر کے فقرے میں دارالاسلام سے باہر رہنے والے مسلمانوں کو "سیاسی ولایت" کے رشتہ سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ بعد کا فقرہ اس امر کی توضیح کرتا ہے کہ اس رشتہ سے خارج ہونے کے باوجود "دینی اخوت" کے رشتہ سے خارج نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ اسلامی برادری کے تعلق کی بناء پر دارالاسلام کی حکومت اور اس کے باشندوں سے مدد مانگیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مدد کریں۔ لیکن اس کے بعد مزید توضیح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان دینی بھائیوں کی مدد کا فریضہ اندھا دھند انجام نہیں دیا جائے گا بلکہ بین الاقوامی ذمہ داریوں اور اخلاقی حدود کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے ہی انجام دیا جا سکے گا۔ اگر ظلم کرنے والی قوم سے دارالاسلام کے معاہدانہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی ایسی مدد نہیں کی جا سکے گی جو ان تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔

آیت میں معاہدہ کے لیے "میثاق" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ "وثوق" ہے جو عربی زبان کی طرح اردو زبان میں بھی بھروسے اور اعتماد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میثاق ہر اس چیز کو کہیں گے جس کی بناء پر کوئی قوم بطریق معروف یہ اعتماد کرنے میں حق بجانب ہو کہ ہمارے اور اس کے درمیان جنگ نہیں ہے' قطع نظر اس سے کہ ہمارا اس کے ساتھ صریح طور پر عدم محاربہ کا عہد و پیمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

پھر آیت میں بینکم و بینہم میثاق کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، یعنی "تمہارے اوران کے درمیان معاہدہ ہو۔" اس سے یہ صاف مترشح ہوتا ہے کہ دارالاسلام کی حکومت نے جو معاہدانہ تعلقات کسی غیر مسلم حکومت سے قائم کیے ہوں وہ صرف دو حکومتوں کے تعلقات ہی نہیں ہیں بلکہ دو قوموں کے تعلقات بھی ہیں اور ان کی اخلاقی ذمہ داریوں میں مسلمان حکومت کے ساتھ مسلمان قوم اور اس کے افراد بھی شریک ہیں۔ اسلامی شریعت اس بات کو قطعاً جائز نہیں رکھتی کہ مسلم حکومت جو معاملات کسی ملک یا قوم سے طے کرے ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے مسلمان قوم یا اس کے افراد سبکدوش رہیں۔ البتہ حکومت دارالاسلام کے معاہدات کی پابندیاں صرف ان مسلمانوں پر ہی عاید ہوں گی جو اس حکومت کے دائرہ عمل میں رہتے ہوں۔ اس دائرے سے باہر دنیا کے باقی مسلمان کسی طرح بھی ان ذمہ داریوں میں شریک نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ میں جو صلح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ سے کی تھی اس کی بنا پر کوئی پابندی حضرت ابوبصیر اور ابوجندل اور ان دوسرے مسلمانوں پر عاید نہیں ہوئی جو دارالسلام کی رعایا نہ تھے۔[1]

(ب) واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیہم علیٰ سواء ط

(الانفال : ۵۸)

"اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو اعلانیہ اس کے آگے پھینک دو۔"

اس آیت کی رو سے ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرز عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے یا یہ

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوم ۔ صفحہ ۱۶۱ ۔ ۱۶۳

اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کرلیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہا اور یکایک اس کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کاروائی کرنے سے پہلے فریق ثانی کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا تاکہ فسخ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے ویسا ہی اس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔ اسی فرمان الٰہی کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا تھا کہ "من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عقدہ حتّٰی ینقض عھدھا او ینبذ الیھم علی سواء۔" جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اسے چاہیے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔ یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔" پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھیلا کر تمام معاملات میں عام اصول یہ قائم کیا تھا کہ "لا تخن من خانک" "جو تیری خیانت کرے تو اس کی خیانت نہ کر۔" اور یہ اصول صرف وعظوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کے لیے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہ نے اپنے عہد بادشاہی میں سرحد روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی یکایک رومی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی اس کاروائی پر عمرو بن عنبہ صحابی نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حدیث سنا کر کہا کہ معاہدہ کی مدت کے اندر یہ معاندانہ طرز عمل اختیار کرنا غداری ہے۔ آخر کار امیر معاویہ کو اس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا اور سرحد پر اجتماع فوج روک دیا گیا۔

یک طرفہ فسخ معاہدہ اور اعلان جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانہ حال کی مہذب جاہلیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگ عظیم ۲ میں روس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کاروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عموماً اس کاروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملے سے پہلے مطلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھا لیتا۔ لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کے لیے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے ان کے بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ فریق ثانی علی اعلان معاہدہ کو توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کاروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیت مذکورہ بالا کے مطابق فسخ معاہدہ کا نوٹس دیں بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کاروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے یہ استثنائی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملے میں صلح حدیبیہ کو اعلانیہ توڑ دیا تھا تو آپ نے پھر انہیں فسخ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی بلکہ بلا اطلاع مکہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قاعدہ استثناء سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام

حالات ہمارے پیش نظر رہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کاروائی کی تھی تاکہ پیروی ہو تو آپ کے پورے طرز عمل کی ہو نہ کہ اس کے کسی ایک مفید مطلب جزو کی۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ :

اولاً" قریش کی خلاف ورزی ایسی صریح تھی کہ اس کے نقض عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے خود ابوسفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا جس کے صاف معنی یہی تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقض عہد قوم کو خود بھی اپنے نقض عہد کا اعتراف ہو۔ البتہ یہ یقیناً" ضروری ہے کہ نقض عہد بالکل صریح اور غیر مشتبہ ہو۔

ثانیاً" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحتہ" یا اشارۃ وکنایتہ" ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایما نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپ ابھی تک ان کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آکر تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً" قریش کے خلافِ جنگی کاروائی آپؐ نے خود کی اور کھلم کھلا کی، کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپؐ کے طرز عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپؐ نے بظاہر صلح اور بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔

یہ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہے۔ لہذا آیت مذکورہ بالا کے حکم عام سے ہٹ کر اگر کوئی کاروائی کی جا سکتی ہے تو ایسے ہی مخصوص حالات میں کی جا سکتی ہے اور اسی سیدھے شریفانہ طریقے سے کی جا سکتی ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید برآں اگر کسی معاہد قوم سے کسی معاملہ میں ہماری نزاع ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گفت و شنید اور بین الاقوامی ثالثی کے ذریعے سے وہ نزاع طے نہیں ہوتی یا یہ کہ فریق ثانی اس کو بزور طے کرنے پر تلا ہوا ہے تو ہمارے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ ہم اس کو طے کرنے میں طاقت استعمال کریں لیکن آیت مذکورہ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استعمال طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہیے اور کھلم کھلا ہونا چاہیے۔ چوری چھپے ایسی جنگی کاروائیاں کرنا جن کا اعلانیہ اقرار کرنے کے لیے ہم تیار نہ ہوں' ایک بداخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔[1]

(ج) فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم لعلھم یذکرون

(الانفال۔ ۵۷)

"پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد جو دوسرے لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں' ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم سے ہمارا معاہدہ ہو اور پھر وہ اپنی معاہدانہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصہ لے' تو ہم بھی معاہدے کی اخلاقی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں گے اور ہمیں حق ہو گا کہ اس سے جنگ کریں۔ نیز اگر کسی قوم سے ہماری لڑائی ہو رہی ہو اور ہم دیکھیں کہ دشمن کے ساتھ ایک ایسی قوم کے افراد بھی شریک جنگ ہیں جس سے ہمارا معاہدہ ہے تو ہم ان کو قتل کرنے اور ان سے دشمن کا سا معاملہ کرنے میں ہرگز کوئی تامل نہ کریں گے' کیونکہ انہوں نے اپنی انفرادی

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوئم۔ صفحات ۱۵۳۔۵۵

حیثیت میں اپنی قوم کے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں رہنے دیا ہے کہ ان کی جان و مال کے معاملے میں اس معاہدہ کا احترام ملحوظ رکھا جائے جو ہمارے اور ان کی قوم کے درمیان ہے۔"[1]

(د) وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ ط انہ ھوالسمیع العلیم ○ وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ۔

(الانفال۔ ۶۱ ـ ۶۲)

"اور اے نبی! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو یقیناً" اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لیے اللہ کافی ہے۔"

یعنی بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہئے بلکہ خدا کے بھروسہ پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے' بے تکلف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلح نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہرحال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خونریزی کو طول کیوں دو اور اگر وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تمہیں خدا کے بھروسے پر بہادر ہونا چاہئے صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تاکہ تمہاری اخلاقی برتری ثابت ہو اور لڑائی کے لیے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوت بازو سے توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار قوم تمہیں نرم چارہ سمجھنے کی جرات نہ کرے۔[2]

۱ـ تفہیم القرآن جلد دوئم۔ صفحہ ۱۵۳۔

۲ـ تفہیم القرآن جلد دوئم۔ صفحہ ۱۵۶۔

اوپر کے صفحات میں جو آیات اور ان کی تشریح پیش کی گئی ہے وہ قرآن کے سیاسی تصورات اور اسلامی حکومت کے رہنما اصولوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ قرآن نے اس شعبہ زندگی کے بارے میں واضح اور دو ٹوک ہدایات دی ہیں اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اجتماعی معاملات ان ہدایات کی روشنی میں طے کریں۔ صرف اس طرح وہ اپنے دین و ایمان کے تقاضے پورے کر سکیں گے۔

حصہ چہارم

اسلامی انقلاب کی راہ

باب ۱۶

اسلامی انقلاب کی راہ

- اسلامی انقلاب کی راہ
- اسلامی حکومت کی خصوصیات
- اسلامی انقلاب کی سبیل
- اسلامی تحریک کا مخصوص طریقہ کار
- پر امن انقلاب کا راستہ
- ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار
- نظام اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب
- سیاسی انقلاب پہلے یا سماجی انقلاب

آخر میں ہم مولانا مودودیؒ صاحب کا وہ مقالہ دے رہے ہیں جو موصوف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو اسٹریچی ہال میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ کے وہ حصے حذف کر دیے گئے ہیں جو اس وقت کے خاص حالات سے متعلق تھے اور ان تمام اصولی مباحث کو باقی رکھا گیا ہے جو اسلامی حکومت کے قیام اور اسلامی انقلاب کے مزاج اور طریق کار پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مرتب

(۱)

اسلامی انقلاب کی راہ

اس مقالہ[1] میں مجھے آپ کے سامنے اس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔

اہل علم کے اس مجمع میں مجھے اس حقیقت کی توضیح پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو۔ مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اخلاقی' نفسیاتی' تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Pre-requisites) کچھ اجتماعی محرکات' کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیائی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے' اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ایک حکومت صرف ان حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بہم پہنچ گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ ان حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس

---

[1] یہ مقالہ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بمقام اسٹریچی ہال پڑھا گیا۔

کی پیدائش کے متقضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے' کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور ان کو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے' درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پا کر وہ پھل آم دینے لگے' اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں' ان کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیے مناسب ہو' مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجئے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ واختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرز عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے' اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں' اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے' اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں' اسی ڈھنگ کی لیڈر شپ ہو' اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضاء اس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃ کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جس کے لیے ان طاقت ور اسباب نے جدوجہد کی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے' اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک

خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اس کی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہو گا کہ جہاں تحریک لیڈر شپ' انفرادی سیرت' جماعتی اخلاق' اور حکمت عملی' ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام زندگی پیدا کرنے کے لیے مناسب و موزوں ہو۔ اور امید یہ کی جائے کہ ان کے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہو گا۔ وہاں بے شعوری' خام خیالی' اور خام کاری کے سواء اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

(۲)

اسلامی حکومت کی خصوصیات

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خالص قوم پرستی کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اس کو (Ideological State) کہوں گا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصولی حکومت اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت اسٹیٹ کے چلانے میں حصہ دار ہو گا' دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سا سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سا نقش پایا مگر اس کو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جس کی بنیاد پر کوئی ریاست تعمیر ہوتی۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی۔ مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہو گئی' اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا' حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اس کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا' مگر اس کی رگ و پے میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کر کے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو

دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کر کے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گردوپیش کی تمام دنیا اس کے خلاف چل رہی ہے، اس لیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اور اس کے جملہ مضمرات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، مگر جن کے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ، اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، ان کے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ افسوس ہے کہ وہ ممالک جن کی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی، تو ان کو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (National State) کے سوا نہ سوجھا۔ کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ پوری اسلامی دنیا میں ایک ژولیدہ فکری پائی جاتی ہے، لوگ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ پھر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر (Nationalistic Ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں، مگر اساسی فکر کے اعتبار سے یہ سب ان کے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے سے گھڑے گھڑائے مل گئے ہیں اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے ہیں۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئے گی کہ اس کی بنا رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا۔ کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا

سکے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جزو ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں صرف انسان ہیں۔ ہم ان کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں ان کی اپنی فلاح ہے اور جو اس کو قبول کر لے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجئے اس تخیل کو لے کر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جس کے دماغ، زبان افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپہ لگا ہوا ہو؟

خلافت اسلامیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی پوری عمارت خدا کی حاکیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ[1] یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے اور وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکیت ------ (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے! یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستور حکومت آیا ہو، یا وہ اس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے گا کہ ہم بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً" فرداً" خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جس کے علم سے

---

[1] اس نظریہ کی تشریح کتاب کے پہلے ابواب میں ہو چکی ہے۔ مرتب۔

کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی' اور جس کی گرفت سے مر کر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے' یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں' ان کو اپنا غلام بنائیں' ان کے سر اپنے آگے جھکوائیں' ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں' حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش اور اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں' بلکہ یہ بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانون عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی' اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی' نفس پرستی' تعصب جانب داری یا بددیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے' خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب' اس کا مزاج' اس کی فطرت' کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت' خاص طرز کی سیرت اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اس کی فوج' اس کی پولیس' اس کی عدالت' اس کی مالیت' اس کے محاصل' اس کی انتظامی پالیسی' اس کی خارجی سیاست' اس کی صلح و جنگ کے معاملات' سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی عدالتوں کے جج' چیف جسٹس' اس کی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ ان کے جنرل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ ان کے وزرائے خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہوں گے' شاید اپنے جھوٹ' دغا اور بددیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ' جو ان حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں' جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت ان کے مزاج کے مناسب حال

کی گئی ہو' اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں اس کو اپنے شہری' اپنے ووٹر' اپنے کونسلر' اپنے اہل کار' اپنے جج اور مجسٹریٹ' اپنے محکموں کے ڈائریکٹر' اپنی فوجوں کے قائد' اپنے خارجی سفراء' اپنے وزیر' غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو' جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں' جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں' جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع نقصان سے زیادہ ہو' جو ہر حال میں اس ضابطہ اور اس طرز عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے' جن کی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو۔ جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہواوہوس کی غلامی مسلط ہو' جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں' جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں' جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں۔ جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے ان کی دست قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں۔ جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان' مال' آبرو' ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں۔ جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل وغارت گری' ظلم و ستم اور بدکاری وشہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں۔ جن کی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ ان کی راستی' انصاف پسندی' اصول و اخلاق کی پابندی اور عہد وپیان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست' افادی ذہنیت (Utilitarian Mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور

شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں' جن کے پیش نظر نہ
خدا ہو نہ آخرت' بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا
مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو' وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے
قابل تو کیا ہوں گے۔ ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت
میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

(۳)

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ اس منزل تک پہنچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں' کسی سوسائٹی میں جس قسم کے فکری' اخلاقی' تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں ان کے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لے کر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشو و نما پائے مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات' وہ مقصد زندگی' وہ معیار اخلاق' وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ' مسلم فلسفی' مسلم مؤرخ' مسلم ماہرین مالیات و معاشیات' مسلم ماہرین قانون' مسلم ماہرین سیاست' غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں۔ جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں' جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک

پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصول پر مرتب کر سکیں۔ اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual Leadership) کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گردوپیش کی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں۔ اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو پرکھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوٹ کامل العیار سونا ہی پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں وہ اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں۔ ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، بااصول، خداترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہو گا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئیں گے۔ پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے۔ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہو گا۔ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو گی اور سوسائٹی کے اس بدلے ہوئے ماحول میں کسی دوسرے طرز کے نظام حکومت کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہو گا اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے، جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔

حضرات! یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری

طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ آپ سب اہل علم لوگ ہیں۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اسی نوعیت کی تحریک اسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو' والٹیر اور مانٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار' لینن اور ٹرالسکی کی لیڈر شپ اور ان ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اس مخصوص اخلاقی' نفسیاتی' اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جس کو ہیگل' فشتے' گوئٹے' نیتشے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈرشپ نے تیار کیا ہے۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی' اخلاقی' نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدوجہد سے بدل ڈالے۔

---

(۴)

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے آپ کے سامنے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سرنو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے' اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانے سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آ رہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رسول اللہ (اللہ کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ ان ہی لیڈروں کے طرز عمل کی پیروی کرنی ہو گی' کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طرز عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں۔ مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہد جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال ملتے ہیں' جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل

ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیحؑ کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے۔ اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل' دستور' داخلی و خارجی پالیسی اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی' تمدنی' معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت' اخلاقی پستی' افلاس' طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ بحرین سے یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سودخواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل افریقہ میں حبش کی عیسائی حکومت

موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہبوں اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا' مگر جس لیڈر کو اللہ نے راہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے' اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی' بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو' اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں' ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent) اور غیر ذمہ دار (Irresponsible) سمجھنا' بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ وہ اللہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے خواہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رو سے کوئی اوپری اصلاح انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے' بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے' اور اس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے' نہ تیرے مٹانے سے مٹ سکتی ہے' اور نہ تو اس

کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امت، اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عاید ہو گا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ' ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے تو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن' کسی کا حکم نہ مان' کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے' میجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے' ہولی نس ساری کی ساری اسی کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے' ہائی نس صرف اسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے' لارڈ شپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے' قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزا وار ہے۔ یہاں کوئی سرکار' کوئی ان داتا' کوئی راجہ مہاراجہ' کوئی ولی یا کارساز' کوئی دعائیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی' ہر اطاعت' ہر پابندی سے انکار کر دے' اور اسی ایک کا غلام' مطیع اور پابند حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت ادھیڑ کر از سرنو ایک نقشہ پر بنتی ہے۔ اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے' اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کاروائی کے براہ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی

منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے' پھر اس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لیے جائیں پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ' کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اس کی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھہری۔ اس کی وجہ پیغمبرانہ جرات اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے' اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں۔ اسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو' اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں' اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خودمختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو' جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں' نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے' اور اعلان کرنے والا

جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے' کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا' کسی قانون کو میں نہیں مانتا' کسی عدالت کے حدودواختیارات (Jurisdictions) مجھ تک نہیں پہنچتے' کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے' کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں' کسی کے امتیازی حقوق' کسی کی ریاست' کسی کا تقدس' کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا' ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں' تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں' دنیا خود آپ سے لڑنے آ جائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں' اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ' بچھو' اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا' اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے' اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت وپاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا' ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا' نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا' قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا' اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا' غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا۔ اس لیے الکفر ملة واحدة کے بمصداق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا' جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے' جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے

تیار ہو جائیں۔ ایسی ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک' دو' دو' چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا' کسی کو گھر والوں نے نکال دیا' کسی کے عزیز' دوست' آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی' کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت' مال' حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ ان کا آنا ضروری تھا۔ ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے' کچے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جوہر تھا' جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گزر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے' خدا اور اس کی رضا کے لیے' اسی کے لیے وہ پٹے' اسی کے لیے بھوکے مرے' اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختہ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش' جدوجہد' مصیبت' تکلیف' پریشانی' مار' قید' فاقہ' جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں' اور اس کی

پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جائے' اپنے نصب العین پر ان کی نگاہ جمی رہے' جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں' جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے۔ اس کا عالم الغیب والشہادۃ ہونا' اس کا مالک یوم الدین ہونا' اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک ان کے دلوں میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک بھی پھیل رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں' قید کیے جا رہے ہیں۔ گھروں سے نکالے جا رہے ہیں' تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن' زر' زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے' کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے' یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے' تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں' آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ' اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے' اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان' مال' اولاد' ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں' تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں' ان کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز ان لوگوں کے جن کو ذاتی

وجاہت کے تکبر یا اجداد پرستی کی جہالت یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی حقیقی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کو سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً" چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

ان کی بیوی حضرت خدیجہ" حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں، اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا۔ کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کو پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا مالک التجار کہلاتا تھا اس کی سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکوت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے، بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آ جائیں، مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمدؐ! ہم تمہارے پاس کیسے آ کر

بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام' مفلس' معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے' انہیں ہٹاؤ تم ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا' اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک' اپنی قوم' اپنے قبیلے' اپنے خاندان' کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ' انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں۔ اور اسی چیز نے آپ' کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ' اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالوں' تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ' عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلالؓ روم کے صہیبؓ' اور فارس کے سلمانؓ کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی۔ ہر ذاتی' خاندانی' قومی' وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپ' کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ' کے پاس رکھوائی تھیں' حضرت علیؓ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے' لے کر چل دیتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں اور اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی کوشش کی' اور اس وقت کی جب کہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے' اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد میدان بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے

ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اس وقت ان کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر ان کے دل اندر سے بھینچ رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

تیرہ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے کارکن فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اسے کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصری مدت میں ہر شعبہ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract Idea) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کے انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبہ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں اور اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس

کے خلاف وہ برسوں تک، لڑتے رہے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے۔ ابوسفیان قائل ہوئے۔ قاتل حمزہ وحشی قائل ہوئے۔ ہند جگر خوار تک کو آخرکار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ پانچ سال کی تمام لڑائیوں میں' جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی' طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلاب کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں' نگاہ کا زاویہ بدل گیا' سوچنے کا طریقہ بدل گیا' زندگی کا طرز بدل گیا' اخلاق کی دنیا بدل گئی' عادات اور خصائل بدل گئے' غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اچکے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے' حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پایہ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا تاج شاہی ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آ جائے۔ وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی' جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن

کرتے تھے' ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری معاملہ میں کچھ کمی کر دے' مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے۔ اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھا لیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبان سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے' بازاروں میں پیدل پھرتے تھے' دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے' رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں' لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ ایلچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالاران ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہو گا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جن کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن

جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی ان کا اقبال خود آ کر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کے سامنے پیش نہ ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے اپنے خرچ سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر جو مال غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا سپہ سالار کے سامنے لا کر رکھ دیتے تھے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح پر بدل ڈالا؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے' مگر بعد کے دس سال میں سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کر سکتے' اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنوں ہو گیا ہے' اور کوئی اسے محض خیالی آدمی (Visionary) قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اس وقت صرف غیر معمولی ذہانت اور سمجھ رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے دیکھ لیا اور اس کے نتائج ان کے سامنے عیاناً" آ گئے' تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جس کو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا جس کی پیشانی پر

دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے' اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں اب یہ کہاں ہو سکتا ہے' نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا واقعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان' شعور اسلامی' ذہن کی یکسوئی' مضبوط قوت فیصلہ' اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے جواں ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جما دیں' کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں' دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں' دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں' اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں' عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں' سوسائٹی' حکومت' قانون' قوم' وطن جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

---

(۵)

پرامن انقلاب کا راستہ[1]

سوال :۔ ذیل میں دو شبہات پیش کرتا ہوں۔ براہ کرم صحیح نظریات کی توضیح فرما کر انہیں صاف کر دیجیے۔

(ا) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا اور انہوں نے جب ریاست کو اقتدار کلی منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اسے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریق کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ اسٹیٹ اس دور سے کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چکا ہے۔ اس قسم کا طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا۔[2] مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو

---

[1] یہ سوال و جواب ترجمان القرآن محرم ۶۵ھ دسمبر ۴۵ء سے لیے جا رہے ہیں۔ اگر قبل تقسیم کا پس منظر سامنے آئے تو ان کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ مرتب

[2] یہ خط اور اس کا جواب اس مجموعے کے اگلے حصے میں "ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار" کے زیر عنوان درج ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ ہمارے لیے تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رد کر کے اپنے ہی خطوط پر جداگانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہمارے لیے بھی طریق کار اب یہی ہے۔ واضح فرمائیے کہ میری یہ رائے کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔

(۲) آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مرحلہ پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجودہ الوقت دستوری طریقوں سے نظام باطل کو اپنے اصول پر ڈھالا جا سکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ ہو گا۔ اس جملہ سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جماعت اسلامی بھی ایک حد تک اسمبلیوں میں آنے کے لیے تیار ہے اور الیکشن کو جائز سمجھتی ہے۔ اس معاملہ میں جماعتی مسلک کی توضیح فرمائیے۔

جواب :۔ ہمارے لیے سارے انبیاء علیہم السلام واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ہدایت تھی کہ اسی طریق پر چلیں جو تمام انبیاء کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملہ میں کسی نبی نے کوئی خاص طرز عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس طریق کار کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو تو وہ ویسا ہی دینی طریق کار ہے جیسے کہ وہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ یہ بات اگر یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبی کریمؐ نے اس پر لعنت بھیجی اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قبول کر لینے سے حضرت

یوسف علیہ السلام کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی کریمؐ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپؐ بھی اسے قبول کر لیتے اور خواہ مخواہ لڑ کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ کرتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح کبھی ہم کو اگر یہ توقع ہو کہ ہم رائے عام کی تائید سے نظام حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اس کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔

(۲) الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ اگر ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدہ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:۔

اولاً" ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً" ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً" انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

---

(۶)

ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار[1]

سوال :۔ یہ بات تو اب کسی مزید استدلال کی محتاج نہیں رہی کہ ایک مسلمان کے لیے بشرطیکہ وہ اسلام کا صحیح شعور حاصل کر چکا ہو' صرف ایک ہی چیز مقصد زندگی قرار پا سکتی ہے' اور وہ ہے حکومت الٰہیہ کا قیام۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صرف وہی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت سے عقلاً" مناسبت رکھتا ہو۔ اور جو اس کے اصلی داعیوں نے عملاً اختیار کیا ہو۔ حکومت الٰہی کے نصب العین کے داعی انبیاء کرامؑ ہیں۔ اس لیے طریق کار بھی وہی ہے جو انبیاءؑ کا طریق کار ہو۔

انبیاءؑ کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں فی الجملہ دو قسم کے پیغمبر دکھائی دیتے ہیں :۔

ایک تو وہ جن کی دعوت کے ظہور کے وقت اسٹیٹ ایک منظم اور موثر طاقت کی حیثیت سے سوسائٹی میں کار فرما نظر آتا ہے' اور اکثر حالات میں وہ ایسا اسٹیٹ ہوتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کلی طور پر شخص واحد میں مرکوز ہوتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت

---

[1] ترجمان القرآن' رمضان و شوال ۶۴ھ بمطابق ستمبر اکتوبر ۴۵ء سے ماخوذ۔ مرتب

موسیٰ علیہ السلام۔

دوسرے وہ جن کا واسطہ ایک ایسی سوسائٹی سے پڑتا ہے جس میں اسٹیٹ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ سے زیادہ سرقبیلی (Patriachal) قسم کا اسٹیٹ تھا۔ جیسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

دونوں صورتوں میں طریق کار کا اختلاف نمایاں ہے' جو غالباً" اسی سیاسی اختلاف احوال کا نتیجہ ہے۔

لیکن جتنی جامعیت اور ہمہ گیری اسٹیٹ نے اب حاصل کرلی ہے اور جس طرح اس نے آج کل فرد کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور جس منظم و موثر اور مضبوط طاقت' فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس نے اب اختیار کرلی ہے۔ اس کی مثال شاید پچھلی تاریخ میں نہ مل سکے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہی طریق کار جو تقریباً" غیر ریاستی (Stateless) سوسائٹی یا حد سے حد سرقبیلی حکومت میں کامیاب طور پر استعمال کیا گیا تھا اب بھی اس قسم کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے؟ کیا آج کل کے بدلے ہوئے حالات میں اسی مقصد کے لیے کام کرنے والی پارٹی کو اپنا فن انقلاب انگیزی کافی حد تک بدلنا پڑے گا؟

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا۔ چنانچہ انہوں نے جب قوت متسلط (Sovereign Power) کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اجعلنی علی خزائن الارض کہہ کر اقتدار سنبھال لیا اور اس طرح اپنا مشن پورا کرنے کے لیے پہلے کے قائم شدہ اسٹیٹ کو استعمال میں لے آئے۔

موجودہ زمانہ کا اسٹیٹ حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد کے اسٹیٹ سے

کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور منظم ہے۔ اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لیے جو انقلاب بھی ہو گا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گزرے گا۔ جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام محض توڑ پھوڑ قسم کا انقلاب نہیں چاہتا، بلکہ اس کا پروگرام کچھ زیادہ نازک ہے۔ ان حالات میں تو زیادہ موزوں طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کلی انقلاب کے جتنا کچھ اقتدار حاصل ہو سکے اسے قبول کر کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر اس پوزیشن کو قبول کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ملک کی موجودہ مسلمان جماعتوں کے خلاف کوئی کاروائی درست نہیں ہو گی بلکہ تائید بھی ضروری ہو جائے گی۔

یہ بات واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتدار سے مراد سول سروس کے مناصب نہیں، جیسا کہ کسی نواب صاحب نے ترجمان کی ایک اشاعت میں یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں فرمایا ہے، بلکہ ایک منظم جماعت کی جدوجہد کے بعد جماعتی حیثیت سے قوت حاکمہ (Sovereign Power) سے اختیارات لے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مراد ہے۔

جواب :۔ بلا شبہ ایسی حالت میں جب کہ غیر اسلامی اسٹیٹ ہمہ گیر ہو اس حالت کی بہ نسبت جب کہ فاسد سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو، بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے اور اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے۔ لیکن اصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اصولی طریق کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں

آ جانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاق' تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریق کار (Method) سے' لیکن اگر پر امن ذرائع سے جوہر اقتدار (Substance of Power) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

---

(۷)

نظام اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب[1]

سوال :۔ جن لوگوں سے پاکستان کے آئندہ نظام کے متعلق گفتگو ہوتی ہے وہ اکثر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ اور دوسرے اہل علم اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرایا جائے؟ اس سوال سے صرف مجھ کو ہی نہیں دوسرے کارکنوں کو بھی اکثر و بیشتر سابقہ پیش آتا ہے۔ گو ہم اپنی حد تک لوگوں کو بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ آپ اس سوال کا جواب ترجمان القرآن میں دیں تاکہ وہ بہت سے غلط فہمیاں صاف ہو سکیں جن پر یہ سوال مبنی ہے۔

جواب :۔ آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مفصل جواب تو سردست نہیں دیا جا سکتا لیکن مختصر طور پر میں ایک بات عرض کروں گا جس سے امید ہے کہ آپ معاملہ کی اصل حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو نہ اخلاق اسلامی، جہاں کا سیاسی و معاشی اور تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو، اور جہاں ایک مجرد سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یکایک نوبت آگئی ہو۔ وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی سی بات پر اٹکا ہوا ہو کہ ہم ایک دستور مرتب کر کے پیش کریں اور برسراقتدار لوگ اسے لے کر نافذ کر دیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ ایک مدرسے یا ایک بینک کو ہسپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہسپتال کا

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن ذی القعدہ ۱۳۶۷ھ ستمبر ۱۹۴۸ء

خاکہ مرتب کردیں اور وہ مدرسے کے منتظمین یا بینک کے اسٹاف کو دے دیا جائے تاکہ وہ اسے دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ شاید دستور کو انہوں نے کوئی تعویذ سمجھا ہے!

واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کرلیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً" ضروری ہیں۔ (جنہیں ہم نے اپنے "مطالبہ" میں بیان کر دیا ہے)' پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے' پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشو نما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے

ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقہ کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آ گیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہو گا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں' اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے' جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔

امید ہے کہ اس توضیح سے لوگ ہماری پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ ہم کوئی کام وقت سے پہلے نہیں کرنا چاہتے۔ سردست ہم نے اسلامی نظام کے بنیادی امور کو ایک مطالبہ کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اگر اسے قبول کر لیا جائے تو دستور سازی کے کام میں جس حد تک ممکن ہو گا ہم پوری مدد کریں گے۔ لیکن اگر سرے سے یہ بنیادی امور ہی برسراقتدار لوگوں کو منظور نہ ہوں تو پھر دستور کا خاکہ پیش کرنے سے آخر کیا فائدہ متصور ہے؟

---

(۸)

سیاسی انقلاب پہلے یا سماجی انقلاب؟[1]

سوال :۔ ہمارے ملک میں یہ احساس عام ہے کہ اسلام کے اصول و احکام پسندیدہ اور مستحسن تو ہیں مگر بحالات موجودہ قابل عمل نہیں ہیں۔ عوام و خواص میں اسلام سے جذباتی وابستگی تو ضرور ہے لیکن اسلام کا صحیح مفہوم اور آمادگی عمل بہت کم ہے۔ اسلام جس ذہنی و عملی انضباط کا مطالبہ کرتا ہے اسے دیکھ کر یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی قوانین کو نافذ کر دیا گیا تو کہیں اس کے خلاف شدید رد عمل نہ رونما ہو جائے۔ سیاسی انقلاب سے پہلے سماجی انقلاب ضروری ہے اور اصلاح کا جذبہ اوپر سے اور باہر سے پیدا کرنے کے بجائے اندر سے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورت حال پیدا ہونے سے پہلے کیا اسلامی ریاست کا مطالبہ قبل از وقت نہیں ہے؟

جواب :۔ اس مسئلے کی اگر پوری وضاحت کی جائے تو اس کے لیے بڑے تفصیلی جواب کی ضرورت ہے۔ لیکن مختصر جواب یہ ہے کہ بلاشبہ سیاسی انقلاب سے پہلے ایک تمدنی' اجتماعی اور اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی اسلامی انقلاب کا فطری طریقہ ہے۔ اور بلاشبہ یہ بات بھی درست ہے کہ اسلام کے احکام و قوانین صرف اوپر سے ہی مسلط نہیں کیا جا سکتے بلکہ اندر سے ان کے اتباع کا دلی جذبہ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کی شکل میں سیاسی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اب یہ سوال چھیڑنا بالکل بے کار ہے کہ معاشرتی انقلاب پہلے برپا کرنا چاہیے اور سیاسی انقلاب بعد میں۔ اب تو سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جب تک قوم میں ذہنی انقلاب واقع نہ ہو اس وقت تک

---

[1] ماخوذ از ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۷۳ھ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۴ء

آیا ہم سیاسی اختیارات کو کافرانہ اصولوں کے مطابق استعمال کرتے رہیں یا ان اختیارات کو بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کام میں لائیں۔ سیاسی اقتدار کا کوئی نہ کوئی مصرف اور مقصد بہرحال ہمیں متعین کرنا پڑے گا۔ حکومت کی مشینری کو اخلاقی انقلاب رونما ہونے تک معطل بہرحال نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قوم جو خدا اور اس کے رسولؐ کی حاکمیت اور بالادستی پر ایمان رکھتی ہو' اجتماعی اور قومی زندگی کی باگیں اس کے اپنے ہاتھ میں ہوں' اپنا نظام حیات وہ خود تعمیر کرنے کے قابل ہو اور کوئی دوسری کافرانہ طاقت اس پر کوئی کافرانہ نظام مسلط کرنے والی نہ ہو' تو کیا اس قوم کے افراد کے لیے یہ جائز اور درست ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اخلاقی وعظ و نصیحت تو کرتے رہیں مگر ہیئت حاکمہ کو غیر اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس صورت حال کو گوارا کر لیں تو گو ہم انفرادی ارتداد کے مرتکب نہ ہوں' اجتماعی اور قومی حیثیت سے ہم ضرور ارتداد کے مرتکب ہوں گے۔

پھر اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ اجتماعی و اخلاقی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو آپ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس انقلاب کے ذرائع و وسائل کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع میں تعلیم و تربیت' معاشرتی اصلاح' ذہنی اصلاح اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ حکومت کے قانونی اور سیاسی ذرائع و وسائل بھی ہیں۔ حکومت کی طاقت نہ صرف بجائے خود ایک بڑا ذریعہ اصلاح ہے' بلکہ وہ ساری اصلاحی تدابیر کو زیادہ موثر' نتیجہ خیز اور ہمہ گیر بنانے کا بھی ذریعہ ہے۔ اب آخر کیا وجہ ہے کہ اخلاقی انقلاب لانے کے لیے حکومت کے وسائل کو بھی استعمال نہ کیا جائے۔ ہمارے ووٹوں اور ہمارے ادا کردہ ٹیکسوں اور مالیوں کے بل پر ہی تو حکومت کا سارا نظام چل رہا ہے۔ آخر اس حماقت اور جہالت کا ارتکاب ہم کیوں کریں کہ ایک طرف انفرادی حیثیت سے ہم اسلام کے سماجی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف حکومت کے سارے ذرائع اخلاق کے بگاڑنے اور فسق و فجور پھیلانے میں لگے رہیں۔